

مجله حقوق محفوظ

سلسلہ کمکشان نمبر ۶

بازار حسن

حصہ دوم

مُصَنَّف

ادیب فطرت نگار نقشبندی پریم چند

۱۹۲۹ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور

Taj Tahir Foundation

بازارِ حُسن

حصہ دوم

— (۱) —

یہ کمنا غالباً صحیح نہیں ہے۔ کہ خدا سب کو کسی نہ کسی حیلہ سے
رزق بھیجتا ہے۔ پنڈت اماناتہ بغیر کسی حیلہ کے دُنیا کی نعمتوں کا لطف
اٹھاتے تھے۔ اُن کے گھر میں بھینسیں اور گائیں نہ تھیں۔ لیکن بچے
دودھ کی کُٹیاں کرتے تھے۔ وہ کھیتی باڑی نہ کرتے تھے۔ لیکن گھر میں غلہ
کا انبار لگا رہتا تھا۔ گاؤں میں کہیں مچھلی مرے۔ کہیں بکر اذبح ہو۔ کہیں
آم لٹے۔ کہیں بھوج ہو۔ پنڈت اماناتہ کا حصہ بلا مانگے پوچھے آپ
ہی آپ پہنچ جاتا تھا۔ امولا بہت بڑا موضع تھا۔ ڈھائی تین ہزار کی
آبادی تھی۔ لیکن سارے گاؤں میں اُن کے مشورہ اور مدد کے بغیر

کوئی کام انجام نہ پاتا تھا۔ عورتوں کو اگر زیور بنوانے ہوتے تو وہ اماناتہ سے کہتیں۔ لڑکے لڑکیوں کی شادیاں اماناتہ کی معرفت طے ہوتیں۔ رہن نامے و بیعنامے اماناتہ ہی کی صلاح سے لکھے جاتے۔ معاملے مقدّمے انہیں کے توکل سے دائر ہوتے۔ اور طرہ یہ کہ ان کا یہ سوخ اور وقار ان کی زمانہ سازی یا بھل منسی کی بدولت نہ تھا۔ گاؤں والوں کے ساتھ ان کا برتاؤ خشک اور روکھا ہوتا تھا۔ ان کی زبان کی تلخی مشہور تھی۔ لیکن ان کی تلخیوں کو لوگ دودھ کی طرح پیتے تھے۔ معلوم نہیں اُن کی شخصیت میں کیا راز کیا جادو تھا۔ کوئی کہتا تھا۔ یہ اُن کا اقبال ہے۔ کوئی کہتا انہیں ہما بیر کا ایشٹ ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ اُن کی قیادہ شناسی کا نتیجہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کہاں جھکنا اور کہاں مننا چاہئے۔ گاؤں والوں سے تنے میں اپنی بہبود سمجھتے تھے۔ حکام سے جھکنے میں۔ بھانہ اور تحصیل کے عمال چیرا سی سے کر افسر اعلیٰ تک سب ان پر ہربان تھے۔ تحصیلدار صاحب کے لئے وہ برش بیل بناتے۔ ڈپٹی صاحب کو آنے والی ترقی کی خبر دیتے تھے۔ قانونگو۔ قرق امین۔ اور سیاہہ نویس تو ان کے دروازے پر بن بلائے ہماں بنے رہتے۔ کسی کو تعویذ لکھ دیتے۔ اور کسی کو گنڈا کر دیتے۔ جن لوگوں کو ان ڈھکوسلوں پر اعتقاد نہ تھا۔ ان کی خاطر نورتن چٹنی اور میٹھے اچار سے کرتے تھے۔ بھانہ دار صاحب انہیں اپنا داہنا بازو خیال کرتے تھے۔ جہاں ان کی دال نہ گلتی ہو۔ وہاں ان کی بدولت پانچوں گھی میں ہو جاتی

تھیں۔ بھلا ایسے ہمہ صفت موصوف آدمی کی گاؤں والے کیوں نہ
پوچھا کرتے!

اماناٹہ کو گنگا جلی سے بہت محبت تھی۔ لیکن گنگا جلی کو میکے آنے
کے قصورے ہی دنوں بعد معلوم ہو گیا۔ کہ بھائی کی محبت بھاوج کی
سردھری کی تلافی نہیں کر سکتی۔ اماناٹہ بہن کو اپنے گھر لانے پر دل
میں بہت پھپھتا ئے۔ وہ بیوی کو خوش رکھنے کے لئے اس کی ہاں میں
ہاں ملا دیا کرتے تھے۔ گنگا جلی کو اب صاف کپڑے پہنے کا کیا حق ہے؟
شانتا کی پرورش پہلے چاہے کتنی ہی ناز و نعمت سے ہو۔ اب اُسے
اماناٹہ کی لڑکیوں سے برابری کرنے کا کیا حجاز تھا؟ اماناٹہ بیوی کی ان
کدورت آمیز باتوں کو سنتے اور اُن کی تائید کرتے۔ گنگا جلی اپنے غصہ
و غم کا بخار بھائی ہی پر اتارتی۔ وہ سمجھتی تھی۔ کہ یہ اپنی بیوی کو بڑھاوے
دے کر میری یہ دُرگت کرا رہے ہیں۔ یہ اگر اس کو ستمی سے ڈانٹ دیتے
تو مجال تھی۔ کہ وہ یوں میرے پیچھے پڑ جاتی۔ اماناٹہ کو جب موقع ملتا۔ تو
وہ گنگا جلی کو تخلیہ میں صورتِ حال کو سمجھا دیا کرتے۔ مگر ایک تو جابھڑی
ایسے موقع ہی نہ آنے دیتی۔ دوسرا گنگا جلی کو بھی ان کی بے اثر ہمدردی
پر اعتبار نہ ہوتا۔

اس طرح ایک سال گزر گیا۔ گنگا جلی فکرِ غم اور یاس سے گھل گھل
کر بیمار پڑ گئی۔ اُسے بخار آنے لگا۔ اماناٹہ نے پہلے تو معمولی ادویات
کا استعمال کرایا۔ لیکن جب اُن سے کچھ افادہ نہ ہوا۔ تب انہیں نگرہوئی۔

ایک روز جاٹھوی کسی پڑوس کے گھر گئی ہوئی تھی۔ اماناٹہ بہن کے کمرہ میں گئے۔ وہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ لیٹر اچھٹرا سہو رہا تھا۔ سارٹی پھٹ کر تار تار ہو گئی تھی۔ شاننا اس کے پاس بیٹھی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی۔ یہ دردناک نظارہ دیکھ کر اماناٹہ رو پڑے۔ یہی عورت ہے جس کی خدمت کے لئے دودو لونڈیاں تھیں۔ آج اس کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ انہیں اپنی بے اعتنائی پر سخت افسوس ہوا۔ گنگا جلی کے سرے سے بیٹھ کر روتے ہوئے بوسے! بہن یہاں لا کر میں نے تمہیں بہت تکلیف دی۔ میں نہیں جانتا تھا۔ کہ اس کا یہ نتیجہ ہو گا۔ میں آج کسی دید کو لاتا ہوں۔ ایشور چاہیں گے تو تم جاہ اچھی ہو جاؤ گی؟ اتنے میں جاٹھوی بھی آگئی۔ یہ باتیں اس کے کان میں پڑ گئیں۔ بولی: ہاں ہاں دوڑو۔ بید کو بلاؤ۔ نہیں تو قیامت آجائے گی۔ ابھی پچھلے دنوں مجھے مہینوں بخار آتا رہا۔ تب بید کے پاس دوڑے۔ میں بھی سحافت اور بھ کر پڑ رہتی۔ تو تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ اسے کچھ ہوا ہے۔ لیکن میں کیسے پڑ رہتی۔ گھر کی چکی کون پیتا ہے میرے نصیب میں یہ شکھ کہاں؟

اماناٹہ کا خوصلہ پست ہو گیا۔ وید کو بلانے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ جانتے تھے۔ کہ اگر وید کو نہ بلایا۔ تو گنگا جلی جو دو چار مہینے میں مرنیوالی ہو۔ تو دو چار دن ہی میں چل بسے گی۔ گنگا جلی کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اُسے

اس سال کا مرض ہو گیا۔ زندگی کی اُمید منقطع ہو گئی۔ جس معدہ میں ساگودانہ
 ہضم کرنے کی بھی طاقت نہ ہو۔ وہ جو کی روٹیاں کیونکر ہضم کرتا۔ بالآخر
 اس کا تن زار ان تکلیفوں کو اور نہ برداشت کر سکا۔ چھ مہینہ بیمار
 رہ کر وہ دکھیا مرگ مفاجات کا لقمہ بن گئی۔

شانتا کا اب دنیا میں اپنا کوئی نہ تھا۔ سمن کے پاس اُس نے
 دو خط لکھے۔ پروہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔ شانتا نے سمجھا۔ بہن نے
 نانا توڑ دیا۔ مصیبت میں کون کس کا ہوتا ہے۔ جب تک گنگا جلی
 زندہ تھی۔ شانتا اُس کے آنچل میں منہ چھپا کر رو لیا کرتی تھی۔ اب وہ
 سہارا بھی نہ رہا۔ اندھے کے ہاتھ سے لکڑی بھی جاتی رہی۔ شانتا
 اب اپنے کمرہ کی دیواروں سے لپٹ کر روتی۔ لیکن دیوار ہیں اور
 ماں کے آنچل میں بڑا فرق ہے۔ ایک دھیمی ہواؤں سے لراتی
 ہوئی ندی ہے۔ دوسرا آتشیں غبار سے بھرا ہوا ریگستان!

شانتا کو اب کہیں تسکین نہیں۔ اس کا دل آگ کی طرح جلا کر تا
 ہے۔ وہ اپنے ماموں اور حمائی کو اپنی ماں کا قاتل سمجھتی ہے۔ جب
 گنگا جلی زندہ تھی۔ تب شانتا اُسے حمائی کے کلام تیز سے بچانے
 کے لئے کوشاں رہتی تھی۔ وہ جانھوی کے ذرا سے اشارے پر دوڑتی
 تھی۔ کہ کہیں وہ اتناں کو کچھ کہہ نہ بیٹھیں۔ ایک بار گنگا جلی کے ہاتھوں
 سے گھی کی ہانڈی گر پڑی۔ شانتا نے حمائی سے کہا۔ یہ میرے ہاتھوں
 سے چھوٹ پڑی۔ اس پر اُس نے خوب گالیاں کھائیں۔ وہ جانتی تھی۔

کہ ماں کا دل طعنہ کی چوٹ نہیں سہ سکتا۔
 لیکن اب شانتا کو وہ خوف نہیں ہے۔ وہ بیکس ہو کر دلیر ہو گئی ہے۔
 اس میں اب وہ تحمل نہیں ہے۔ اُسے جلد غصہ آجاتا ہے۔ وہ جلی کٹی باتوں
 کا اکثر جواب بھی دے دیتی ہے۔ اس نے اپنے دل کو سخت سے سخت
 تعزیر کے لئے تیار کر لیا ہے۔ ماموں سے وہ دبتی ہے۔ لیکن مامی سے مطلق
 نہیں دبتی۔ اور میری بہنوں کو ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہے۔ اس کی حالت
 اب اُس گائے کی سی ہے۔ جو گٹھنیا کے خوف کے بل پر دوسروں کا کھیت
 چرتی ہے۔

اس طرح ایک سال اور گزر گیا۔ اُمانا تھ نے بڑی دوا دوش کی کہ اس
 کی شادی کر دیں۔ لیکن جتنا سستا سودا وہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہیں طے
 نہ ہوا۔ انہوں نے تھانہ اور تحصیل سے دو سو روپیہ کا چندہ فراہم کر لیا تھا۔
 مگر اتنے سستے بڑ کہاں؟ جانفوی کا بس چلتا۔ تو وہ شانتا کو کسی کنگلے کے
 گلے مڑھ کر قرضیہ پاک کرتی۔ لیکن اُمانا تھ نے اب کی اپنی متاہل زندگی میں
 پہلی بار اس سے اختلاف کیا۔ اور شانتا کے لئے ایک لائق اور موزوں
 برتلاش کرتے رہے۔ گنگا جلی کو اپنی کمزوری پر قربان کر کے اب وہ کچھ جبری
 ہو گئے تھے۔

— (۲) —

رفاء عام کی تخریکیں بھی ممتاز آدمیوں کی محتاج ہوتی ہیں اگرچہ بٹلدا اس

کے پیروؤں کی کمی نہ تھی۔ لیکن ان میں زیادہ تر عوام تھے۔ خواص ان سے
محترز رہتے تھے۔ پدم سنگھ کے شریک ہوتے ہی اس تحریک میں جان ہی
پڑ گئی۔ ندی کی پتلی دھارا اڑ پڑی۔ معززین میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ لوگ
اس پر کچھ کچھ اعتبار کرنے لگے۔

پدم سنگھ تنہا نہ آئے۔ اکثر کسی کام کو مفید سمجھ کر بھی ہم اس میں ہاتھ
لگاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ نکتہ بن جانے کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ ہم
بڑے آدمیوں کے آملنے کا انتظار کیا کرتے ہیں۔ جوں ہی کسی نے راستہ
کھولا۔ ہماری ہمت بندھ جاتی ہے ہم کو تضحیک یا انگشت نمائی کا
خوف نہیں رہتا۔ اکیلے ہم اپنے گھر میں بھی ڈرتے ہیں۔ دوہو کر جنگل میں
بھی بے خوف ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر رویش دت۔ لالہ بھگت رام اور
مسٹر رستم بھائی خفہ طہر پٹھل داس کی اعانت کرتے رہتے تھے۔ اب وہ کھل
پڑے۔ معادنیں کی تعداد روز بڑھنے لگی۔

بٹھل داس اصلاح تمدن کے معاملہ میں نرم گوئی کو بالکل بے موقع
سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کی باتیں لوگوں کو ناگوار گزرتیں۔ میٹھی نیند
سونے والوں کو ان کی صدا تلخ زہر معلوم ہوتی تھی۔ پر بٹھل داس کو
اس کی پروا نہ تھی۔

پدم سنگھ دھن کے پورے آدمی تھے۔ انہوں نے بڑے جوش
سے بازار حسن کے اخراج کی تحریک شروع کی۔ میونسپلٹی کے اراکین
میں دو چار اصحاب بٹھل داس کے معتقد بھی تھے۔ لیکن ان میں اس

تحریک کو عملی صورت میں لانے کی جرأت نہ تھی، مسئلہ اتنا مشکل اور پیچیدہ تھا۔ کہ اس کا خیال ہی لوگوں کے حوصلے توڑ دیتا تھا۔ وہ سوچتے اس تجویز کو زیر بحث لانے سے معلوم نہیں شہر میں کیا کرامتیں چھ شہر کے کتنے ہی روڈ سا۔ کتنے ہی حکام۔ کتنے ہی تجار بازار حسن سے تعلق رکھتے تھے۔ کوئی قدر دان تھا۔ کوئی گاہک۔ کوئی جوہری۔ کوئی دلال۔ اس حجم غفیر سے بیرومول لینے کی کون جرأت کرنا! میونسپلٹی کے اراکین ان کے ہاتھوں میں کھٹکتی بنے ہوئے تھے۔

پدم سنگھ نے ممبروں سے مل کر ان کی توجہ اس مسئلہ کی طرف منعطف کی۔ پر بھا کر راؤ کی جادو نگاریوں کا خاص اثر ہوا۔ پمفلٹ نکالے گئے۔ اور عوام کو بیدار کرنے کے لئے تقریروں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ہمیشہ دت اور پدم سنگھ فن تقریر میں مشاق تھے۔ اس کا بار انہوں نے اپنے سر لے لیا۔ تحریک نے باقاعدہ منضبط صورت اختیار کی۔

پدم سنگھ نے یہ مسئلہ چھیڑ تو دیا۔ پر وہ اس پر جتنا بھی غور کرتے تھے۔ اتنے ہی اور مایوس ہو جاتے تھے۔ انہیں یقین نہ آتا تھا۔ کہ کسبوں کے اخراج سے مطلوبہ نتائج پیدا ہوں گے۔ ممکن ہے۔ فائدہ کی جگہ نقصان ہو۔ وہ سوچتے۔ کہ برائیوں کا بہترین سد باب انسان کا اخلاقی احساس ہے۔ اس کے سوا اور کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہو سکتی کبھی کبھی سوچتے سوچتے انہیں وحشت سی ہونے لگتی۔ لیکن

اس تحریک کا ایک رکن خاص بن کر وہ اپنے شکوک کا اظہار نہ کر سکتے تھے۔ عوام کے روبرو تو انہیں اصلاح قوم کا چرچا کرتے ہوئے کوئی تکلف نہ تھا۔ لیکن اپنے احباب اور ہمجنسوں کے سامنے آتے ہوئے انہیں بہت جھجک ہوتی تھی۔ یہ ان کے لئے سخت امتحان تھا۔ کوئی کتنا اچھی کس پھر میں پڑے ہو۔ بٹھل داس کے چکر میں تم بھی آگے کیا؟ چین سے زندگی کا لطف اٹھاؤ۔ ان جھمیالوں میں پڑ کر کیوں مٹی خراب کرتے ہو؟ کوئی کتنا یار معلوم ہوتا ہے۔ کسی حسینہ نے تمہیں چرکا دیا ہے۔ تبھی تو تم ان کے پیچھے اس طرح پڑے ہو۔ ایسے دوستوں کے سامنے فلاح اور رفاہ کی گفتگو کرنا اپنے تئیں نشانہ ظرافت بنانا تھا۔ دورانِ تقریر میں بھی شرما جی جذبات کو متحرک کرنے کی کوشش کرتے۔ تو انہیں الفاظ نہ ملتے۔ اور ملتے بھی تو انہیں زبان سے نکالنے ہوئے شرما جی کو بہت تامل ہوتا۔ فی الواقع ابھی تک شعلہٴ درد ان کے دل تک نہ پہنچا تھا۔ وہ جب اپنی بے حسی پر غور کرتے۔ تو انہیں معلوم ہوتا تھا۔ کہ میرا دل ابھی تک اس نشہ میں سرشار نہیں ہوا۔ کوئی تقریر ختم کر چکنے کے بعد شرما جی کو یہ جاننے کی اتنی خواہش نہ ہوتی تھی کہ حاضرین پر اس کا کیا اثر ہوا۔ جتنی یہ جاننے کی کہ تقریر بدلتی فصیح اور پرجوش تھی یا نہیں؟

لیکن ان خیالوں کے باوجود یہ تحریک روز بروز پھیلتی جاتی تھی۔ یہ کامیابی شرما جی کے لئے یقین اور سوز باطن سے کچھ کم ہمت افزا نہ تھی۔

سدن سنگھ کی شادی کو ابھی دو ماہ تھے۔ خانگی تفکرات سے آزاد ہو کر شرابی اس تحریک میں دل و جان سے منہمک ہو گئے، کچھری کے کاموں میں اُن کا جی نہ لگتا تھا۔ وہاں بھی وہی چرچے رہتے۔ ایک ہی مسئلہ پر متواتر غور و خوض کرتے رہتے سے اس سے ایک عشق سا ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ شرابی کے دل میں شعلہ محبت روشن ہونے لگا۔

لیکن جب شادی کے دن قریب آ گئے۔ تو پدم سنگھ کو ایک ضعف کا احساس ہونے لگا۔ دل میں سوال پیدا ہوا۔ کہ بھائی صاحب شادی کے لئے طائفوں کو طے کرنے کا بار مجھی پر رکھیں گے۔ اس وقت میں کیا کروں گا؟ ناچ دیکھنے کے لئے آئیں گے۔ اُن کی ضیافت طبع کے لئے کوئی سامان ہونا ضروری ہے۔ لوگ ایسے موقع پر ناچ کے عادی ہیں۔ یہ نہ ہٹوا۔ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ ایسی حالت میں میرا کیا فرض ہے؟ بھائی صاحب کو اس مذموم رسم کی پیروی سے روکنا چاہئے۔ لیکن کیا میں اس امر محال میں کامیاب ہو سکوں گا؟ بزرگوں کے رو برو اصول اور اخلاق کی تقریر بے موقع معلوم ہوتی ہے۔ اُن کے دل میں بڑے بڑے حوصلے ہیں۔ ان کے پورے ہونے میں کچھ بھی کسر رہ گئی۔ تو انہیں ملال ہو گا۔ لیکن کچھ بھی ہو۔ میرا تو فرض یہی ہے۔ کہ اپنے اصول پر ثابت رہوں۔

اگرچہ شرابی کو معلوم تھا۔ کہ میری اصول پسندی کے قدر دان

بہت کم ہوں گے۔ بیشتر لوگ میرے مخالف ہی نکلیں گے۔ لیکن انہیں جذبہ عام کے سامنے سر جھکانا غایت درجہ کی کمزوری معلوم ہوئی، انہوں نے طے کر لیا۔ کہ ناچ کا انتظام نہ کروں گا۔ جب اپنے گھر ہی میں اصلاح نہ کر سکا۔ تو دوسروں کے اصلاح کی سعی ابلہ فریبی سے کم نہیں ہے۔
 دل میں یہ مصمم ارادہ کر کے شرما جی مجلس کے اور سامان جمع کرنے لگے۔ وہ ایسے خوشی کے موقع پر بخل کو بالکل غیر مناسب سمجھتے تھے۔
 اس کے ساتھ ہی ان کا منشا یہ بھی تھا۔ کہ آرائش اور نفاست کے سامان اس قدر جمع کر دوں۔ کہ ناچ کی کمی پوری ہو جائے۔ اور کسی کو یہ گمان نہ ہو۔ کہ کفایت کے خیال سے یہ روش اختیار کی گئی ہے۔
 ایک روز بٹھل داس نے آکر فرش فروش اور آلات نادرہ کا ایک انبار لگا ہوا دیکھا۔ تو حیرت میں آ گئے۔ پوچھا ان تیار یوں میں آپ کا کیا صرف ہوا ہو گا؟

شرما۔ اس کا حساب واپسی پر ہو گا؟
 بٹھل۔ تب بھی دو ہزار سے کم تو نہ ہوں گے؟
 شرما۔ ہاں شاید کچھ اس سے زیادہ ہی ہو؟
 بٹھل۔ اتنے روپے آپ نے پانی میں ڈال دئے۔ کسی کار خیر میں صرف کرتے۔ تو اس سے قوم کو کتنا فائدہ ہوتا۔ جب آپ جیسے روشن خیال اصحاب اس صرف بجا کو رو رکھتے ہیں۔ تو دوسروں سے کیا اُمید کی جائے؟

شہرہ۔ اس معاملہ میں میں آپ سے متفق نہیں ہوں، جسے پرہیزگار
نے توفیق دی ہو۔ اُسے خوشی کی تقریروں میں دل کھول کر صرف کرنا
چاہئے۔ ہاں قرض لے کر نہیں۔ گھریلو خرچہ صرف اپنی حیثیت
دیکھ کر۔ دل کی امنگ ایسے موقع پر بھی نہ نکلے گی۔ تو کب نکلے گی!
بھٹل۔ آپ کے قیاس میں ڈاکٹر شیاچارن کی حیثیت دس پانچ
ہزار روپے صرف کرنے کی ہے یا نہیں؟

شہرہ۔ اس سے بہت زیادہ؟
بھٹل۔ مگر ابھی اپنے بڑے لڑکے کی شادی میں انہوں نے کتنی
کفایت کی۔ نانچ۔ تماشہ۔ باجا۔ گاجا۔ باغ۔ بغیچہ کسی کا پتہ نہ تھا؟
شہرہ۔ ہاں ان فضول کاریوں میں انہوں نے بڑی کفایت کی۔
لیکن اس کی کسر دعوتوں میں نکل گئی۔ بلکہ اُس سے کہیں زیادہ صرف
ہو گیا۔ ان کی کفایت کا کیا نتیجہ ہوا؟ عوام کو اس سے کوئی فیض نہ پہنچا۔
بلکہ جو روپے غریب باجے والے۔ آتش باز۔ گل تراش۔ اور فراشوں
کے ہاتھ لگتے۔ وہ "مرے کمپنی" اور ہوائٹ اڈے لیڈ لاکمپنی کے نذر
ہو گئے۔ میں اسے کفایت نہیں کہتا۔ یہ غربا کی حق تلفی ہے؟

— (۳) —

رات کے ۹ بجے تھے۔ پدم سنگھ اپنے بھائی کے ساتھ بیٹھے ہوئے
شادی کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔ کل بارہ رات جائے گی۔ دروازہ

پر شہنائی بچ رہی تھی۔ اور اندر منگل گانا ہو رہا تھا۔ برآمدے میں چار پائیلوں
کی لمبی قطار بچھی ہوئی تھی۔ اُن پر اہل نوید پڑے خراٹے لیتے تھے۔
مدن سنگھ نے پوچھا تم نے جو گاڑیاں بھجی ہیں۔ وہ کل شام تک
امولا پہنچ جائیں گی؟

پدم سنگھ۔ جی نہیں دوپہر تک ہی پہنچ جائیں گی۔ امولا بندھیال
کے قریب ہے۔ آج میں نے دوپہر کے قبل ہی انہیں روانہ کر دیا۔
مدن۔ تو یہاں سے کیا کیا سامان لے چلنے کی ضرورت ہے؟
پدم۔ میرے خیال میں مجلسی سامان کی آپ کو مطلق ضرورت نہ ہوگی۔
ہاں کچھ کھانے پینے کی چیزیں لیتے چلے جاسکتے ہیں وہاں کے ملنے میں دیر ہو۔
تو ناحق تکلیف ہوگی؟

مدن۔ ناچ کتنے پرٹے ہوئے دوہی ٹالٹے ہیں نا؟
پدم سنگھ کا رنگ فق ہو گیا۔ ناطقہ بند ہو گیا۔ وہ ڈر رہے تھے۔ کہ یہ
سوال ہوا ہی چاہتا ہے۔ شرم سے سر جھکا لیا۔ اور دبی زبان سے بولے۔
”جی ناچ تو میں نے نہیں طے کیا؟“

مدن سنگھ چونک پڑے۔ جیسے کسی نے زور سے چٹکی کاٹ لی ہو۔
اور بولے۔ ”خوب! تم نے تو ڈونگا ہی ڈبا دیا۔ پھر تم نے جنوا سے کا کیا
انتظام کیا ہے؟ کیا فرصت ہی نہیں ملی۔ یا خرچ سے ہچک گئے؟ میں
نے تو اس لئے چار دن پہلے سے تمہیں اطلاع دے دی تھی جو شخص
براہمن کو نیوٹہ دیتا ہے۔ وہ اسے دکشادینے کا بھی پوتا رکھتا ہے۔“

اگر تمہیں خرچ کا خیال تھا۔ تو مجھے صاف صاف لکھ دیتے۔ میں یہاں سے روپے بھیج دیتا۔ ابھی نارائن کی دیا سے کسی کا محتاج نہیں ہوں۔ اب بھلا بتاؤ کیا انتظام ہو سکتا ہے منہ میں کا لکھ لگی یا نہیں؟ ایک بھلے مانس کے دروازے پر جا رہے ہو۔ وہ اپنے دل میں کیا کہے گا؟ اس کے عزیز واقربا دور دور سے نوید میں آئے ہونگے۔ دور دور کے گاؤں کے لوگ بارات میں شریک ہونے کے لئے آئیں گے۔ وہ سب اپنے دل میں کیا کہیں گے؟
رام رام!!

منشی بیچناٹھ گاؤں میں ۸ کے حصّہ دار تھے۔ مدن سنگھ کی طرف پُر معنی انداز سے دیکھ کر بولے: دل میں نہیں جناب کھول کھول کر کہیں گے۔ تالیا دیں گے۔ منہ پر صلواتیں سنائیں گے۔ کہیں گے نام بڑے درشن تھوڑے، سارے قرب و جوار میں ناموسی ہو جائے گی۔ نالچ کے بغیر بھی کہیں مجلس ہوئی ہے۔ کم سے کم میں نے تو کبھی نہیں دیکھی۔ شاید بھٹیا کو خیال ہی نہیں رہا۔ یا ممکن ہے لگن کی تیزی سے انتظام نہ ہو سکا ہو؟

پدم سنگھ نے مذمت سے کہا: جی نہیں یہ بات تو نہیں

ہے۔۔۔۔۔

مدن۔ تو پھر کیا بات ہے؟ تم نے اپنے دل میں بھی سوچا ہو گا۔ کہ سارا بار بھی پر پڑے گا۔ پر میں تم سے از روئے ایمان کہتا ہوں۔ کہ میں نے اس خیال سے تمہیں نہیں لکھا تھا۔ میں دوسروں کے ماتھے پھلوڑیاں

کھانے کا شوق نہیں کرتا۔

پدم سنگھ بھائی کی یہ ملامت آمیز باتیں نہ برداشت کر کے آنکھیں
بھرا آئیں۔ بولے: ”بھتیہ ایشور کے لئے آپ میری نسبت ایسا خیال نہ
کریں۔ اگر میری جان بھی آپ کے کام آسکے۔ تو مجھے اُس کے دیدینے
میں مطلق دریغ نہ ہوگا۔ مجھے اس کی دلی تمنا ہے۔ کہ آپ کی کوئی خدمت
کر سکوں۔ یہ خطا مجھ سے محض اس لئے ہوئی ہے۔ کہ آج کل شہر میں
لوگ ناچ کے رواج کو معیوب سمجھنے لگے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں
اس رواج کی سخت مخالفت ہو رہی ہے۔ اور میں بھی اس تحریک
میں شریک ہو گیا ہوں۔ اپنے اصول کے خلاف عمل کرنے کی مجھے
ہمت نہ ہوئی۔“

مدن۔ اچھا یہ بات ہے! بھلا کسی طرح لوگوں کی آنکھیں تو کھلنے
لگیں۔ میں ذاتی طور پر اس رسم کو معیوب سمجھتا ہوں۔ لیکن بھٹی نگو نہیں
بننا چاہتا۔

جب سب لوگ چھوڑ دیں گے۔ میں بھی چھوڑ دوں گا۔ مجھی کو ایسی
کیا غرض پڑی ہے۔ کہ سب کے آگے آگے ہوں۔ میرے ایک ہی
لڑکا ہے۔ اس کی شادی میں دل کا کوئی حوصلہ باقی نہیں رکھنا چاہتا
شادی کے بعد میں بھی تمہاری تحریک میں شامل ہو جاؤں گا۔ اس
دقت مجھے اپنے پرانے طریق پر چلنے دو۔ جب ایشور تمہیں لڑکا دے
اور اس کی شادی کا موقع آئے۔ تو تم ان نئے رواجوں پر عمل کرنا پس

ذرا بھی کان نہ ہلاؤں گا۔ اگر بہت زیادہ تکلیف نہ ہو۔ تو صبح کی گاڑی سے چلے جاؤ۔ اور دونوں طائفے ساتھ لئے ہوئے امولا چلے آؤ۔ تم سے اس لئے کہتا ہوں۔ کہ تمہاری وہاں لوگوں سے شناسائی ہے۔ کفایت سے کام ہو جائے گا۔ دوسرے جائیں گے۔ تو لٹ جائیں گے۔

پدم سنگھ نے سر جھکا لیا۔ اور سوچنے لگے۔ انہیں خاموش دیکھ کر مدن سنگھ نے تیور بدلے اور کہا: چپ کیوں ہو؟ کیا جانا منظور نہیں؟
پدم سنگھ نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے نہایت انکسار کے ساتھ کہا: بھئی اگر مجھے معاف.....

مدن سنگھ۔ نہیں نہیں میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ نہیں جانا چاہتے تو مت جاؤ۔ منشی بیچنا تھا آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ لیکن میری خاطر سے آپ ہی چلے جائیے۔

بیچنا تھا۔ مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔
مدن سنگھ۔ صبح کی گاڑی سے جائیے۔ شام تک امولا پہنچ جائیے

آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔

بیچنا تھا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ میں پلا جاؤں گا۔
کچھ دیر تک تینوں آدمی خاموش بیٹھے رہے۔ مدن سنگھ اپنے بھائی کو احسان فراموش سمجھ رہے تھے۔ اسے اپنے لڑکے کی طرح پالا۔ ادماج ذرا سی بات پر یہ نکل کھڑا ہوا۔ بیچنا تھا کو اندیشہ ہو رہا تھا۔

کہ بدن سنگھ کی حمایت پدم سنگھ کو ناگوار تو نہ گزرے گی۔ اور پدم سنگھ اپنے بھائی کے عتاب کے خوف سے دبے ہوئے تھے۔ سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایک طرف بھائی کی ناراضگی کا خوف تھا۔ دوسری جانب حق اور اخلاق اور اصول کا خون۔ ایک طرف اندھیری گھاٹی تھی۔ اور دوسری جانب سیدھی چٹان۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ برادرانہ سعادتمندی اور قومی فرض میں کشمکش ہو رہی تھی۔ میں بھائی صاحب کی گود میں کھیلا ہوں۔ ان کے ہاتھوں پلا ہوں۔ یہ جسم ان کا ہے ضمیر کا خون کرنا میرے امکان سے باہر ہے۔ لیکن ضمیر کیا ہے؟ محض حالات گرد و پیش کا مرقع۔ ان اثرات کے قبول کرنے کی صلاحیت مجھ میں کہاں سے آئی؟ یہ اس تعلیم کی برکت ہے۔ جو بھائی صاحب ہی کے طفیل مجھے حاصل ہوئی ہے۔ ان کی رضامندی کے مقابلہ میں میرے ضمیر کی کیا ہستی ہے؟ میرا نام میری شہرت۔ میری اصول پسندی کیا چیز ہے؟ یہ میری کم ظرفی ہے۔ جو اصول کی آڑ لے رہی ہے۔ یہ کلنک اپنے اوپر نہ لگاؤں گا۔ ان کی خاطر مجھے اصول اور ضمیر سے زیادہ عزیز ہے۔ لیکن ایک بار کیوں نہ پہرا نہیں سمجھانے کی کوشش کروں؟ اگر مان گئے۔ تو فہما۔ ورنہ بے مذر ان کے حکم کی تعمیل کروں گا۔

یوں دل میں فیصلہ کر کے انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ بھائی صاحب! آپ نے میری بہت سی نادانیاں معاف کی ہیں میری ایک گستاخی اور معاف کیجئے۔ آپ جب ناچ کی رسم کو معیوب سمجھتے ہیں۔ تو اس پر اس قدر

زور کیوں دیتے ہیں؟“
 مدن سنگھ جھنجھلا کر بولے۔ ”تم تو ایسی باتیں کرتے ہو۔ گویا اس دس
 میں پیدا ہی نہیں ہوئے کسی غیر ولایت سے آئے ہوئے ہو۔ ایک
 یہی کیا۔ کتنے ہی ایسے رسوم ہیں جنہیں معیوب سمجھ کر بھی ان کی پابندی
 کرنی پڑتی ہے۔ نہ کرو تو عزت میں بڑھ لگتا ہے، گالی گانا کون سی اچھی
 بات ہے؟ جہیز لینا کون سی اچھی بات ہے۔ لیکن اگر بیت پر نہ چلو۔ تو لوگ
 ہنسی اڑاتے ہیں۔ ناچ نہ لے جاؤں۔ تو لوگ ہی کہیں گے۔ کہ کنجوسی کے
 مارے نہیں لائے میری نیت کو کون دیکھتا ہے؟“

پدم سنگھ۔ اچھا اگر اسی رقم کو کسی دوسرے مناسب طریق پر
 خرچ کر دیجئے۔ تب تو کسی کو کنجوسی کی شکایت نہ رہے گی۔ آپ دو
 ٹائفے لے جانے چاہتے ہیں۔ آج کل لگن تیز ہے۔ تین سو روپیہ سے
 کم صرف نہ ہو گا۔ اگر آپ تین سو کی جگہ پانچ سو کے کٹل لے کر امولا کے
 غربا کو بانٹ دیجئے۔ تو کیسا ہو، کم سے کم دو سو آدمی آپ کو دعائیں
 دیں گے۔ اور جب تک کمال کا ایک دھاکا بھی باقی رہے گا۔ آپ کا
 جس گائیں گے۔ اگر یہ منظور نہ ہو۔ تو اس جوار میں اسی روپے سے ایک
 پختہ کنواں بنوادیجئے۔ اس سے آپ کا نام ہمیشہ کے لئے برقرار رہے گا۔
 اس کا بار میرے اوپر رہے گا۔

مدن سنگھ نے بدنامی کا جو سہارا لیا تھا۔ وہ ان تجویزوں کے
 سامنے قائم نہ رہ سکا۔ وہ اس کا کوئی جواب سوچ رہے تھے۔ کہ منشی بیچنا لے

جو اس وقت باوجود پدم سنگھ کی ناراضگی کے خوف کے اپنی جودت و فراست کے اظہار سے باز نہ رہ سکتے تھے۔ بولے ”بھیا۔ ہر ایک کام کے لئے موقع اور محل ہوتا ہے، جشن کے موقع پر جشن۔ خیرات کے موقع پر خیرات بے موقع بات کبھی بھی نہیں لگتی۔ اور پھر شہر کے واقف کار آدمی ہوں۔ تو ایک بات بھی ہے، دیہات کے اُچڑ کندہ ناتراش زمینداروں کے سامنے آپ مکمل تقسیم کرنے لگیں گے۔ تو وہ تعجب سے آپ کا منہ دیکھیں گے۔ اور ہنسیں گے۔“

مدن سنگھ لا جواب ہو گئے تھے منشی بیچنا تھ کی اس باموقعہ امداد سے بہت خوش ہوئے۔ اُن کی طرف احسان مندانہ نگاہ سے دیکھ کر بولے ”ہاں اور کیا ہوگا؟ بسنت میں مار گانے والے کو کون اچھا کہے گا؟ بے وقت کی راگنی کبھی بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ اسی سے تو کتا ہوں۔ کہ آپ سویرے چلے جائیے۔ اور دونوں ڈیرے طے کر آئیے۔“

پدم سنگھ نے سوچا۔ یہ لوگ اپنے من کی توکریں ہی گے۔ پر دیکھوں کن دلیلوں سے اپنے دعوے کو ثابت کرتے ہیں، انہیں یہ ملال بھی ہوا۔ کہ بھائی صاحب منشی بیچنا تھ پر مجھ سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ دلیر ہو کر بولے ”تو کیونکر مان لیا جائے۔ کہ شادی جشن ہی کا موقع ہے میں تو سمجھتا ہوں تو اب اور خیرات کا اس سے بہتر اور کوئی موقع نہ ہوگا، شادی ایک مقدس فرض ہے۔ ایک روحانی معاہدہ ہے جب

ہم دنیاوی ذمہ داریوں میں قدم رکھتے ہیں۔ جب ہمارے پیروں میں
علائق دنیا کی بیڑی پڑتی ہے۔ جب ہم فرائض اور پابندیوں کے
آگے اپنے سر جھکاتے ہیں۔ ایسی پاک رسم کا احترام کرنا ہمارا فرض ہے
اس موقع پر ہم کو متانت سے کام لینا چاہئے۔ یہ کتنی بے رحمی ہے۔
کہ جس وقت ہمارا ایک عزیز ایسا اٹل برت لے رہا ہو۔ ہم جشن مناتے
بیٹھیں۔ وہ ان فرائض کے بارعظیم سے دبا جاتا ہو۔ اور ہم رقص و سرود
کی مجلس آراستہ کریں۔ اگر آج کل بد قسمتی سے یہ اُلٹی بات رائج ہو گئی ہے۔
تو کیا یہ ضروری ہے۔ کہ ہم بھی اسی لکیر کے فقیر بنیں۔ تعلیم کا کم سے کم
اتنا اثر تو ہونا چاہئے۔ کہ مذہبی معاملات میں ہم جھپلا کی خوشی کو مقدم
نہ سمجھیں!“

بیچناٹھ زمین کی طرف تاکنے لگے۔ مدن سنگھ نے آسمان کی طرف
تاکا۔ پدم سنگھ کی تقریر انہیں بالکل برحق معلوم ہوتی تھی۔ پر رواج کے
سامنے سچائی۔ حق اور اصول کسی کی نہیں چلتی۔ انہیں خوف تھا۔ کہ
اب بیچناٹھ کچھ جواب نہ دے سکیں گے۔ لیکن منشی جی ابھی ہار نہیں
ماننا چاہتے تھے۔ بولے: بھیا تم وکیل ہو تم سے بحث کرنے کی لیاقت
مجھ میں کہاں ہے؟ لیکن جو بات سناتن سے ہوتی چلی آئی ہے۔ اس
کے مٹانے میں بدنامی ضرور ہوتی ہے۔ خواہ وہ مناسب ہو یا غیر مناسب
آخر ہمارے بزرگ نے جاہل جٹ تو تھے نہیں۔ انہوں نے کچھ سمجھ کر ہی
اس رواج کی بنیاد ڈالی ہوگی؟“

بدن سنگھ کو یہ دلیل نہ سوچھی تھی۔ بہت خوش ہوئے۔ بیچنا لکھ کی
 طرف قدر دانہ انداز سے دیکھ کر بولے "ضرور انہوں نے جو رسمیں نکالی
 ہیں۔ ان سمجھوں میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ چاہے
 وہ آج ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ آج کل کے نئے خیال والے حضرات
 اُن رسموں کے مٹانے میں اپنی بڑائی سمجھتے ہیں۔ اپنے سامنے بزرگوں
 کی کوئی حقیقت ہی نہیں سمجھتے۔ حالانکہ ہمارے پاس جو عزت و حرمت
 علم و شعور ہے۔ وہ سب انہیں بزرگوں کی کمائی ہے۔ کوئی کتنا ہے۔ جنیو
 پہننے سے کیا فائدہ! کوئی چوٹی کی جڑ کاٹنے پر تلا ہوا ہے۔ کوئی اسی
 دھن میں ہے۔ کہ شودر اور چاندل سب چھتری ہو جائیں۔ کوئی
 ودھواؤں کی شادی کے راگ الاپتا پھرتا ہے۔ اور تو کچھ ایسے حضرات
 بھی ہیں۔ جو ذات اور برن کو بھی مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے۔
 کہ جب یہ تفریق نہ رہے گی۔ تو سارے ہندوستان میں اتفاق اور اتحاد
 کی سلطنت قائم ہو جائے گی۔ تو بھئی یہ سب باتیں ہمارے قابو کی
 نہیں ہیں۔ جنہیں ماننا ہونا ہے۔ اسے مبارک ہو۔ ہم کو تو وہی اپنی
 پُرانی روش پسند ہے۔ اگر زندہ رہا۔ تو دیکھوں گا۔ کہ یورپ کا پودا یہاں
 کیا کیا گل کھلاتا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے کھیتی کو سب سے اعلیٰ پیشہ
 کہا ہے۔ لیکن آج کل یورپ کی دیکھا دیکھی لوگ مل اور مشینوں کے
 پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ پر دیکھ لینا ایسا کوئی دن آئے گا۔ کہ یورپ
 والے خود چیتیں گے۔ اور مل کھود کر کھیت بنائیں گے۔ آزاد کاشتکار

کے سامنے کارخانہ کے مزدوروں کی کیا ہستی ہے؟ وہ کوئی ملک ہے۔
 جہاں باہر سے کھانے کی چیزیں نہ آئیں۔ تو لوگ بھوکوں مریں۔ جن ملکوں
 میں زندگی کے ایسے اُلٹے طریق رائج ہوں۔ وہ ہمارے لئے کبھی نمونہ
 نہیں بن سکتے۔ صنعت اور حرنت کی یہ قدر اسی وقت تک ہے۔ جب
 تک دنیا میں کمزور اور غیر محفوظ قومیں موجود ہیں۔ اُن کے گلے سستا
 مال مڑھ کر یورپ والے چین کرتے ہیں۔ سنگین کی نوک پر اپنی جنسیں
 بیچتے ہیں۔ پرچوں ہی یہ قومیں بیدار ہونگی۔ یورپ کا اقتدار خاک میں
 مل جائے گا۔ اس کی ثروت اور حشمت تحت الشریٰ میں پہنچ جائیگی۔
 ہم یہ نہیں کہتے۔ کہ یورپ والوں سے کچھ مت سیکھو۔ نہیں وہ آج
 دنیا کے مالک ہیں۔ اور ان میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اُنکی خوبیوں
 کو لے لو۔ بُرائیوں کو چھوڑ دو۔ اُن سے جفاکشی سیکھو۔ پرتکلف
 پسندی نہیں۔ اُن سے مستقل مزاجی سیکھو۔ پر رعونت نہیں۔ اُن
 کی تقلید کر کے زندگی کی ضرورتیں مت بڑھاؤ۔ نفس کے غلام مت
 بنو۔ خود غرضی کا کلمہ مت پڑھو۔ غریبوں کو مت کچلو۔ ہمارے اپنے
 رسم و رواج ہمارے حالات اور ضروریات کے موافق ہیں۔ اُن میں ہونہ
 لگانے کی ضرورت نہیں۔“

مدن سنگھ نے یہ باتیں کچھ ایسی اہمیت کی نشان سے کہیں۔ گویا
 کوئی عالم اپنے علمی انکشافات بیان کر رہا ہے۔ حالانکہ ان کا ماخذ سنی
 سنائی باتوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جن کا مطلب وہ خود بھی نہ سمجھتے

تھے۔ پدم سنگھ نے فلسفیانہ صبر کے ساتھ سنا۔ اور اس خوف سے کہ کہیں یہ مباحثہ حجاد لہ کی صورت نہ اختیار کر لے جس کے آثار نظر آرہے تھے۔ اسے ختم کرنا ہی مناسب سمجھا۔ بہت ملائمت سے بولے: جی ہاں آپ کا یہ فرمانا بہت صحیح ہے۔ کہ ہم لوگوں کو یورپ کی کورانہ تقلید نہ کرنی چاہیے۔ لیکن معاف کیجئے گا۔ ہمارے یہاں کا نظام تمدن جس وقت قائم کیا گیا تھا۔ اس وقت سے اب تک تاریخ میں بہت کچھ انقلاب ہو گیا ہے۔ اور ان انقلابوں کا اثر ہماری معاشرت اور اخلاق پر پڑنا لازمی تھا۔ مگر میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اگر آپ کا ارشاد ہے۔ تو میں صبح کی گاڑی سے چلا جاؤں گا اور طائفے طے کر لاؤں گا۔ منشی جی کو کیوں تکلیف دیجئے گا۔ ان کے چلے جانے سے یہاں کتنے ہی کام پڑے رہ جائیں گے، آئیے بھائی صاحب۔ ہم دونوں آدمی باہر چلیں مجھے آپ سے ابھی کچھ باتیں کرنی ہیں۔

مدن سنگھ۔ تو یہیں کیوں نہیں کرتے؟ کم تو میں ہی اٹھ جاؤں؟

پدم سنگھ۔ جی نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ پر یہ باتیں ہیں منشی جی سے اپنے اطمینان کے لئے کر رہا ہوں۔ بھائی صاحب بتلائیے امولا میں تماشائیوں کی تعداد کتنی ہوگی؟ کوئی ایک ہزار؟ بیچنا تھ نے سنہیل کو جواب دیا: اس سے کچھ زیادہ ہی ہونگے۔

پدم سنگھ۔ اچھا آپ کے خیال میں ان میں کتنے غریب کسان ہونگے۔
اور کتنے خوشحال زمیندار؟

بیچنا تھ۔ زیادہ تر کسان ہی ہوں گے۔ لیکن زمیندار بھی دو تین
سو سے کم نہ ہوں گے؟

پدم۔ اچھا۔ آپ یہ مانتے ہیں۔ کہ انسان اپنی بدنی ضرورتیں رفع
کر کے تب کھیل تماشے کی طرف مخاطب ہوتا ہے؟

بیچنا تھ۔ ہاں یہ بھی مانتا ہوں۔ بھوکا بھلا کیا تماشہ دیکھے گا؟

پدم۔ تو آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ ان کسانوں کو اگر کھل یا
کپڑے دے دئے جائیں۔ تو وہ ناچ دیکھنے کے مقابلے میں زیادہ
خوش ہوں گے؟

بیچنا تھ۔ نہیں میں اسے نہ مانوں گا۔ زیادہ تر کسان ایسے
ہوتے ہیں۔ جو خیرات کے نام پر ایک کیا سو کھل بھی نہ لیں گے۔ وہ
جلسہ دیکھنے آئیں گے۔ اور مجلس دیران دیکھیں گے۔ تو ناکام لوٹ
جائیں گے؟

پدم سنگھ نے سقراطی سوالات کا جو سلسلہ دل میں قائم کر رکھا تھا۔
وہ برہم ہو گیا۔ سمجھ گئے۔ کہ منشی جی ہوشیار ہیں۔ اب کوئی دوسرا داؤں
کھیلنا چاہئے۔ بولے: "اچھا اُسے جانے دیجئے۔ آپ یہ مانتے ہیں۔ کہ
بازار میں وہی جنس نظر آتی ہے۔ جس کے خریدار ہوتے ہیں۔ اور
خریداروں کی کثرت یا قلت پر اس جنس کی کمی یا بیشی منحصر ہے؟

بیچنا تھ۔ جی ہاں اس میں کوئی شک نہیں۔

پدم سنگھ۔ اس لحاظ سے کسی جنس کے خریدار ہی اُسے بازار میں لانے کے باعث ہوتے ہیں۔ اگر کوئی گوشت نہ کھائے۔ تو بکرے کی گردن پر چھری کیوں چلے؟

بیچنا تھ سمجھ رہے تھے۔ کہ یہ حضرت مجھے کسی دوسرے بیچ میں لا رہے ہیں۔ لیکن ابھی تک اس کی نہ تک نہ پہنچے تھے۔ ڈرتے ہوئے بولے۔
”ہاں بالکل صحیح ہے۔“

پدم سنگھ۔ جب آپ یہ مانتے ہیں۔ تو آپ کو یہ مانتے میں کیا تاثر ہو سکتا ہے۔ کہ جو لوگ طاغیوں کو مجلسوں میں بلاتے ہیں۔ انہیں بڑی بڑی رقمیں دے کر ان کے لئے آسائش اور تکلف کے سامان حتمی کرتے ہیں۔ اور انہیں امیرانہ زندگی بسر کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ وہ اس قصاب سے کم گنہگار نہیں ہیں۔ جو بکرے کی گردن پر چھری چلاتے ہیں۔ اگر میں وکیلوں کو شان سے گتھی دوڑاتے نہ دیکھتا۔ تو آج میں ہرگز وکیل نہ ہوتا۔

بیچنا تھ نے ہنس کر کہا: بھتیانم گھما پھرا کر اپنی بات منوالیتے ہو۔
لیکن بات جو کہتے ہو وہ سچی ہے۔

پدم سنگھ۔ تو ایسی حالت میں کیا یہ سمجھنا مشکل ہے۔ کہ یہ سیکڑوں عورتیں جو بالا خانوں پر بیٹھی نظر آتی ہیں۔ جنہوں نے اپنی شرم اور عفت بیچ دی ہے۔ ان کی زندگی کو تباہ کرنے والے ہم ہی لوگ ہیں۔

وہ ساری قومی اور مجلسی برائیاں جو اس بے شرمانہ زندگی کا نتیجہ ہیں۔ ان کے ذمہ دار ہمیں لوگ ہیں۔ وہ ہزاروں خاندان جو آئے دن اس نفسانیت کے بھنور میں پڑ کر تباہ ہوتے رہتے ہیں۔ ایشور کے دربار میں ہمارا دامن پکڑیں گے۔ اور اس وقت ہم کو کوئی جواب نہ سوجھے گا۔ جس رواج سے ایسے خطرناک اور مملکت نتائج پیدا ہوں۔ اُسے ترک کرنے میں ہم کو مطلق پس و پیش نہ ہونا چاہئے۔ انسان خیال کا پتلا ہے۔ خیال ہی ارادہ اور فعل کا محرک ہے کون کہہ سکتا ہے۔ کہ ایسی مجلسوں میں ہمارے خیالات پر کوئی اثر نہیں پڑتا؛ جس فعل کا لازمی نتیجہ تخریب ہو۔ کیا اس سے محترز رہنا اچھی بات نہیں؟

مدن سنگھ بڑے غور سے یہ تقریر سنتے رہے۔ اُن کی معقولیت کا اثر ان کے چہرہ پر نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے وہ اعلیٰ تعلیم نہیں پائی تھی۔ جب انسان ایک کو دو ثابت کرنے کے لئے بھی دلیلوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ اور علمی آزاد خیالیوں کی دھن میں مجلسی پابندیوں کا دشمن اور اخلاقی قیود کا مخالف ہوتا ہے۔ نہیں وہ معمولی عقل اور فہم کے آدمی تھے۔ قابل ہو کر کج بحثی کرتے رہنا ان کی استعداد سے باہر تھا۔ مسکرا کر منشی بیچنا تھ سے بولے: ”کو لالہ بیچنا تھ۔ اب کیا کہتے ہو؟“

بیچنا تھ۔ مجھے تو کوئی راستہ نہیں نظر آتا؛
مدن سنگھ۔ اچی کچھ کہتے جتنی ہی کرو؛

بیچنا تھ۔ کچھ دنوں وکالت پڑھ لی ہوتی تو وہ بھی کرتا۔ یہاں تو اب کوئی جواب نہیں سوچتا۔ کیوں بھٹیادیم سنگھ۔ مان لو تم میری جگہ ہوتے تو کیا جواب دیتے؟

پدم سنگھ۔ (ہنس کر) جوابوں کی کیا کمی ہے۔ جس نے فلسفہ پڑھا ہے۔ وہ سیاہ کو سفید کر سکتا ہے۔ آسمان کو زمین ثابت کر سکتا ہے۔ روشن کو تاریک ثابت کر سکتا ہے۔ فلسفہ کے لئے کوئی امر مشکل نہیں؟

مدن سنگھ۔ اتنا تو میں بھی کہوں گا۔ کہ ایسے جلسوں سے خیال ضرور خراب ہو جاتا ہے۔ میں جوانی میں جب کسی جلسے سے لوٹتا۔ تو مہینوں تک اس طوائف کی شکل صورت۔ ناز و انداز گانے بجانے کا چرچا کیا کرتا۔ ایک جنون سا سر پر سوار تھا۔ بیچنا تھ۔ تو بھٹیادیم سنگھ ہی کے من کی ہونے دیجئے یہی نہ ہوگا۔ دس پانچ آدمی ہنسیں گے۔ کوئی پروا نہیں۔ لیکن کنوال ضرور بنوا ئے؟

پدم سنگھ۔ ادھر منڈپ میں بھانوریں پڑیں۔ اور میں نے کنوئیں کی نیور تھی؟

— (۴) —

برسات کے دن تھے گھٹا چھپائی ہوئی تھی۔ پنڈت اُمانا تھ

چنار گڑھ کے قریب گنگائے کنارے کھڑے کشتی کا انتظار کر رہے تھے۔
 وہ کئی موضوعوں کا چکر لگا کر آئے تھے۔ اور اس وقت چنار کے پاس
 ایک گاؤں میں جانا چاہتے تھے۔ انہیں خبر ملی تھی۔ کہ اس گاؤں میں
 کوئی لائق بر ہے۔ اُماناتہ آج ہی امولا لوٹ جانا چاہتے تھے۔ مگر
 ابھی تک کشتی اُسی پار کھڑی تھی۔ اُماناتہ کو ملا تھوں پر غصہ آ رہا تھا۔
 اس سے زیادہ غصہ اُن مسافروں پر آ رہا تھا۔ جو اُس پار کشتی پر
 بیٹھنے کے لئے آہستہ آہستہ آتے جاتے تھے۔ جب کھڑے کھڑے دیر
 ہو گئی۔ تو اُماناتہ نے زور سے چلا کر ملا تھوں کو پکارا۔ لیکن اُن کی صدا
 کو ملا تھوں کے کان تک پہنچنے کا زیادہ شوق نہ تھا۔ وہ لہروں سے
 کھیلی ہوئی۔ ان میں سما گئی۔

یہ ایک اُماناتہ کو ایک سادھو اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی
 دئے۔ لاسبا آدمی تھا۔ چوڑا سینہ۔ سُرخ آنکھیں۔ سر پر جٹا۔ گلے میں بڑے
 بڑے دالوں کی ماذا۔ ایک ہاتھ میں سلفے کی لمبی حلیم۔ دوسرے ہاتھ
 میں لوہے کا چمٹا۔ پیٹھ پر ایک مرگ چھالا لیٹے ہوئے۔ آکر ندی کے
 کنارے کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی اُس پار جانا چاہتا تھا۔

اُماناتہ کو ایسا خیال آیا۔ کہ میں نے اس سادھو کو کہیں دیکھا
 ہے۔ پر یاد نہیں آتا تھا۔ کہ کہاں؟ حافظہ پر ایک پردہ سا پڑا ہوا
 تھا۔

اتنے میں سادھو نے اُماناتہ کی طرف تাকা۔ اور پر نام کر کے بولا۔

"تمہارا جگر پر تو سب کُشل ہے؟ یہاں کیسے آنا ہوا؟"
 اُماناتہ کی آنکھوں پر سے پردہ ہٹ گیا۔ یاد تازہ ہو گئی۔ ہم صورت
 بدل سکتے ہیں۔ پر آواز کو نہیں بدل سکتے۔ یہ گجاردھر پانڈے تھے؟
 جب سے سمن کی شادی ہوئی تھی۔ اُماناتہ اُس سے ملنے نہیں
 گئے تھے۔ اُسے منہ دکھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس وقت گجاردھر
 کو اس صورت میں دیکھ کر انہیں تعجب ہوا۔ انہوں نے سمجھا۔ کہیں
 تجھے پھر دھوکا نہ ہوا ہو۔ پوچھا۔ آپ کا نام؟
 سادھو۔ پہلے تو گجاردھر پانڈے تھا۔ اب گجاند ہے؟
 اُماناتہ۔ اوہو! ابھی تو میں پہچان نہ سکتا تھا۔ یاد آتا تھا۔ کہ آپ کو
 کہیں دیکھا ضرور ہے۔ پر آپ نے یہ بھیس کیوں لیا۔ بال بچے کہاں ہیں؟
 سادھو۔ اُس جنجال سے اب آزاد ہو گیا؟
 اُماناتہ۔ سمن کہاں ہے؟
 گجاند۔ دال منڈی میں ایک کوٹھے پر۔
 اُماناتہ نے متحیر ہو کر گجاند کی طرف دیکھا۔ اور تب شرم سے ان کا
 سر جھک گیا۔ ایک لمحہ کے بعد بولے۔ "یہ کیونکر؟"
 گجاند۔ بالکل اُسی طرح جیسے سنار میں غموں ہوا کرتا ہے۔
 میری بد مزاجی اور بے رحمی سمن کی شوخ طبعی اور شوق آرائش دونوں
 نے مل کر ہمیں ملیا میٹ کر دیا۔ میں اب اُس وقت کی باتوں کو سوچتا
 ہوں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک اُوپنے خاندان کی لڑکی سے شادی

کرنے میں میں نے بڑی غلطی کی۔ اور اس سے بڑی غلطی یہ کی۔ کہ شادی
 ہو جانے پر اس کی ناز برداری نہ کر سکا۔ میں غریب تھا۔ اس لئے
 ضروری تھا۔ کہ میں اس کی محبت اور دلجوئی سے پورا کرتا میں نے اس
 کے برعکس اُسے کھانے پینے کی بھی تکلیف دی۔ وہ چوکے برتن چوٹے
 چکی میں مشاق نہ تھی۔ اور نہ ہو سکتی تھی۔ پر میں اُس سے یہ سب کام
 لیتا تھا۔ اور ذرا بھی دیر ہو جاتی۔ تو بگڑتا تھا۔ اب مجھے معلوم ہو رہا ہے۔
 کہ میں ہی اس کی تباہی کا باعث ہوا۔ حسن اور نفاست میں وہی تعلق ہے۔
 جو پھول اور اس کی بو میں ہے۔ سمن کو مجھ سے محبت نہ تھی۔ اور نہ ہو
 سکتی تھی۔ پر وہ میری خاطر کرتی تھی۔ جس طرح کنگال آدمی دولت پا کر
 پھول اٹھتا ہے۔ اُسی طرح حسین بیوی پا کر وہ وہم اور شک کا شکار ہو
 جاتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ میں سمن سے بدگمان نہ ہتا تھا۔ اور علانیہ
 اس کا اظہار نہ کر کے اُسے جلایا کرتا تھا۔ ہمارا ج۔ میں نے اُس کے ساتھ
 جو جو بدسلوکیاں کیں۔ انہیں یاد کر کے آج اتنی کوفت ہوتی ہے۔ کہ جی
 چاہتا ہے۔ کہ زہر کھالوں۔ یہ انہیں بے رحمیوں کا پرائیڈ تھا۔ کہ رہا
 ہوں۔ جب وہ گھر سے چلی گئی۔ تو مجھے دو چار دن وہی نشہ رہا۔ پر جب
 نشہ ہرن ہوا۔ تو وہ گھر کاٹنے لگا۔ میں پھر اندر قدم نہ رکھ سکا۔ ایک مندر
 کا پوجاری بن گیا۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا پکانے کی تکلیف سے بچا۔
 مندر میں دو چار سادھو سنت ضرور ہی آجاتے تھے۔ ان کی صحبت
 کا موقع مل جاتا تھا۔ ان لوگوں کی گیان کی باتیں سن سن کر میری آنکھیں

کچھ کچھ کھلنے لگیں۔ اب یہ بھیس لے لیا ہے۔ گاؤں گاؤں گھومتا ہوں۔
اور اپنے سے جو کچھ بن پڑتا ہے۔ غریبوں کی مدد کرتا ہوں۔ آپ کیا بنارس
سے آ رہے ہیں؟

اُماناتھ۔ نہیں۔ ایک گاؤں سے آ رہا ہوں سُمن کی ایک چھوٹی بہن
ہے۔ اس کے لئے بڑی تلاش ہے؟

گجانبند۔ لیکن اب کے اچھا بڑا ڈھونڈھے گا؟

اُماناتھ۔ بروہی تو کمی نہیں ہے۔ پر اپنے میں اتنی ہمت بھی تو ہو۔
سُمن کے لئے کیا کچھ کم دوڑ دھوپ کی تھی؟

گجانبند۔ آپ کے خیال میں کتنے روپے درکار ہوں گے؟

اُماناتھ۔ ایک ہزار تو جہیز ہی کے رکھئے۔ اور سب خراج الگ؟

گجانبند۔ آپ شادی طے کر لیں۔ ایک ہزار روپیہ کی فکر میں

کر دوں گا۔ یہ بھیس بدل کر اب لوگوں کو آسانی سے ٹھگ سکتا

ہوں۔ میں دو چار دن میں آپ سے امولا ہی میں ملوں گا؟

کشتی آگئی۔ دونوں آدمی سوار ہوئے۔ گجانبند تو ملا آجوں سے

باتیں کرنے لگے۔ لیکن اُماناتھ فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کا دل کہ

رہا تھا۔ کہ سُمن کا قاتل میں ہوں!

— (۵) —

پنڈت اُماناتھ سدن سنگھ سے شانتا کی شادی طے کر آئے ہیں،

انہوں نے جانھوی سے گجانبند کی امداد کا ذکر نہ کیا تھا۔ ڈرتے تھے۔
 کہ وہ کہیں ان روپوں کو اپنی لڑکیوں کے لئے نہ رکھ چھوڑے +
 جانھوی پر فمائش کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا + وہ اس کے سامنے اس کی ہاں
 میں ہاں ملانے پر مجبور ہو جاتے تھے +

انہوں نے ایک ہزار کے جہیز پر شادی طے کی تھی۔ پر اب اس
 فکر میں پڑے ہوئے تھے۔ کہ بارات کے لئے خرچ کا کیا انتظام ہوگا۔
 کم سے کم ایک ہزار کی ضرورت تھی۔ اس کے ملنے کی کوئی صورت نظر
 نہ آتی تھی۔ ہاں انہیں اس خیال سے مسرت ہوتی تھی۔ کہ ثنائت کا بیاہ
 ایک اچھے گھر میں ہوگا۔ وہ آرام سے رہے گی۔ اور گنگا جلی کی آسنا
 میرے اس کام سے خوش ہوگی +

بالآخر جب شادی کو تین ہی ماہ اور رہ گئے۔ اور روپیہ کا کوئی انتظام
 نہ ہو سکا۔ تو انہوں نے اس کی فکر کرنا چھوڑ دی۔ دل میں منبصلہ کیا۔ کہ
 بارات کے اخراجات کی مدد ہی غائب کر دوں گا۔ کسی نہ کسی بات پر
 باراتیوں سے بگڑ جاؤں گا۔ وہ لوگ آپ ہی ناراض ہو کر لوٹ جائیں
 گے۔ یہی نہ ہوگا۔ قصوڑی سی بدنامی ہوگی لیکن شادی تو ہو جائے گی۔ لڑکی
 تو آرام سے رہے گی۔ میں قنصلہ ایسی خوبصورتی سے پیدا کروں گا۔ کہ سارا الزام
 باراتیوں کے سر آئے +

پنڈت کرشن چندر کو جلیخانہ سے چھوٹ کر آئے ہوئے ایک ہفتہ
 گزر چکا تھا۔ لیکن ابھی تک امانات کو شادی کے متعلق ان سے کچھ صلاح و مشورہ

کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ وہ کرشن چندر کے سامنے جاتے ہوئے
شرباتے تھے!

کرشن چندر کے اطوار میں اب ایک بڑا تغیر نظر آتا تھا۔ اُن میں
متانت کی جگہ اب سبکدوشی پیدا ہو گئی تھی۔ اور پاس وضع نام کو بھی نہ
باقی رہا تھا۔ ان کا جسم لاغر ہو گیا تھا۔ پر اعضا میں ایک خاص تیزی و
طراری آگئی تھی۔ وہ اکثر رات کو لمبی آہیں بھر بھرائے مائے کرتے
ہوئے سناٹی دیتے تھے۔ آدھی رات کو اس خوشی کے عالم میں
وہ اپنی چار پائی پر کروٹیں بدل بدل کر یہ گیت گایا کرتے تھے: یہ
اگیا لاگی سندر بن چرگیو

کبھی کبھی یہ دُہرا پڑھتے:

لکڑی جل کوئلہ بھئی اور کوئلہ جل بھورا کہ

میں پاپن ایسی جلی کہ کوئلہ بھئی نہ را کہ

ان کی آنکھوں میں ایک قسم کی شرارت اور مستی جھلکتی تھی چاندنی
اُن کے سامنے کھڑی نہ ہو سکتی تھی۔ اُسے ایک دہشت سی معلوم
ہوتی تھی:

جاڑے کے دان تھے۔ کسانوں کی عورتیں کھیتوں میں کام کرنے
جایا کرتی تھیں۔ کرشن چندر بھی اُسی طرف نکل جاتے۔ اور وہاں عورتوں
سے دل لگی کیا کرتے۔ سسرال کے رشتہ سے انہیں عورتوں سے
ہنسی مذاق کرنے کا حق تھا۔ لیکن کرشن چندر کی باتیں ایسی بے شرمانہ اور

لگا ہیں ایسی پرمی ہوتی تھیں۔ کہ عورتیں شرم سے مرنے چھپا لیتیں۔ اور اگر
جانھوی کو اُسنے دیتیں، حقیقت یہ ہے۔ کہ کرشن چندر پر شوریدہ سری
کانشہ چڑھا ہوا تھا۔

امولامیں کتنے ہی تعلیم یافتہ شریف آدمی تھے۔ کرشن چندر ان کی
صحبت سے محترم رہتے۔ اس کے برعکس وہ ہمیشہ شام کے وقت
بدقماش آدمیوں کے ساتھ چرس کے دم لگاتے دکھائی دیتے تھے۔
اس مجمع جہذا میں بیٹھے ہوئے وہ اپنے جیلخانہ کے تجربات بیان کیا
کرتے۔ ان کی گفتگو فحش و مکروہ الفاظ سے پُر ہوتی تھی۔

اُماناٹھ اپنے گاؤں میں اعزاز کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ
اپنے بنوئی کی ان خفیف حرکات کو دیکھ کر کٹ جاتے۔ اور ایشور سے دعا
مناتے کہ کسی طرح ان سے گڈا چھوٹے۔

اور تو اور سب شانتا کو بھی اپنے والد کے روبرو آنے میں خوف
اور لحاظ معلوم ہوتا تھا۔ گاؤں کی عورتیں جب جانھوی سے کرشن چندر
کی بیباکیوں کی سرگزشت بیان کرتے لگتیں۔ تو شانتا پر گھڑوں پانی پڑ
جاتا۔ وہ فوراً اس جگہ سے ہٹ جاتی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ کہ
پتاجی کو کیا ہو گیا۔ ہے۔ وہ کیسے سلیم۔ کیسے بیدار مغز۔ کیسے بااخلاق جیسے
ثقة آدمی تھے۔ یہ کایا پلٹ کیونکر ہو گئی؟ قالب تو وہی ہے۔ پردہ روح
کساں گئی؟

اس طرح ایک حسینہ گزر گیا۔ اُماناٹھ دل میں چڑھتے۔ کہ انہیں کی

لڑکی کی شادی ہے۔ اور یہی ایسے بے فکر بیٹھے ہیں۔ تو مجھے کیا غرض پڑی ہے۔ کہ خواہ مخواہ درد سراٹھاؤں۔ یہ تو نہیں ہوتا۔ کہ جا کر کہیں چار پیسے کما۔ نے کی فکر کریں۔ اپنی زندگی خراب کر رہے ہیں۔ اور اپنے ساتھ مجھے بھی لئے جاتے ہیں؟

ایک روز اماناتہ نے کرشن چندر کے ہم جلسوں کو دھمکا کر کہا۔
”اب کبھی تم لوگوں کو ان کے ساتھ چرس پیتے دیکھا۔ تو بڑی طرح پیش آؤ لگا۔ ایک ایک کی خبر لوں گا۔“

اماناتہ کا رعب سارے گھاؤں پر تھا۔ سب کے سب ڈر گئے۔
دوسرے دن کرشن چندر ان کے پاس گئے۔ تو انہوں نے صاف گسار دیا۔ ”ہمارا ج آپ یہاں نہ آیا کریں۔ پنڈت اماناتہ سے ہمارا بگڑا لینا کر اسیئے۔ کہیں کوئی معاملہ کھڑا کر دیں۔ تو ہم کہیں کے نہ آئیں۔“

کرشن چندر غصہ سے بھرے ہوئے اماناتہ کے پاس آئے۔ اور بولے ”معاذم ہوتا ہے تمہیں میرا ہاں۔ ہنا اگھرنے لگا۔“

اماناتہ کہہ۔ آپ کچھ گھر ہے۔ جب تک چاہیں رہیں۔ پر میں یہ چاہتا ہوں۔ کہ آپ ذلیل آدمیوں کے ساتھ بیٹھ کر اپنی اور میری بے عزتی نہ کرائیں؟

کرشن چندر۔ تو کس کے ساتھ بیٹھوں؟ یہاں جتنے بھلے مانس کھلاتے ہیں۔ ان میں کوئی میرے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہے؟ سب گے سب

مجھے حقیر سمجھتے ہیں۔ میں یہ ذلت نہیں برداشت کر سکتا۔ آپ ان لوگوں میں ایک بھی ایسا آدمی بتلا سکتے ہیں۔ جو نیکی کا پتلا ہو، سب کے سب دغا باز۔ حرام کار۔ غریبوں کا گلا کاٹنے والے ہیں۔ میں اپنے تنہیں ان سے بدتر نہیں سمجھتا۔ میں اپنے کئے کا پھل بھوگ رہا ہوں۔ وہ ابھی تک بچے ہیں۔ بس مجھ میں اور ان میں اتنا ہی فرق ہے۔ وہ ایک گناہ کو چھپانے کے لئے اور بھی صد ہا گناہ کیا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ مجھ سے بڑے ہوسٹے ہیں۔ ایسے لگلا بھگتوں کے سامنے میں حقیر بن کر نہیں رہ سکتا۔ میں ان لوگوں کے سامنے بیٹھتا ہوں۔ جو اس حالت میں بھی میری عزت کرتے ہیں۔ جو اپنے کو مجھ سے بہتر نہیں سمجھتے۔ جو کوٹے ہو کر ہنس کی نقل نہیں کرتے۔ اگر میرے اس برتاؤ سے آپ کی عزت میں بڑھ لگتا ہے۔ تو میں زبردستی آپ کے گھر نہیں رہنا چاہتا۔

اُمانا لفظ۔ پرانا مہرا گواہ ہے۔ کہ میں نے اس خیال سے ان آدمیوں کو تنبیہ نہیں کی تھی۔ آپ کو معلوم ہے۔ کہ مجھے اکثر سرکاری ملازموں اور حاکموں سے سابقہ پڑتا ہے۔ آپ کی اس آزادی سے مجھے ان کے سامنے آنکھیں نیچی کرنی پڑتی ہیں۔

کرشن چندر۔ تو آپ ان حضرات سے کہہ دیجئے۔ کہ کرشن چندر کتنا ہی گیا گزرا ہے۔ پھر بھی ان لوگوں سے اچھا ہے۔ میں بھی کسی سرکاری ملازم تھا۔ اور ملازموں کے طور و طریق کا کچھ تجربہ رکھتا ہوں۔ وہ

سب کے سب شاطر چور ہیں۔ پورے ڈاکو گناہ میں گردن تک
 ڈوبے ہوئے۔ اور ایسے اسفلوں سے ہیں اخلاق کا سبق نہیں
 لینا چاہتا۔

اُمانا تھا۔ آپ کو حکام کی پرداہ نہ ہو۔ لیکن میری تو روزی
 انہیں کے نگاہ کرم پر منحصر ہے۔ میں کیونکر اُن کی مخالفت کر سکتا ہوں۔
 آپ سنے تو تھانہ داری کی ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے۔ کہ یہاں کا
 تھانہ دار آپ کی نگرانی کیا کرتا ہے؟ وہ آپ کو رذیلوں کی صحبت
 میں دیکھے گا۔ تو ضرور اس کی رپورٹ کرے گا۔ اور آپ کے ساتھ میں
 بھی غارت ہو جاؤں گا۔ یہ لوگ کس کے دوست ہوتے ہیں؟
 کرشن چندر۔ یہاں کا تھانہ دار کون ہے؟
 اُمانا تھا۔ سید مسعود عالم۔

کرشن چندر۔ اچھا وہ دغا باز! سارے زمانہ کا بے ایمان!
 چھٹا ہوا مد معاش۔ وہ میرے ماتحت ہیڈ کانسٹیبل رہ چکا ہے۔ اور
 ایک بار میں نے ہی اُسے جیل سے بچایا تھا۔ اب کے اُسے یہاں آنے
 دیجئے۔ ایسی خبر لوں۔ کہ وہ بھی یاد کرے!

اُمانا تھا۔ اگر آپ کو یہ سب طوفان کھڑا کرنا ہے۔ تو براہ کرم مجھے
 اپنے ساتھ نہ سمیٹئے۔ آپ کا تو کچھ نہ بگڑے گا۔ پر میں پس جاؤں گا!

کرشن چندر۔ اسی لئے آپ صاحبِ عزت ہیں۔ اور میرا کہیں
 ٹھکانہ نہیں۔ حیران کیوں مٹھوا لیتے ہو؟ تھانہ داروں کی دلائی

کر کے بھی تمہیں اپنی عزت کا غرہ ہے!

اُمانا تھے۔ میں بے عورت سی۔ مکار سی۔ دغا باز سی۔ دلال سی۔ پر آپ کے ساتھ میں نے جو سلوک کئے ہیں۔ اُن کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی زبان سے ایسی باتیں نہ نکلیں:

کرشن چندر۔ تم نے میرے ساتھ سلوک کئے ہیں۔ یا میرے خاندان کو غارت کر دیا۔ سلوک کا ذکر کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ تمہارے سلوک کی تعریف یہاں خوب سن چکا۔ تم نے میری بیوی کی جان لی۔ میری ایک لڑکی کو نہ جانے کس فاقہ مست قتلانچ کے گلے باندھ دیا۔ اور دوسری لڑکی سے مزدوروں کی طرح کام لے رہے ہو۔ یہ تمہارا سلوک ہے! بیچاری بھولی بھالی عورت کو جھانسنے دے کر مقدمہ کی پیروی کرنے کے بہانہ سے سب روپیہ اڑالے اور تب احمسے اپنے گھڑ لا کر اس کی مٹی خراب کی۔ آج اپنے سلوک کی سنجی بگھارتے ہو!

خود پسند انسان کو دوسروں کی احسان فراموشی سے جتنا صدمہ ہوتا ہے۔ اتنا اور کسی بات سے نہیں ہوتا۔ وہ چاہے اپنی نیکیوں کے لئے احسان کا گرویدہ نہ ہو۔ چاہے اُس نے نیکی کر کے دریا ہی میں ڈال دی ہو۔ پر اپنے حسن عمل کا خیال کر کے اُسے روحانی مسترت ہوتی ہے۔ وہ احسان کا اظہار چاہے نہ پسند کرے پر یہ ضرور چاہتا ہے۔ کہ دل میں اُس کی تحسین کی جائے۔ اُمانا تھے

نے سوچا۔ دنیا کتنی بدگمان ہے۔ میں نے ان کے لئے ہمینوں عدالتوں
 کی خاک چھانی۔ وکیلوں کی کیسی کیسی خوشامدیں کہیں۔ عقاں کے کیسے کیسے
 ناز و خمرے اٹھائے۔ اپنے کتنے نج کے روپے پھونک دئے۔ اُس کا
 یہ صلہ مل رہا ہے۔ تین تین عورتوں کی برسواں پرورش کی ٹمن کی شادی
 کے لئے ہمینوں سرگرداں رہا۔ اور شانتا کی شادی کے لئے ہمینوں
 سے دوا دوش کر رہا ہوں۔ دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھائے پڑ گئے
 روپے پیسے کی فکر میں جسم گھل گیا۔ دانہ پانی چھوٹ گیا۔ اُس کا یہ مثرہ!
 واہ ری اندھی دنیا! یہاں بھلائی کرنے میں بھی داغ لگ جاتا ہے۔ یہ
 سوچ کہ ان کی آنکھیں پریم ہو گئیں۔ بولے "بھائی صاحب! میں نے
 جو کچھ کیا۔ وہ بہتری ہی کے خیالی اور ارادہ سے کیا۔ پر میرے ہاتھوں
 میں جس نہیں ہے۔ البشور کو اگر یہی منظور ہے۔ کہ میرا کیا کرایا سارا
 منی میں مل جائے۔ تو یہی سی۔ میں نے آپ کو لوٹ لیا۔ آپ کی
 ساری دولت ہضم کر لی۔ اب جو سزا چاہئے دیجئے۔ اور کیا کہوں؟
 امانتہ کتنا چاہتے تھے۔ کہ اب تو جو کچھ ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب سے
 میرا گلا چھوڑ دے۔ شانتا کی شادی کا انتظام کیجئے۔ اپنا گھر بار سنبھال لے۔
 پر ڈرے۔ کہ غصہ کی حالت میں یہ سچ نہ شانتا کو لے کر یہاں سے کسی
 طرف نکل نہ جائیں۔ اس لئے غم کھا جانا ہی مصالحت سمجھا۔ غصہ ضعیف
 نیک دلوں میں رحم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کسی گداگر کی گالیاں
 سن کر ایک شریف انسان خاموش رہنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے! نہیں

بلکہ اُسے اُس پر رحم آجاتا ہے :

اماناٹھ کے تحمل نے کرشن چندر کا غصہ بھی فرو کیا۔ پران میں زیادہ بات چیت نہ ہوئی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر خیالات میں ڈوبے بیٹھے تھے۔ جیسے دو کتے لڑنے کے بعد آمنے سامنے بیٹھے رہتے ہیں، اماناٹھ سوچتے تھے۔ بہت اچھا ہوا۔ کہ میں خاموش ہو گیا۔ ورنہ دنیا بھی کو برا کہتی۔ کرشن چندر سوچتے تھے۔ میں نے برا کیا۔ جو یہ گڑے مردے اُکھاڑے، بیجا غصہ اکثر بیداری روح کا باعث ہوتا ہے۔ کرشن چندر کو اب اپنے فرض کا راستہ نظر آنے لگا۔ شام کے وقت انہوں نے اماناٹھ سے پوچھا۔

نشانات کی شادی تو آپ نے کیسے طے کر رکھی ہے نا؟

اماناٹھ۔ جی ہاں چنار میں پنڈت مدن سنگھ کے لڑکے سے؟

کرشن چندر۔ نام سے تو کوئی معزز آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کتنا جہیز

ٹھہرا ہے؟

اماناٹھ۔ ایک ہزار :

کرشن چندر۔ اور غالباً اتنا ہی اور اوپر خرچ ہو گا؟

اماناٹھ۔ ہاں اور کیا :

کرشن چندر نے براۓ سے پوچھا۔ اتنے روپوں کا انتظام کیونکر

ہو گا؟

اماناٹھ۔ ایشور کسی نہ کسی طرح بیڑا پار لگائیں گے۔ ایک ہزار تو

میرے پاس ہے۔ صرف ایک ہزار کی اور فکر ہے :

کرشن چندر نے نہایت ندامت آمیز انکسار سے کہا: "میری حالت
تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔۔۔۔۔"
اتنا کہتے کہتے اُن کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے:
امانا کہنے نے تسکین آمیز لہجہ میں کہا: آپ کچھ اندیشہ نہ کریں۔ میں
سب انتظام کر لوں گا۔"

کرشن چندر۔ پرمانما آپ کو اس نیکی کا اجر خیر دیں گے۔ بھئی۔ آج
میں غصہ میں نہیں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔ اس کا بُرا نہ ماننا۔ میں ابھی اپنے
ہوش و حواس میں نہیں ہوں۔ اس دوزخی زندگی نے مجھے دیوانہ بنا
دیا ہے۔ اس نے میری روح کو کچل ڈالا ہے۔ میرے جذبات مردہ
ہو گئے ہیں۔ اس ظلم میں پڑ کر فرشتہ بھی دیوانہ ہو جائے۔ تو عجب نہیں
مجھ میں یہ طاقت کہاں ہے۔ کہ شادی کا اتنا بھاری بوجھ سنبھال
سکوں۔ تم نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا۔ پر یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔
کہ میں یہ بوجھ تمہاری گردن پر رکھ کر خود کا ہل بنا بیٹھا رہوں۔ مجھے
بھی اجازت دو۔ کہ جا کر کہیں چار پتے کمانے کی فکر کروں۔ میں کل
بنارس جاؤں گا۔ یوں میرے پہلے کے کئی ملاقاتی ہیں۔ پر میں اُن کے
یہاں نہیں ٹھہرنا چاہتا۔ سمن کا گھر کس محلہ میں ہے؟

امانا کہنے کا چہرہ فق ہو گیا۔ بولے: "شادی تک تو آپ یہیں رہئے
اس کے بعد جہاں مرضی ہو چلے جائیے گا۔"
کرشن چندر۔ نہیں مجھے کل جانے دو۔ شادی کے ایک ہفتہ

قبل لوٹ آؤں گا۔ دو چار دن سُن کے یہاں بٹھہر کر کوئی مُلازمت تلاش کر لوں گا۔ کس محلّہ میں رہتی ہے؟
 اُماتا محلّہ مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ ادھر عرصہ سے اُدھر نہیں گیا۔
 شہر والوں کا ٹھکانہ ہی کیا ہے۔ روز مکان بدلتے پھرتے ہیں معلوم نہیں اب کس محلّہ میں ہو؟

رات کو کھانا کھانے کے وقت کرشن چندر نے شانتا سے سُن کا پتہ پوچھا
 شانتا اُماتا محلّہ کا اشارہ نہ سمجھ سکی۔ پورا پتہ بتلا دیا؟

حَدِيث (۴) حَدِيث

شہر کی میونسپل بورڈ میں کل ۱۸ ممبر تھے۔ اُن میں ۸ مسلمان تھے اور ۱۰ ہندو۔ تعلیم یافتہ ممبروں کی تعداد غالب تھی۔ اس لئے پدم سنگھ شرما کو کامل یقین تھا۔ کہ بورڈ میں ارباب نشاط کے اخراج کی تجویز منظور ہو جائے گی، وہ سب ممبروں سے مل چکے تھے۔ اور اس مسئلہ کے متعلق ان کے اعتراضات اور شکوک کا ازالہ کر چکے تھے۔ لیکن ان میں بعض اصحاب ایسے تھے جن کی طرف سے مخالفت کا اندیشہ تھا۔ یہ سب لوگ بہت معزز۔ بارسوخ مساجن اور تاجر تھے، اس لئے شرما جی کو یقین کے ساتھ یہ خوف بھی تھا۔ کہ کہیں تعلیم یافتہ اصحاب بھی اُن کے دباؤ میں نہ آجائیں، ہندوؤں میں مخالف جماعت کے سرغنہ سیٹھ بل بھدر داس تھے۔ اور مسلمانوں میں حاجی ہاشم، جب تک بٹھار داس

کے اہتمام میں یہ تحریک تھی۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی تھی۔ لیکن جب سے پدم سنگھ اور چند دیگر اراکین اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے، تب سے سیٹھ جی اور حاجی صاحب کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا۔ کہ عنقریب یہ تجویز بورڈ میں پیش ہوگی۔ اس لئے دونوں حضرات اس حملہ کی مدافعت کی پیش بندیاں کر رہے تھے۔ پہلے حاجی صاحب نے مسلمان ممبروں کو جمع کیا۔ حاجی صاحب کا عوام پر بہت اثر تھا۔ اور وہ شہر کے مسلمانوں کے سرغنہ سمجھے جاتے تھے۔ باقی سات ممبروں میں مولانا تیغ علی ایک امام باڑہ کے متولی تھے۔ منشی ابوالوفا عطر اور تیل کے ایک کارخانہ کے منتظم تھے۔ بڑے بڑے شہروں میں ان کی کئی دکانیں تھیں۔ منشی عبداللطیف ایک بڑے زمیندار۔ لیکن بیشہ شہر ہی میں رہتے تھے۔ انہیں شعر و سخن کا ذوق تھا۔ اور خود بھی اچھے شاعر تھے۔ شاکر بیگ اور شریف حسن وکالت کرتے تھے۔ ان کے عمدنی خیالات بہت اعلیٰ تھے۔ سید شفقت علی پٹن یافتہ ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اور فاضل صاحب شہرت خاں اطباء میں بہت ممتاز تھے۔ یہ دونوں حضرات گوشہ عافیت کے دلدادہ تھے۔ مگر تنگ خیال نہ تھے۔ دونوں راسخ الاعتقاد آدمی تھے۔ اہل قوم انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حاجی ہاشم نے فرمایا۔ ”برادران وطن کی یہ نئی چال آپ لوگوں نے ملاحظہ کی؟ واللہ ان کو سوجھتی خوب ہے۔ بغلی گھوڑے مارنا کوئی

ان سے سیکھ لے۔ میں تو ان کی ریشہ دوانیوں سے اتنا بدظن ہو گیا ہوں
کہ اگر ان کی نیک نیتی پر ایمان لانے سے نجات بھی ہوتی ہو۔ تو نہ
لاؤں۔“

منشی ابوالوفا بولے: ”مگر اب خدا کے فضل سے ہمیں بھی اپنے
نفع نقصان کا احساس ہونے لگا ہے۔ یہ ہماری مجموعی تعداد کو گھٹانے
کی صریح کوشش ہے۔ طوائفیں تو بے فی صدی مسلمان ہیں۔ جو
روزے رکھتی ہیں۔ عزا داری کرتی ہیں۔ مولود اور عرس کرتی ہیں ہم کو
اُن کے ذاتی فغلوں سے کوئی بحث نہیں ہے۔ نیک و بد کی سزا و
جزا دینا خدا کا کام ہے۔ ہم کو تو صرف ان کی تعداد سے غرض ہے۔
نتیجہ علی۔ مگر ان کی تعداد کیا اتنی زیادہ ہے۔ کہ اس سے ہماری
مجموعی ووٹ پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے؟

ابوالوفا۔ کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور ہی پڑے گا۔ خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔
برادران وطن کو دیکھئے۔ وہ ڈومول کو بھی اپنی قوم میں ملانے پر آمادہ
ہیں۔ اُن کے سایہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ انہیں جانوروں سے زیادہ
حقیر سمجھتے ہیں۔ مگر محض اپنے پولیٹیکل مفاد کے لئے انہیں اپنے
قومی جسم کا ایک عضو بنائے ہوئے ہیں۔ ڈومول کا شمار جرائم پیشہ
فرقوں میں ہے۔ علی ہذا پاسی، برہ وغیرہ بھی اسی ذیل میں آتے
ہیں۔ سرقت۔ قتل۔ رہزنی۔ یہ اُن کے پیشے ہیں۔ مگر جب انہیں ہندو
جماعت سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تو ہمارے اہل وطن

کیسے چراغ پا ہوتے ہیں۔ وید اور شاستر سے سندیں پیش کرتے پھرتے ہیں۔
ہم کو اس معاملہ میں انہیں سے سبق لینا چاہئے۔

سید شفقت علی نے متانت سے فرمایا۔ ان جرائم پیشہ اقوام کے
لئے گورنمنٹ نے شہروں میں خطے علیحدہ کر دئے ہیں۔ ان پر پولیس
کی نگرانی ہوتی ہے۔ میں خود اپنے دوران ملازمت میں ان کی
نقل و حرکت کی رپورٹ لکھا کرتا تھا۔ مگر میرے خیال میں کسی ذمہ دار
ہندو نے گورنمنٹ کے اس طرز عمل کی مخالفت نہیں کی۔ حالانکہ
میری نگاہ میں سرقہ یا قتل اتنے مکروہ افعال نہیں ہیں۔ جتنی عصمت
فروشی، ڈومنی بھی جب درجہ عصمت سے گر جاتی ہے۔ تو وہ اپنی
اپنی برادری سے خارج کر دی جاتی ہے۔ اگر کسی ڈوم کے پاس کافی
دولت ہو۔ تو وہ اس حُسن کے بازار میں من مانا سودا خرید سکتا ہے۔
خدا وہ دن نہ لائے۔ کہ ہم اپنے پولیٹیکل مفاد کے لئے اس حد تک ذلیل
بننے پر مجبور ہوں۔ اگر ان طوائفوں کی دینداری کے طفیل میں خدا
سارے اسلام کو جنت عطا کرے۔ تو میں دوزخ میں جانا پسند
کروں گا۔ اگر ان کی تعداد کی بنا پر ہم کو اس ملک کی بادشاہی بھی ملتی
ہو۔ تو میں قبول نہ کروں۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے۔ کہ انہیں مرکز
شہری سے نہیں۔ حدود شہر سے خارج کر دینا چاہئے۔

حکیم شہرت خاں۔ جناب میرے امکان میں ہو۔ تو میں انہیں
ہندوستان سے نکال دوں۔ ان سے ایک جزیرہ الگ آباد کروں۔

مجھے اس بازار کے خریداروں سے اکثر سالبقہ رہتا ہے۔ اگر میرے مذہبی عقاید میں فرق نہ آئے۔ تو میں یہ کہوں گا۔ کہ طوائفیں بیٹھے اور طاغون کا اوتار ہیں۔ ہیضہ دو گھنٹوں میں کام تمام کر دیتا ہے۔ پلیگ دو دن میں۔ لیکن یہ ہنسی ہستیاں دلا دلا کر اور گھلا گھلا کر مارتی ہیں۔ منشی ابوالوفا صاحب انہیں جنت کی حوریں سمجھتے ہوں۔ لیکن فی الواقع یہ وہ گالی ناگنیں ہیں۔ جن کی آنکھوں میں زہر ہے۔ یہ وہ چشے ہیں۔ جن سے جرائم کے دریا لگتے ہیں۔ کتنی ہی نیک بیویاں انکی بدولت زندہ درگور ہیں۔ کتنے ہی شریف زادے ان کی بدولت خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ کہ بیشتر طوائفیں اپنے تئیں مسلمان کہتی ہیں۔

شریف حسن نے فرمایا۔ اس میں تو کوئی برائی نہیں ہے۔ کہ وہ اپنے کو مسلمان کہتی ہیں۔ بڑائی یہ ہے۔ کہ اسلام بھی انہیں راہ راست پر لانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ چند وڑوں کی دیکھا دیکھی اسلام نے بھی انہیں اپنے دائرہ عمل سے خارج کر دیا ہے۔ بے شک ہمارے مولانا صاحب مہر عامہ باندھے۔ آنکھوں میں گہرا سرمہ لگائے۔ کیسو سنوارے۔ ان کی مذہبی تلقین و تسلیم کے لئے مایہ نچھے ہیں۔ ان کے دسترخوان سے میٹھے لقمے کھاتے ہیں۔ خوشبودار خیرے کے گش لگاتے ہیں۔ اور ان کے خاقدان سے معصوم پڑے اڑاتے ہیں۔ اسلام کی مذہبی قوت اصلاح میں ختم ہو جاتی ہے۔ اپنے

بُڑے فعلوں پر نادم ہونا انسانی خاصہ ہے، یہ گمراہ عورتیں پیشتر نہیں۔
 تو شراب کا نشہ اُترنے پر ضرور اپنی حالت پر افسوس کرتی ہیں۔ لیکن
 اس وقت اُن کا پچھتانا بے سود ہوتا ہے۔ اُن کے گزرا ان کی اس
 کے سوا اور کوئی صورت نہیں رہتی۔ کہ ان لڑکیوں کی جائز طور
 پر شادی ہو سکے۔ اور اس کے ساتھ ہی اُن کی پرورش کی بھی صورت
 نکل آئے۔ تو میرے خیال میں زیادہ نہیں تو ۷۵ء فی صدی طوائفیں
 ضرور اسے خوشی سے قبول کر لیں، ہم چاہے خود کیسے ہی سیاہ کار ہوں۔
 پر اپنی اولاد کو نیک اور راستباز دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں، طوائفوں
 کو شہر سے خارج کر دینے سے ان کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس نقطہ
 خیال سے تو میں اخراج کی تحریک پر اعتراض کرنے کی جرأت کر سکتا
 ہوں۔ پر پولیٹیکل مفاد کی بنا پر میں اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔
 میں کسی فعل کو قومی خیال سے پسندیدہ نہیں سمجھتا۔ تا وقتیکہ وہ اخلاقاً
 بھی پسندیدہ نہ ہو۔

نتیجہ عملی۔ بندہ نواز سنبھل کر باتیں کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ
 کے اوپر کھڑکافتوی صادر ہو جائے، یہ پولیٹیکل مفاد کا دور ہے۔ حق اور
 انصاف کا نام نہ لیجئے۔ اگر آپ مدرس ہیں۔ تو ہندو لڑکوں کو فیل
 کیجئے۔ تمھیں رار ہیں۔ تو ہندوؤں پر بیجا ٹیکس لگائیے۔ جو سٹریٹ
 ہیں۔ تو ہندوؤں کو سخت سزائیں دیجئے۔ سب ان پکڑ پو دیں ہیں۔
 تو ہندوؤں پر جھوٹے مقدمے دائر کیجئے۔ تحقیقات کرنے جائیے۔ تو

ہندوؤں کے بیانات غلط لکھئے۔ اگر آپ چور ہیں۔ تو کسی ہندو کے گھر
ڈاکہ ڈالئے۔ اگر آپ کو حسن و عشق کا ذوق ہے۔ تو کسی ہندو نازنین
پر ڈورے ڈالئے۔ تب آپ قوم کے خادم۔ قوم کے محسن۔ قومی کشتی
کے ناخدا سب کچھ ہیں۔

حاجی ہاشم تلملا گئے۔ منشی ابوالوفا کے تیوروں پر بل پڑ گئے۔
تیغ علی کی تیغ آبدار نے انہیں گھائل کر دیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتے
تھے۔ کہ شا کر بیگ بول اٹھے: ”بھائی صاحب۔ یہ طعن و طنز کا موقع
نہیں ہے۔ یہ ہمارا باہمی مشورہ ہے۔ کوئی مناظرہ کی مجلس نہیں
زبان تیز مصالحت کے حق میں ذہر قاتل ہے۔ میں شاید ان طنز
کو نظام تمدن میں بالکل بیکار یا مایہ نثر نہیں سمجھتا۔ جب آپ
کوئی مکان تعمیر کراتے ہیں۔ تو اس میں بدر رو کا بنانا ضروری سمجھتے
ہیں۔ اگر بدر رو نہ ہو۔ تو چند سالوں میں دیواروں کی بنیادیں ہل
جائیں۔ اس فرقہ کو سوسائٹی کا بدر رو سمجھنا چاہئے۔ اور جس طرح
بدر رو مکان کے نمایاں حصے میں نہیں ہوتی۔ بلکہ لگاؤ سے پوشیدہ
ایک گوشہ میں بنائی جاتی ہے۔ اُسی طرح اس فرقہ کو بھی شہر کے پُر فضا
مقامات سے ہٹا کر کسی گوشہ میں آباد کرنا چاہئے۔“

منشی ابوالوفا اس تقریر کا پہلا حصہ سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔
پر بدر رو کی تشبیہ پر ان کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ حاجی ہاشم نے عبداللطیف
کی طرف مایوسانہ انداز سے دیکھ کر کہا: ”جناب کچھ آپ بھی فرماتے ہیں۔“

چلی۔ اس کی تفصیل لکھنا نصیحتِ اوقاف ہے جیسی اور برائیاں ہوتی ہیں۔ ویسی ہی یہ بھی
تھی۔ وحشیانہ تکلف اور درد انگیز ریشمال حالی کا عجیب اجتماع۔ پالکیوں
پر زلفت کی جھولیں پڑی ہوئی۔ لیکن کساروں کی وردیاں بوسیدہ اور
کرم خوردہ۔ گنگا جمینی کے عصا۔ اور بلم نیم برہنہ مزدوروں کے ہاتھ میں۔
امولایاں سے کوئی دس کوس تھا۔ راستہ میں ایک ندی پڑنی تھی۔
بارات کشتیوں پر اتری۔ ملاحوں سے مزدوری کے لئے کھنٹوں سر مغزن
ہوا۔ تب کہیں جا کر انہوں نے ناویں کھولیں۔ بدن سنگھ نے بگڑ کر کہا
”نہ ہوئے تم لوگ ہمارے گاؤں میں نہیں تو اتنی بیگار لیتا۔ کہ یاد کرتے“
لیکن پدم سنگھ ملاحوں کی اس جرات پر خوش تھے۔ انہیں اس میں ملاحوں کی
حریت پسندی کی ہمدردی دکھائی دیتی تھی۔

شام کے وقت برات امولاپہنچی۔ پدم سنگھ کے محرر صاحب نے پہلے
ہی سے شامیانہ نصب کر رکھا تھا کئی چھو لاریاں بھی لگی ہوئی تھیں چھو لاریوں
کے سامنے گیس کی لالینیں تھیں۔ شامیانہ شیشہ و آلات سے آراستہ
تھا۔ کارچونی مسند۔ گاؤں تکئے۔ خا صدا ان۔ گلاب پاش وغیرہ سب موقع
سے رکھے ہوئے تھے۔ دھوم تھی۔ کہ ناچ کے کئی ڈیرے آرہے ہیں۔
دوار پو جا ہوئی۔ اماناتہ کنندہ سے پر ایک انگو چھا ڈالے براتیوں کا
غیر مقدم کر رہے تھے۔ گاؤں کی عورتیں سائباں میں کھڑی سنگھ چرن
گاتی کھتیں۔ براتیوں کی نظر انتخاب بہترین شبن کی تلاش میں سرگرم تھیں۔
ادھر سے بھی آنکھوں کی کٹاریں براتیوں کا سہرا ڈکٹے دیتی تھیں۔ مہمانوں

اُداس تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کہ یہ دُلہا میری چندرا کو ملتا۔ تو اچھا ہوتا بھیجائی
 یہ جانتے کے لئے بے قرار تھی۔ کہ سمدھی کون ہے۔ کرشن چندر سدن سنگھ کے
 پیر دھور ہے تھے۔ اور داس میں کہہ رہے تھے۔ یہ کیسا بیہودہ رواج ہے۔
 سدن سنگھ دھیان سے دیکھ رہے تھے۔ کہ مقال میں کتنے روپے ہیں۔
 برات جنوا سے چلی۔ رسد سامان تقسیم ہونے لگا۔ وہ ہڑ بونگ مچا۔ کہ
 الامان! ایک طرف سے اڈر کے لئے اصرار۔ دوسری طرف صاف انکار۔
 کوئی کتنا تھا۔ مجھے کھی کم ملا۔ کوئی فریاد کرتا تھا۔ مجھے اُپلے نہیں ملے لالہ
 بیچنا تھا شراب کے لئے پُر بند تھے برات سے روٹے جاتے تھے۔ کئی آدمی
 انہیں مشار ہے تھے۔

سامان تقسیم ہو گیا۔ تو لوگوں نے اُپلے جلائے۔ اور ہاڈیاں چڑھائیں
 دھوئیں سے آسمان سیاہ ہو گیا۔ گیس کی روشنی زرد پر لگی۔
 سدن مسد بگا کر بیٹھا۔ محض آراستہ ہوئی۔ عطر و پان سے تواضع ہونے
 لگی۔ سانگیت و ڈیال کے کٹافنوں نے منبوسے سنبھائے شام کلیان
 کی دلاویز دھن گونجنے لگی۔ ہزاروں آدمی شامیانے کے چاروں طرف
 جمع تھے۔ کچھ لوگ مرزا عیاں پہنے۔ پگڑیاں باندھے ہاتھ میں تمباکو اور
 چھالے کا بٹوا لئے فریش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے
 پوچھتے تھے۔ ڈیرے کہاں ہیں۔ کوئی اس چھو لدا ری میں جھانکتا تھا۔
 کوئی اُس چھو لدا ری میں اور حیرت سے کتا تھا۔ کیسی بارات ہے۔ کہ ایک
 ڈیرا بھی نہیں۔ کہاں کے کنگھے ہیں۔ یہ بڑا شامیانہ کاتب کو کھینچ کر رکھا

ہے۔ شام کلیان کی دھن انہیں بے مزہ معلوم ہوتی تھی + وہ نغمے کے
نہیں۔ دیدار کے رسیا تھے۔ ناز و ادا کے بھوکے + مدن سنگھ یہ باتیں سن
سن کر دل میں پدم سنگھ پر کڑ بڑا رہے تھے۔ اور پدم سنگھ شرم اور خوف کے
ماہے ان کے روبرو آتے ہوئے ڈرتے تھے +

اتنے میں لوگوں نے شامیائے پر پتھر پھینکنے شروع کئے۔ لالہ سچیناٹھ
اُٹھ کر چھو لداری میں بھاگے۔ کچھ لوگ ان مفسدوں کو گالیاں دینے
لگے۔ ایک بچہ سچ گئی۔ کوئی ادھر بھاگا۔ کوئی ادھر۔ کوئی گالی بکتا تھا۔
کوئی مار پیٹ پر آمادہ تھا + دفعۃً ایک تناور قوی پہل سادھو سر منڈائے بھسم
لگائے ہاتھ میں ایک ترسول لئے آ کر شامیائے میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی لال لال آنکھیں
چراغ کی طرح جل رہی تھیں چہرہ سے رعب و جلال برستا تھا + محفل پر نا اچھا گیا سب
لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سادھو کو دیکھنے لگے۔ یہ کون ہے؟ کہاں سے آ گیا؟
سادھو نے ترسول جھنکار کر ملامت آمیز انداز سے کہا۔

ہائے افسوس! یہاں کوئی ناچ نہیں۔ کوئی رنڈی نہیں! سب
باوا لوگ! اس جیٹھے میں شام کلیان کی دھن کیسی منوہر ہے پر کوئی
نہیں سنتا! کسی کے کان نہیں۔ سب راج دیکھنا چاہتے ہیں۔ یا تو انہیں
ناچ دکھاؤ۔ یا اپنے سر پر ڈاؤ، چلو میں ناچ دکھاؤں۔ دیوتاؤں کا ناچ
دیکھنا چاہتے ہو؟ دیکھو سامنے درخت کی پتیوں پر نرل چاند کی کرنیں
کیسی ناچ رہی ہیں؟ دیکھو تالاب میں گل کے پھول پر پانی کی بوندیں کیسی
ناچتی ہیں۔ جنگل میں جا کر دیکھو۔ مور پر پھیلے کیسی ناچ رہا ہے۔ کیا یہ

دیوتاؤں کا ناچ پسند نہیں ہے؛ اچھا چلو بھوتوں کا ناچ دکھاؤں تمہارا
 پڑوسی غریب کسان زمیندار کے جوتے کھا کر کیسا ناچ رہا ہے تمہارے
 بھائیوں کے یتیم بچے بھوک سے بادلے ہو کر کیسے ناچ رہے ہیں۔ اپنے
 گھر میں دیکھو۔ تمہاری بیوہ بھادج کی آنکھوں میں درد اور غم کے آنسو
 کیسے ناچتے ہیں۔ یہ ناچ بھی پسند نہیں ہے تو اپنے من میں دیکھو کیپٹ اور
 پھل کیسا ناچ رہا ہے۔ ند اور موہ کیسا ٹھکر رہا ہے۔ سارا رنگ بھوم
 ہے۔ اُس میں سب اپنا اپنا ناچ ناچ رہے ہیں۔ کیا یہ دیکھنے کے لئے
 تمہاری آنکھیں نہیں ہیں؟ آہ الگیاں کے مور تو۔ شہوت کے غلامو!
 تمہیں ناچ کا نام لیتے لاج نہیں آتی۔ اپنی بھلائی چاہتے ہو۔ تو اس
 ریت کو مٹاؤ۔ نفس پرستی چھوڑو۔ اس گندی کچرے سے نکلو!
 ساری محفل پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لوگ صورت تصویر بنے ہوئے
 سادھو کی محذوبانہ تقریریں رہے تھے۔ کہ دفعۃً وہ غائب ہو گئے۔ اور
 سامنے والے آم کے درختوں کی آڑ سے اُن کے نعمۂ شیریں کی صدا سنائی
 دینے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ بھی اُسی تاریکی میں محو ہو گئی۔ جیسے رات کو کشتی نگر
 بحر خواب میں ڈوب جاتی ہے۔ جیسے جوار یوں کا جتنا پولیس کے کسی افسر
 کو دیکھ کر بدحواس ہو جاتا ہے۔ کوئی روپے پیسے سمیٹنے لگتا ہے۔ کوئی کوڑیوں
 کو چھپانے لگتا ہے۔ اسی طرح سادھو کے اتفاقی طور پر اُن کی پُر جلال
 صورت اور ان کی محذوبانہ تقریر نے لوگوں کے دلوں کو ایک نامعلوم خوف
 سے پُر کر دیا۔ مفسدوں نے چپکے سے گھر کی راہ لی۔ اور جو لوگ محفل میں

بیٹھے بیٹھے پچھتا رہے تھے۔ کہ ناحق آئے۔ وہ بھی گانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کچھ خوش اعتقاد لوگ ان کی تلاش میں دوڑے۔ پران کا کہیں پتہ نہ تھا۔

باب بیست و نہ (۱۰)

پینڈت مدن سنگھ اپنی چھو لدا ری میں بیٹھے ہوئے آمدنی اور خرچ کا حساب لکھ رہے تھے۔ کہ منشی بیچنا تھہ دوڑے ہوئے آئے۔ اور بولے ”بھائی صاحب بڑا ظلم ہوا۔ آپ نے یہاں ناحق شادی کی ہے“ مدن سنگھ نے متعجب ہو کر پوچھا۔ کیوں کیا بات ہے؟ کچھ گڑبڑ ہے؟

بیچنا تھہ۔ ہاں ابھی اسی گھاؤں کا ایک آدمی مجھ سے ملا تھا۔ اس نے ان لوگوں کی ایسی قلعی کھولی۔ کہ میرے ہوش اڑ گئے۔ مدن سنگھ۔ کیا یہ لوگ بیٹھے خاندان کے ہیں؟ بیچنا تھہ۔ بیٹھے خاندان کے تو نہیں۔ لیکن معاملہ گڑبڑ ہے۔ لڑکی کا باپ حال ہی میں جیلخانہ سے چھوٹ کر آیا ہے۔ اور لڑکی کی بہن گھر سے نکل گئی ہے۔ دال منڈی میں جو سمن بائی ہے۔ وہ اسی لڑکی کی سگی بہن ہے؟

مدن سنگھ کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ کسی درخت سے پھسل پڑے۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے ”وہ آدمی ان لوگوں کا کوئی دشمن تو نہیں ہے۔“

رخنہ ڈالنے کے لئے لوگ اکثر ایسے فتنے کھڑے کر دیا کرتے ہیں۔
 پدم سنگھ نے کہا۔ ہاں کچھ ایسی ہی بات معلوم ہوتی ہے۔
 بیچنا تھ جی نہیں وہ تو کتنا تھا۔ میں ان لوگوں کے منہ پر کہہ
 دوں گا۔

مدن سنگھ۔ تو کیا لڑکی امانا تھ کی نہیں ہے؟
 بیچنا تھ۔ نہیں وہ ان کی بھانجی ہے۔ وہ جو ایک بار تھانہ دار پر
 مقدمے چلنے کی خبر مشہور ہوئی تھی۔ وہی تھانہ دار امانا تھ کے بہنوئی تھے
 کئی مہینوں سے چھوٹ کر آئے ہیں۔
 مدن سنگھ نے سر پکڑ کر کہا۔ ہائے ایسا اتم نے کہاں لاکے
 پھنسا یا؟

پدم سنگھ۔ امانا تھ کو بلانا چاہئے۔
 اتنے میں امانا تھ خود ایک نائی کے ساتھ آتے ہوئے نظر آئے۔
 سو کے لئے زیورات اور کپڑوں کی ضرورت تھی۔ جونہی وہ چھو لداری
 کے دروازہ پر پہنچے۔ کہ مدن سنگھ تیزی سے چھپٹے۔ اور ان کے دونوں
 ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولے۔ کیوں جی تینک دھاری ہمارا ج!
 تمہیں دنیا میں کوئی اور نہ ملتا تھا۔ کہ تم نے اپنے منہ کی کالکھ میرے
 منہ لگائی؟

بتی کے پنجے میں پھنسنے ہوئے چوہے کی طرح بیکسانہ انداز سے تانکتے
 ہوئے۔ امانا تھ نے جواب دیا۔ ہمارا ج مجھ سے ایسی کون سی خطا ہوئی ہے؟

مدن سنگھ تم نے وہ کام کیا ہے۔ کہ اگر تمہارا گلا کاٹ لوں تو عین
ثواب ہو جس لڑکی کی بہن آوارہ ہو جائے۔ اُس کے لئے تمہیں میرا
ہی گھڑنا کنا تھا؟

اُمانا تھئے دبی زبان سے کہا: "ہمارا ج! دوست دشمن کس کے
نہیں ہوتے۔ اگر کسی نے مجھ پر کوئی تہمت لگائی ہو۔ تو آپ کو اس پر
یقین نہ کرنا چاہئے۔ اس آدمی کو بلوایئے۔ جو کچھ کہنا ہو۔ میرے منہ
پر کہئے؟"

پدم سنگھ۔ ہاں بہت ممکن ہے۔ کہ یہی بات ہو۔ اس آدمی کو بلوانا
چاہئے؟

مدن سنگھ نے بھائی کی طرف تیز لگا ہواں سے دیکھ کر کہا: "تم
کیوں بیچ میں بولتے ہو جی؟ (اُمانا تھئے سے) ممکن ہے۔ تمہارے کسی دشمن
نے ہی کہی ہو۔ لیکن یہ بات سچی ہے یا نہیں؟"
اُمانا تھئے۔ کون بات؟

پدم سنگھ۔ یہی کہ سن اس لڑکی کی سگی بہن ہے؟
اُمانا تھئے کا چہرہ زرد ہو گیا۔ شرم سے سر جھٹک گیا۔ آنکھوں کے
سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بولے "ہمارا ج۔۔۔۔۔"

مدن سنگھ نے گرج کر کہا۔ "صاف کیوں نہیں کہتے۔ یہ بات سچ
ہے یا جھوٹ؟"

اُمانا تھئے نے پھر جواب دینا چاہا۔ لیکن "ہمارا ج" کے سوا اور زبان

سے کچھ نہ نکلا

مدن سنگھ کو اب کوئی شبہ نہ رہا غصہ کی آگ دہک اٹھی۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے جسم کا پنے لگا۔ اماناتہ کی طرف آتشیں لگا ہوں سے دیکھ کر بولے: اب اپنی خیریت چاہتے ہو۔ تو میری نگاہوں سے دور ہو جاؤ۔ مکار۔ دغا باز۔ بے ایمان کہیں کا تیلک لگا کے پنڈت بنا پھرتا ہے۔ اب تیرے دروازے پر پانی نہ پیوں گا۔ اپنی لڑکی کو جنتر بنا کے گلے میں پسینہ

یہ کہہ کر مدن سنگھ جھلا اٹھے۔ اور اس چھوٹے بی بی میں چلے گئے جہاں سدن پڑا سو رہا تھا۔ اور زور سے چلا کر کساروں کو پکارا: ان کے جانے کے بعد اماناتہ نے پدم سنگھ سے کہا: دو کہیں صاحب! کسی طرح پنڈت جی کو منائے۔ میں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں گا۔ سمن کا حال تو آپ نے سنا ہی ہو گا۔ اُس ابھاگنی نے ہمارے منہ میں کا لکھ لگا دی۔ ایشور کی مرضی تھی۔ پر اب کڑے مردے اٹھاڑنے سے کیا فائدہ۔ آپ ہی انصاف کیجئے۔ میں اس معاملے کو چھپانے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا؟ اس لڑکی کی شادی تو کرنی ہی تھی۔ بلا چھپائے کیونکر کام چلتا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ مجھے یہ بات آپ کے یہاں شادی طے ہو جانے کے بعد معلوم ہوئی ہے۔

پدم سنگھ نے متفکرانہ انداز سے جواب دیا: بھائی صاحب! کمالوں میں بات نہ پڑی ہوتی۔ تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ دیکھئے میں اُن

کے پاس جاتا ہوں۔ پر اُن کا راضی ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے؟
 دن سنگھ کما۔ روں سے چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔ کہ جلد یہاں سے
 چلنے کی تیاری کرو۔ سدن بھی اپنے کپڑے سمیٹ رہا تھا۔ سدن سنگھ نے اُس
 سے ساری حقیقت بیان کر دی تھی۔ اتنے میں پدم سنگھ نے آکر دعا عطا نہ انداز
 سے کہا۔ ”بھئی اتنی عجلت نہ کیجئے۔ ذرا سوچ سمجھ کر کام کیجئے۔ دھوکا تو ہو ہی
 گیا۔ پر یوں واپس جانے سے تو اور بھی جگ ہنسائی ہوگی؟“

سدن نے چچا کی طرف نگاہ ملامت سے دیکھا۔ اور سدن سنگھ نے
 استعجاب سے پدم سنگھ نے پھر کہا۔ ”دو چار آدمیوں سے پوچھئے۔ اُن کی
 صلاح لیجئے۔ دیکھئے اُن کی کیا رائے ہے؟“

سدن سنگھ۔ کیا کہتے ہو۔ کیا جان بوجھ کر مکھی نکل جاؤں؟
 پدم سنگھ۔ اس میں کم سے کم جگ ہنسائی تو نہ ہوگی؟
 سدن سنگھ۔ تم ابھی لڑکے ہو۔ یہ باتیں کیا جانو۔ جاؤ واپسی کا سامان
 کرو۔ اس وقت کی جگ ہنسائی اچھی ہے۔ خاندان میں تو داغ نہ لگے گا؟
 پدم سنگھ۔ لیکن یہ تو خیال کیجئے۔ کہ اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا! اس
 بیچاری نے کیا خطائی ہے؟

سدن سنگھ نے جھڑک کر کہا۔ ”تم تو ہو بڑے احمق۔ چل کر ڈیرے لداؤ۔
 کل کو کوئی بات پڑ جائے گی۔ تو تمہیں طعنے دو گے۔ کہ روپوں پر پھسل پڑے
 ان معاملات میں وکالت کام نہیں دیتی؟“

پدم سنگھ نے خفت آمیز لہجہ میں کہا۔ ”مجھے آپ سے ارشاد کی تعمیل میں

مطلق عذر نہیں ہے۔ لیکن افسوس یہی ہے۔ کہ اس لڑکی کا کیا حال ہو گا بچاری
کی زندگی خراب ہو جائے گی؟

مدن سنگھ تم خواہ مخواہ غصہ دلاتے ہو۔ لڑکی کامیں سے نکلے لیا
ہے۔ جو کچھ اس کی تقدیر میں ہے ہو گا۔ مجھ سے مطالب؟

پدم سنگھ نے مایوسانہ انداز سے کہا: سمن بانی کی تو یہاں مطلقاً مدد
نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اُسے ترک کر دیا ہے؟

مدن سنگھ میں نے تم سے کہہ دیا۔ کہ مجھے غصہ نہ دلاؤ تمہیں ایسی
باتیں زبان سے نکالتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ بڑے رفاہی دُشمن بنے ہو۔
ایک ہرجائی کی بن سے اپنے بیٹے کا بیاہ کر لوں؟ چھی چھی! تمہاری عقل پر
پردہ پڑ گیا ہے کیا؟

پدم سنگھ نے خفیف ہو کر سر جھکا لیا۔ ان کا دل کہہ رہا تھا۔ کہ بھائی
صاحب اس وقت جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ وہی شاید ایسی حالت میں ہیں بھی
کرتا۔ لیکن نتائج کا خیال کر کے انہوں نے ایک بار پھر اِدُلنے کی جرأت کی۔
جس طرح کوئی طالب علم نتیجہ کے گزرتے میں اپنا نام نہ پا کر مایوس ہوتے ہوئے
بھی غلط نام کی طرف لپکتا ہے۔ اسی طرح پدم سنگھ دھوکا دے کر بھائی
سے دبی زبان سے بولے: سمن بانی بھی تو اب بدھو! آ شرم میں داخل ہو
گئی ہے؟

پدم سنگھ سر نیچا کئے باتیں کر رہے تھے۔ بھائی سے آنکھیں ملانے کا
حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ یہ الفاظ منہ سے نکلتے ہی تھے۔ کہ دفعۃً مدن سنگھ نے

انہیں اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ چونک کر سر اٹھایا۔
 من سنگھ کھڑے غصہ سے کانپ رہے تھے۔ نفرت اور ملامت کے وہ سخت
 الفاظ جو ان کے منہ سے نکلنے والے تھے۔ پدم سنگھ کو زمین پر گرتے دیکھ کر
 ندامت اور تاسف سے دب گئے۔ ان کی اس وقت وہی حالت تھی جب
 انسان غصہ میں اپنا ہی گوشت کاٹنے لگتا ہے۔

یہ آج زندگی میں پہلا موقع تھا کہ پدم سنگھ نے بھائی کے ہاتھوں یہ
 ذلت اٹھائی۔ سارا لڑکپن گزر گیا۔ بڑی بڑی شرارتیں کیں۔ مگر بھائی نے کبھی
 ہاتھ نہ اٹھایا۔ کبھی تیز لگا ہوں سے نہ دیکھا۔ سخت صدمہ ہوا۔ بچوں کی
 طرح سسکتے تھے۔ ہچکیاں لیتے تھے۔ آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگی ہوئی
 تھی۔ مگر دل میں غصہ کا شائبہ بھی نہ تھا۔ صرف یہ خیال دل کو مسوس رہا
 تھا کہ جس نے ہمیشہ پیار کیا۔ کبھی کوئی سخت بات نہیں کی۔ اُسے آج
 میری ضد سے اتنا ملال ہوا۔ یہ مار نہیں ہے۔ یہ مایوسی اور غرور شکستہ
 اور حسرت شرم کا عملی ثبوت ہے! یہ دل پریم کا نالہ درد ہے۔ یہ سوزِ نہاں کا شعلہ
 ہے۔ یہ مقیاسِ الحرات ہے۔ تپ دروں کا۔ سدن نے جلدی سے پدم سنگھ
 کو اٹھایا۔ اور اپنے باپ کی طرف غضبناک نظروں سے دیکھ کر بولا: آپ تو
 جیسے باولے ہو گئے ہیں۔

اتنے میں کئی آدمی آگئے۔ اور پوچھنے لگے۔ ہمارا ج کیا بات ہوئی؟
 بارات کو لوٹنے کا حکم کیوں دیتے ہیں؟ ایسا کچھ کیجئے۔ کہ دونوں طرف کی
 آبرو قائم رہے۔ اب ان کی اور آپ کی عزت ایک ہے۔ لین دین میں اگر کچھ

کمی بیشی ہو۔ تو آپ ہی دب جائیے۔ نارائن نے آپ کو کیا نہیں دیا ہے؟
ان کی دولت سے آپ کے پاس تھوڑے ہی دولت ہو جائے گی۔ مدن نے
کسی کو کچھ جواب نہ دیا۔

محفل میں کھلبلی پڑ گئی۔ ایک دوسرے سے پوچھتا تھا۔ کیا ماجرا ہے؟
چھو لداری کے سامنے آدمیوں کا ہجوم بڑھتا جانا تھا۔

محفل میں لڑکی کی طرف کے کتنے ہی آدمی تھے۔ وہ امانا تھ سے
پوچھنے لگے۔ ”بھئی یہ لوگ بارات لوٹتے پر کیوں آمادہ ہیں؟“ جب امانا تھ
نے کوئی قابل اطمینان جواب نہ دیا۔ تو وہ سب آکر مدن سنگھ سے منتیں
کرنے لگے۔ ہم لوگوں سے کیا خطا ہوئی ہے۔ اور جو سزا چاہے دیجئے۔ پریارات
نہ لوٹائے نہیں تو سارا گاؤں بدنام ہو جائے گا۔ مدن سنگھ نے ان سے
صرف اتنا کہا۔ ”اس کا سبب جا کر امانا تھ سے پوچھو۔ وہی بتائیں گے؟“
پنڈت کرشن چند نے جب سے مدن کو دیکھا تھا۔ خوشی سے پھولے
نہ سماتے تھے۔ بھانوروں کی ساعت قریب تھی۔ وہ برکے آٹے کا انتظار
کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں کئی آدمیوں نے آکر انہیں یہ کیفیت سُنائی۔
انہوں نے پوچھا۔ کیوں لوٹے جاتے ہیں۔ کیا امانا تھ سے کوئی حُجّت
ہو گئی ہے۔

لوگوں نے کہا۔ ”ہمیں نہیں معلوم۔ امانا تھ تو کھڑے منار ہے ہیں؟“
کرشن چند جھلائے ہوئے بارات کی طرف چلے۔ بارات کا لوٹانا
لوگوں کا کھیل ہے؟ یہ کوئی گڑبگڑ ہے؟ کیا؟ اگر شادی نہیں

کرنی تھی۔ تو بارات کیوں لائے تھے؟ دیکھتا ہوں بارات کیسے لوٹتی ہے؟ خون کی ندیاں بہا دوں گا۔ یہی نہ ہو گا۔ کہ پھانسی ہو جائے گی۔ پر انہیں اس کا مزہ چکھا دوں گا۔ کرشن چندرا نے ساتھیوں سے یہی باتیں کرتے قدم بڑھاتے ہوئے جنوا سے میں پہنچے! اور لکار کر بولے۔ کہاں ہیں پنڈت مدن سنگھ! ہمارا ج ذرا باہر آئیے؟
مدن سنگھ یہ للکار سن کر باہر نکل آئے۔ اور تند لہجہ میں بولے: "کہئے کیا کہتے ہیں؟"

کرشن چندر۔ آپ بارات کیوں نوٹالے جاتے ہیں؟
مدن۔ اپنی طبیعت ہمیں شادی نہیں کرنی ہے؟
کرشن۔ آپ کو شادی کرنی ہوگی۔ یہاں آکر آپ اس طرح نہیں لوٹ سکتے؟

مدن۔ آپ کو جو کرنا ہو کیجئے۔ ہم شادی نہیں کرتے؟
کرشن۔ کوئی سبب؟

مدن۔ سبب کیا آپ کو نہیں معلوم ہے؟
کرشن۔ جانتا تو آپ سے کیوں پوچھتا؟
مدن۔ تو پنڈت امانا مکہ سے پوچھئے؟

کرشن۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں؟

مدن۔ بات دینی رہنے دیجئے۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا؟
کرشن۔ اچھا! سمجھ گیا۔ میں جیل خانہ ہوا یا ہوں۔ یہ اُس کی سزا ہے!

واہ رے آپ کا انصاف !

مدن۔ اس بات پر بات نہیں لوٹ سکتی تھی۔
کرشن۔ تو شاید امانا لے جہیز کا خراج دینے میں کچھ بخل کیا
ہوگا؟

مدن۔ ہم اتنے کہنے نہیں ہیں؟
کرشن۔ تو پھر ایسی کوئی بات ہے؟
مدن۔ ہم کہتے ہیں۔ ہم سے نہ پوچھئے۔
کرشن۔ آپ کو بتلانا پڑے گا۔ دروازہ پر آکر بارات لوٹا لے جانا
کیا آپ نے رٹکوں کا کھیل سمجھا ہے۔ یہاں خون کی ندیاں بہ جائیں گی۔
آپ اس بھروسے میں نہ رہئے گا۔
مدن۔ اس کا ہمیں غم نہیں۔ ہم یہاں مرجائیں گے۔ لیکن آپ کی
لڑکی سے شادی نہ کریں گے۔ آپ کے گھر اپنی عزت بیچنے اور آبرو گنوانے
نہیں آئے ہیں۔

کرشن۔ تو کیا ہم آپ سے نیچے ہیں؟

مدن۔ ہاں آپ ہم سے نیچے ہیں؟

کرشن۔ اس کا کوئی ثبوت؟

مدن۔ ہاں ثبوت ہے؟

کرشن۔ تو اس کے غائب کرنے میں آپ کو کیوں تامل ہوتا ہے؟

مدن۔ اچھا تو سنئے۔ مجھے الزام نہ دیجئے گا۔ آپ کی لڑکی سمن جو

اس لڑکی کی حقیقی بہن ہے۔ آوارہ ہو گئی ہے۔ آپ کا جی چاہے۔ تو جا کر اسے
 دال منڈی میں دیکھ آئیے۔
 کرشن چندر نے بدگمان ہو کر کہا: ”یہ بالکل جھوٹ ہے۔ سراسر
 غلط!“

پھر ایک لمحہ میں انہیں یاد آگیا۔ کہ جب میں نے اماناتھ سے سمن
 کا پتہ پوچھا تھا۔ تو انہوں نے ٹال دیا تھا۔ کتنے ہی ایسے کنایوں کے معنے
 سمجھ میں آ گئے۔ جو جانھوی بات بات میں ان پر کرتی رہتی تھی، یقین
 آگیا۔ شرم سے سر جھجک گیا۔ وہ بیسوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ دونوں طرف
 کے صد ہا آدمی وہاں کھڑے تھے۔ لیکن سب کے سب ستائے میں آ گئے
 کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ معاملہ ایسا نازک تھا۔ کہ وہاں فحاش
 کا گزرنہ تھا۔

آدھی رات ہوتے ہوتے ڈیرے خیمے سب اکھڑ گئے۔ اس باغ
 میں پھر تاریکی مسلط ہو گئی۔ پھر گیدڑوں کی مجلس آراستہ ہوئی۔ اور اُتو اپنا
 راگ گانے لگے۔

— (۱۱) —

بھٹل داس نے سمن کو بدھوا آشرم میں خفیہ طور سے رکھا تھا۔ تاکہ
 کمیٹی کے کسی رکن کو اس کی اطلاع نہ دی جاسکے۔ آشرم کی بدھواؤں سے
 کہا تھا۔ یہ بھی بدھوا ہے۔ لیکن منشی ابوالوفا جیسے خواصوں سے یہ بات

زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہ رہی۔ انہوں نے ہریا کو ڈھونڈ لکالا۔ اور اس سے سمن کا پتہ پوچھ لیا۔ تب اپنے دوسرے رنگیں مزاج دوستوں کو بھی یہ مرثدہ سنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن حضرات کی نظر عنایت آشرم پر روز افزوں ہونے لگی۔ کبھی سیٹھ چین لال آتے۔ کبھی سیٹھ بل بھدر داس۔ کبھی پنڈت جی جلوہ افروز ہوتے۔ اور کبھی منشی ابو الوفاء۔ ان بھلے آدمیوں کو آشرم کی صفائی اور سجاوٹ۔ اس کی مالی حالت اور دیگر انتظامی امور سے خاص دلچسپی ہو گئی تھی۔ شب و روز آشرم کے فلاح و بہبود کی فکر میں غرق رہتے تھے۔

بھٹل داس سخت مصیبت میں گرفتار تھے۔ بار بار ارادہ کرتے تھے کہ اس خدمت سے استعفا دے دوں۔ کیا میں نے ہی آشرم کا ذمہ لیا ہے؟ کمیٹی میں اور بھی کتنے ہی اصحاب ہیں۔ جو اس کام کو سنبھال سکتے ہیں۔ وہ جو مناسب سمجھیں گے کریں گے مجھے اپنی آنکھوں سے تو یہ اندھیرہ دیکھنا پڑے گا۔ کبھی سوچتے کیوں نہ ایک دن اُن رنگے سیاروں کو پھٹکا روں۔ پھر جو کچھ ہو گا۔ دیکھا جائے گا۔ لیکن جب سکون کی حالت میں اس مسئلہ پر غور کرتے تو انہیں اس آشرم کا وجود اپنی ہی ذات کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ہی اس کی بنیاد ڈالی ہے۔ میں نے ہی اسے اب تک زندہ رکھا ہے۔ اگر میں نے کنارہ کیا تو چنہ ہی دلوں میں یہ سرسبز لپو دا خشک ہو جائے گا۔ ہاں وہ اُن حضرات سے بڑی بے اعتنائی اور بے رخی سے پیش آتے۔ اُن کی خیر خواہانہ صلاحوں کی ہنسی

اُڑاتے۔ اور کنایہ ان پر ظاہر کرتے۔ کہ آپ لوگوں کی یہ آمد و رفت مجھے سخت ناپسند ہے، لیکن غرض کے بندے باریک بین نہیں ہوتے۔ دونوں سیٹھ ان کی باتیں سن کر خلق مجسم بن جاتے تیواری جی ایسے علیم و سلیم ہو جائے۔ گویا انہیں کبھی غصہ آ ہی نہیں سکتا۔ انکی رضا جوئی اور خندہ طبعی سمجھل داس کو نرم کر دیتی تھی۔

اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ سمجھل داس انہیں تفکرات میں ڈوبے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ کہ ہرچہ باد آیا۔ آج اس خلیج کو مٹا دوں گا۔ آشرم ٹوٹ جائے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے۔ کہ وہ ایسی نا اہلیوں کا نشانہ نہ بنے۔ دفعۃً ایک فتن آشرم کے دروازے پر آکر رُکی۔ اُس میں سے کون لوگ اترے۔ بہ عبد اللطیف اور ابو الوفا۔

سمجھل داس دل میں تلملا کر رہ گئے۔ جی میں تو آیا۔ کہ دونوں کو دو تھکار دوں۔ پر صبر سے کام لیا۔

فتنی ابو الوفا نے فرمایا کہ آداب عرض ہے بندہ نواز! آج طبیعت کچھ پریشان ہے کیا۔ واللہ آپ کا اشارہ دیکھ کر روح کو تقویت ہوتی ہے کہ ابھی ہم میں کچھ انسان باقی ہیں۔ خوش نصیب ہے۔ وہ قوم جس میں آپ جیسے سچے خادم موجود ہیں۔ ایک ہماری خود غرض۔ خود نما قوم ہے جسے ان باتوں کی حس ہی نہیں۔ جو حضرات بہت نیک نام ہیں۔ وہ بھی غرض سے پاک نہیں۔

عبداللطیف۔ جناب ہماری قوم کی کچھ نہ کہئے۔ خود غرض۔ خود
 فروش۔ خود مطلب کج فہم کج رو کج ہیں جو کہئے تھوڑا ہے۔ بڑے بڑوں
 کو دیکھئے رنگے ہوئے سیار ہیں۔ ریا کا جا رہے ہیں ہوئے۔ آپ کی ذات مصدقہ
 برکات ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ خداوند تعالیٰ نے زمرہ ملائک
 میں سے انتخاب کر کے آپ کو اس خوش نصیب قوم پر نازل کیا ہے۔
 ابو الوفا۔ آپ کی پاک نفسی دلوں پر خواہ مخواہ اثر ڈالتی ہے۔ آپ کے
 یہاں کچھ سوزن کاری اور بیل بوٹے کے کام تو ہوتے ہی ہوں گے، میرے
 ایک دوست نے سوزن کاری کے کئی درجن چادروں کی فرمائش لکھ
 بھیجی ہے۔ حالانکہ شہر میں اور کئی جگہ یہ کام ہوتا ہے۔ لیکن میں نے
 خیال کیا۔ کہ آشرم کو دوسرے پرائیویٹ کام کرنے والوں پر ترجیح ہونی چاہیے۔
 آپ کے یہاں کچھ نمونے موجود ہوں۔ تو تکلیف کر کے دکھا دیجئے۔ اگر
 اس وقت امر مانع ہو۔ یا نمونے موجود نہ ہوں۔ تو پھر کسی وقت حاضر
 ہوں۔

عبداللطیف۔ میرے گھر میں بھی چکن کے تھان کی ضرورت
 ہے۔ لکھنؤ کے تھان بازار میں ہیں۔ لیکن میں ہم خرمادہم ثواب کے مصداق
 آشرم ہی کو یہ آرڈر دینا چاہتا ہوں۔
 جٹیل داس نے بے رخی سے کہا، میرے یہاں سوزن کاری بالکل
 نہیں ہوتی۔

ابو الوفا۔ مگر ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ دریا منت کیجئے کچھ مستورات

ضرور اس فن میں ماہر ہوں گی ہمیں ایسی کوئی عجلت نہیں ہے۔ پھر حاضر ہوں گے۔ ایک دو۔ چار۔ دس بار آنے میں ہم کو کوئی عذر نہیں ہے۔ آپ اپنا سب کچھ نثار کر رہے ہیں۔ تو کیا ہم سے اتنا بھی نہ ہوگا۔ میں ان معاملات میں قومی تفریق مناسب نہیں سمجھتا۔

بھٹل داس۔ میں ان عنایات کے لئے آپ کا مشکور ہوں۔ لیکن کمیٹی نے فیصلہ کر دیا ہے۔ کہ یہاں سوزن کا کام نہ کرایا جائے۔ کیونکہ اس سے بینائی کمزور ہوتی ہے۔ اس وجہ سے مجبور ہوں۔ یہ کہہ کر بھٹل داس اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب دونوں حضرات کو لوٹ جانے کے سوا اور کوئی تدبیر نہ سوچھی۔ دل میں بھٹل داس کو صلواتیں سناتے ہوئے فٹن پر سوار ہو گئے۔

لیکن ابھی فٹن کی آواز کانوں میں آ ہی رہی تھی۔ کہ چمن لال کا موٹر کار آ پہنچا۔ سیٹھ جی لکڑی کے سہارے اترے اور بھٹل داس سے ہاتھ ملا کر بولے۔ کیوں بابو صاحب۔ ناٹک کے متعلق آپ نے کیا رائے قائم کی؟ شکنتلا کو انگریز لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔ کچھ پارٹ یاد کرائے ہوں۔ تو میں بھی سنوں کبھی کبھی ضرورت کے وقت ہمیں ایسی چالیں سوچ جاتی ہیں جو سوچنے سے دھیان میں نہیں آتیں۔ بھٹل داس نے بہت سوچا تھا۔ کہ ان موٹے ٹیل سے کیونکر پنڈ چھوٹے۔ لیکن کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی تھی۔ اس وقت دفعۃً انہیں ایک حکمت سوچ گئی۔ بولے۔ ”جی نہیں اس کے کھیلنے کی صلاح نہیں ہوئی۔ میں نے اس معاملہ

میں کلکٹر صاحب سے رائے لی تھی۔ انہوں نے منع فرمایا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ یہ لوگ پالیٹیکس کے کیا معنی لیتے ہیں۔ آج جب میں نے باتوں ہی باتوں میں ان سے اس آشرم کے لئے کچھ سالانہ امداد کی درخواست کی۔ تو بولے میں پولیٹیکل کاموں میں مدد نہیں دے سکتا۔ میں حیرت میں آگیا۔ پوچھا۔ آپ آشرم کو کس لحاظ سے پولیٹیکل سمجھتے ہیں؟ اس کا صرف یہ جواب دیا۔ کہ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔
 سیٹھ چمن لال کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ بولے تو صاحب نے آشرم کو پولیٹیکل سمجھ لیا؟

بھٹل۔ جی ہاں صاف صاف کہہ دیا۔
 چمن لال۔ جب ان کا یہ خیال ہے۔ تو یہاں آنے جانے والوں کی دیکھ بھال بھی ضرور ہوتی ہوگی؟
 بھٹل داس۔ جی ہاں اور گیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ جن لوگوں کے دلوں میں قوم کا درد ہے۔ وہ ان باتوں کی پروا کب کرتے ہیں؟

چمن لال۔ جی نہیں۔ میں ان درد مند ان قوم میں نہیں ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے۔ کہ یہ لوگ رام لیلا بھی پولیٹیکل سمجھتے ہیں۔ تو میں اسے بھی بند کر دوں۔ پالیٹیکس کے نام سے میری روح فنا ہوتی ہے۔ آپ میرے گھر دیکھ آئے۔ بھگوت گیتا کی ایک جلد بھی نہیں ہے۔ میں نے اپنے نوکروں کو سخت تاکید کر دی ہے۔ کہ بازار سے چیزیں پتوں میں

لایا کریں۔ میں اخباروں کی پڑیاں تک گھر میں نہیں آنے دیتا۔ رانا پرتاپ
کی ایک پرانی تصویر کمرہ میں تھی۔ اُسے میں نے اتار کر صندوق میں بند کر دیا
ہے۔ تو اب مجھے اجازت دیجئے؟

یہ کہہ کر وہ توند سنہا لیتے ہوئے موٹر کار کی طرف لپکے۔ اور دم
زدن میں موٹر کی گرد اڑتی ہوئی نظر آئی۔ بھٹل داس دل میں خوب
سنسنے۔ اچھی چال سوچھی۔ لیکن انہیں اس کا مطلق خیال نہ تھا۔ کہ
جھوٹ کتنا بولنا پڑا۔ اور اس سے روم کو کتنا زوال پہنچا۔ یہ نیکی کا
پتلا اپنے ذاتی معاملات میں دروغ سے کوسوں بھاگتا تھا۔ لیکن
قومی معاملات میں وقتاً فوقتاً اس سے مدد لینے میں دریغ نہ کرتا تھا۔
چمن لال کے جانے کے بعد بھٹل داس نے چندے کا رجبہ اٹھایا۔
اور چندہ وصول کرنے کو چلے۔ لیکن کمرہ سے باہر بھی نہ گئے تھے۔ کہ سیٹھ
بلجندر داس کو پیر گاڑی پر تے دیکھا۔ غصہ کی ایک لہر ساری گوں
میں دوڑی۔ رجبہ ٹپک دیا۔ اور آمادہ جنگ ہو بیٹھ۔ راہ فرما نہ تھی
بلجندر داس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”کئے بالو صاحب۔ کل میں نے
تو پودے بھیجے تھے۔ وہ آپ نے بٹھا دئے یا نہیں؟ ذرا میں بھی دیکھنا
چاہتا ہوں۔ ضرورت ہو۔ تو اپنا مالی بھیج دوں؟“

بھٹل داس بے رخی سے بولے ”جی نہیں آپ کو مالی بھیجنے کی ضرورت
نہیں۔ اور نہ وہ پودے یہاں لگ سکتے ہیں؟“

بلجندر۔ کیوں لگ کیوں نہیں سکتے؟ میرا مالی آکر سب ٹھیک

کر دلیگا۔ آج ہی لگوادیجئے۔ ورنہ سب سوکھ جائیں گے۔
بھٹل۔ سوکھ جائیں یا رہیں۔ پر یہاں وہ آگ نہیں سکتے۔
بل بھدر۔ نہیں لگانے تھے۔ تو پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ میں نے
 سہارنپور سے منگوائے تھے۔

بھٹل۔ برآمدے میں پڑے ہیں۔ اٹھوا لے جائیے۔
 سیٹھ جی خود دار اور بیک آدمی تھے۔ یوں وہ نہایت خلیق۔ سلیم
 بامروت آدمی تھے۔ لیکن ذرا کسی نے اگر کربات کی۔ ذرا نگاہ بدلی۔ اور
 وہ ذہانت و فطانت کا پتلا آگ ہو جاتا تھا۔ اسی وجہ سے خاص حلقوں
 میں وہ مغرور اور بد مزاج مشہور تھے۔ لیکن انہیں اوصاف کے باعث
 وہ رعایا کے منظور نظر بنے ہوئے تھے۔ پبلک کو ان پر کامل اعتماد تھا۔
 اُسے یقین تھا۔ کہ یہ کبھی حق کے معاملہ میں قدم پیچھے نہ ہٹائیں گے، اپنی
 ذاتی شہرت یا مفاد کے لئے پبلک کا برا نہ سوچیں گے، ڈاکٹر شیاچارن
 پر پبلک کو یہ اعتماد نہ تھا چہرہ کی نگاہ میں علم اور عقل۔ اعزاز و امتیاز
 کی اتنی وقعت نہیں ہوتی جتنی اخلاقی قوت کی۔ **بھٹل** داس کی کج خلقی
 نے ان کے تیوروں پر بل ڈال دئے۔ اینٹ اور پتھر کی جنگ شروع
 ہوئی۔ تن کر بولے "آج آپ اتنے برہم کیوں ہیں؟"

بھٹل داس۔ مجھے چکنی چٹری باتیں کرنی نہیں آتیں۔
بل بھدر۔ چکنی چٹری باتیں نہ کیجئے۔ لیکن لاٹھی تو نہ مارے شرافت
 کے یہ معنی نہیں ہیں۔

”میں آپ سے شرافت کا سبق نہیں لینا چاہتا؟“

”آپ جانتے ہیں میں بھی کارکن کمیٹی کا ممبر ہوں؟“

”جی ہاں جانتا ہوں؟“

”چاہتا تو کمیٹی کا صدر ہوتا؟“

”جانتا ہوں“

”میرے عطیے کسی سے کم نہیں ہیں؟“

”ان پرانی باتوں کے یاد دلانے کی ضرورت نہیں؟“

”چاہوں تو آشرم کی ہستی کو خاک میں ملا دوں؟“

”غیر ممکن“

”کارکن کمیٹی کے ممبروں کو اشارے پر نچا سکتا ہوں؟“

”ممکن ہے؟“

”ایک دن میں اس کی ہستی مٹا سکتا ہوں؟“

”غیر ممکن؟“

”آپ کس کھمنڈ میں بھولے ہوئے ہیں؟“

”ایشور کے بھر دے پر؟“

سیٹھ جی آشرم کی طرف پر غضب لگا ہوں سے تاکتے ہوئے پیر گاڑی

پر سوار ہو گئے۔ لیکن بھیل داس پر ان کی دھمکیوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ انہیں

یقین تھا کہ وہ آشرم کے متعلق ممبروں سے کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکیں گے

ان کا غور انہیں اتنا نیچے نہ کرنے دے گا۔ ممکن ہے۔ وہ اس خفت کو مٹانے

کے لئے ممبروں سے آشرم کی تعریف کریں۔ لیکن یہ آگ کبھی نہ کبھی بھڑکے گی ضرور۔ اس میں شک نہ تھا۔ غرور اپنی ذلت کو نہیں فراموش کر سکتا۔ اس کا خدشہ ہونے پر بھی بھٹل داس کو وہ ملال نہ تھا۔ جو کسی بد مزگی کے بعد دل پر چھا جایا کرتا ہے۔ اس کے برعکس انہیں اپنے فرض کو پورا کرنے کا اطمینان تھا۔ اور وہ پچھتا رہے تھے۔ کہ میں نے اب تک اتنی تاخیر کیوں کی اس اطمینان قلب کا ان پر ایسا سرور ہوا۔ کہ وہ بلند آواز سے یہ پد گاتے لگے۔

پرہوجی۔ مجھے کاہے کی لاج!

جنم جنم یونی بھریا نیو ابھانی بے کاج
(بھٹا ہون) منور ہے۔ صرف

پرہوجی۔ مجھے کاہے کی لاج!

اسی اثناء میں انہیں پدم سنگھ آتے نظر آئے۔ متفکر۔ زرد خستہ پریشان حالی کی مجسم صورت۔ گویا ابھی رو کر آنسو پونچھے ہیں۔ بھٹل داس آگے بڑھ کر ان سے گلے ملے۔ اور پوچھا کہ کچھ طبیعت ناساز ہے کیا۔ بالکل پہچانے نہیں جاتے؟

پدم سنگھ۔ جی نہیں بیمار تو نہیں ہوں۔ ذرا پریشان رہا۔
بھٹل۔ شادی بخیریت ہو گئی؟

پدم سنگھ نے چھت کی طرف تاکتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا قصہ نہ پوچھئے۔ شادی کیا ہوئی۔ ایک غریب لڑکی کی زندگی خاک میں ملا آئے۔ وہ لڑکی اسی سمن بائی کی بہن نکلی۔ بھائی صاحب کو جو نہی معلوم ہوا۔ وہ دروازہ

سے بار بار لوٹا لائے۔

بھٹل داس۔ یہ تو ایک سانحہ ہے۔ آپ نے اپنے بھائی صاحب کو سمجھایا یا نہیں؟

پدم سنگھ۔ آپ سمجھانے کی کتنے ہیں میں لڑا جھگڑا۔ باز تک کھائی۔
لیکن سب بے سود۔

بھٹل۔ دیکھئے اب بیچاری لڑکی کی کیا گت ہوتی ہے۔ سن سنے گی
تو روئے گی۔

پدم۔ کئے یہاں کی کیا خبریں ہیں۔ مجھ کے آنے سے آشرم میں کوئی
ہنگامہ تو نہیں مچا۔ ودھوائیں اس سے نفرت تو ضرور کرتی ہوئی گی۔

بھٹل۔ راز کھل جائے۔ تو آج آشرم خالی نظر آئے۔

پدم۔ اور سن کیسے رہتی ہے؟

بھٹل۔ بالکل اس طرح گویا آشرم ہی میں اس کی پرورش ہوئی ہے۔
معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے حسن اخلاق سے اپنے داغ کو مٹانا چاہتی ہے۔

ہر ایک کام کرنے کو تیار اور بخندہ پیشانی، ودھوائیں سوتی ہی رہتی
ہیں۔ اور وہ ان کے کمرؤں میں جھاڑو دے جاتی ہے۔ کئی عورتوں کو

کھانا پکانا سکھاتی ہے۔ کئی عورتیں اس سے سینا پرونا سیکھتی ہیں۔ سب

کی سب ہر ایک معاملہ میں اسی کی صلاح پر چلتی ہیں۔ اس چار دیواری کے

اندر اب اس کا راج ہے۔ مجھے اس سے ہرگز ایسی اُمید نہ تھی۔ یہاں اس نے

کچھ پڑھنا بھی شروع کر دیا ہے۔ اور جناب دل کا حال تو پر ماتا ہی جان سکتا

ہے۔ پر بظاہر اس کی گایا پلٹ سی ہو گئی ہے۔
 پدم۔ نہیں جناب اس کے اطوار کبھی بُرے نہیں رہے۔ میرے
 یہاں مہینوں اس کی آمد و رفت تھی۔ میرے گھر میں اس کی بڑی تعریف
 کیا کرتی تھیں۔ کچھ ایسے ناگوار اتفاقات ہی ہو گئے۔ جن کی بدولت اسے
 یہ ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ سچ پوچھئے۔ تو ہماری حماقتوں کا خمیازہ اسے
 اٹھانا پڑا۔ ہاں کچھ اس طرف کی خبریں بھی ملیں؛ سیٹھ بل بھدر داس نے
 اور کوئی چال چلی؟

بھٹل۔ ہاں صاحب وہ چپ بیٹھنے والے آدمی ہیں؛ آج کل
 خوب دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ تین دن ہوئے ہندو ممبروں کا ایک جلسہ
 بھی ہوا تھا۔ میں تو جانہ سکا۔ پر سنتا ہوں۔ میدان انہیں لوگوں کے
 ہاتھ رہا۔ اب پریزیڈنٹ کے دو دوٹ ملا کر ان کے پاس چھ دوٹ ہیں۔
 اور ہمارے پاس صرف چار۔ ہاں مسلمانوں کے دوٹ ملا کر برابر ہو
 جائیں گے؟

پدم۔ تو ہم کو کم سے کم ایک ووٹ اور ملنا چاہئے؛ ہے اس کی کوئی اُمید؟
 بھٹل۔ مجھے تو کوئی اُمید نظر نہیں آتی؟

پدم۔ فرصت ہو۔ تو چلئے ذرا ڈاکٹر صاحب اور لالہ بھگت رام کے
 پاس چلیں؟

بھٹل۔ ہاں چلئے میں تیار ہوں؟



(۱۲)

اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا ہنگامہ قریب ہی تھا۔ لیکن ان دونوں صاحبوں نے ایک گاڑی کرایہ کی، ڈاکٹر صاحب کے دولت خانہ پر سپریمیل جانا فیشن کے خلاف تھا۔ راستہ میں ہٹھل داس نے آج کے سب حالات مبالغہ کے ساتھ بیان کئے۔ اور اپنی فراست کا خوب اظہار کیا، پدم سنگھ نے کیفیت سنی۔ تو انداز تفکر سے بولے "تو اب ہمیں اور بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ غالباً انجام یہ ہوگا۔ کہ آشرم کا سارا بار ہمیں لوگوں پر پڑے گا بل بھر داس ابھی چاہے خاموش ہو جائیں۔ پر کبھی نہ کبھی اس کا غبار نکلے گا ضرور!"

ہٹھل داس۔ میں کیا کروں۔ مجھ سے یہ اخذ صیر دیکھ کر رہا نہیں جاتا۔ بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ یہ حضرات علم اور تہذیب اور اخلاق کے پتلے بنے پھرتے ہیں۔ اور حرکات ایسی ناشائستہ!

پدم سنگھ۔ خیر یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ یہ بھی میرے اعمال کا نتیجہ ہے دیکھئے ابھی اور کیا کیا گل کھلتے ہیں۔ جب سے بارات واپس آئی ہے میری عجیب حالت ہو رہی ہے۔ نہ بھوک نہ پیاس۔ رات بھر کروٹیں بدلا کرتا ہوں۔

یہی غم ستایا کرتا ہے۔ کہ اس بند نصیب لڑکی کی کیا گت ہوگی۔ اگر کہیں آشرم کی فکر بھی سر پر آ پڑی۔ تو جان ہی پر بن جائے گی۔ ایسے انتہاء دلدل

میں پھنس گیا ہوں۔ کہ جوں جوں اوپر اٹھنا چاہتا ہوں۔ اور نیچے دبا جاتا ہوں۔

اتنے میں ڈاکٹر صاحب کا بنگلہ آگیا۔ ۱۰ بجے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے سچے ہوئے کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنی بڑی لڑکی مس کانتی سے شطرنج کھیل رہے تھے۔ میز پر دو ٹیریکٹے بیٹھے ہوئے بڑے عذر سے شطرنج کی چالوں کا ملاحظہ کر رہے تھے۔ اور کبھی کبھی جب ان کے خیال میں کھلاڑیوں سے کوئی غلطی ہو جاتی تھی۔ تو وہ پنچوں سے سروں کو ٹھیک کر دیا کرتے تھے۔ مس کانتی اُن کی اس شرارت پر ہنس کر انگریزی میں کہتی تھیں ”یونائی“ میز کے بائیں جانب ایک کرسی پر پیٹین علی صاحب رونق افروز تھے۔ اور مس کانتی کو چالیں بتاتے جاتے تھے۔

اسی اثناء میں یہ دونوں آدمی کمرہ میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے تپاک سے اُکٹ کر اُن سے ہاتھ ملایا۔ مس کانتی نے اُن کی طرف دینی لگا ہوں سے دیکھا۔ اور میز پر سے ایک اخبار اُٹھا کر پڑھنے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب نے انگریزی میں فرمایا: ”آپ سے مل کر بہت خوش ہوا“ آئیے آپ لوگوں کو مس کانتی سے انٹروڈیوس کر ادوں۔“

تعارف ہو جانے پر مس کانتی نے دونوں آدمیوں سے ہاتھ ملایا۔ اور شگفتہ ہو کر بولیں ”پاپا ابھی آپ ہی صاحبوں کا ذکر کر رہے تھے۔ آپ سے مل کر میں بہت خوش ہوئی۔“

ڈاکٹر شیاچارن مس کانتی ابھی ڈسوزی پہاڑ سے آئی ہیں۔

ان کا اسکول جاڑوں میں بند ہو جاتا ہے۔ وہاں تعلیم کا نہایت معقول انتظام ہے۔ یہ انگریزوں کی لڑکیوں کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس میں رہتی ہیں۔ لیڈی پرنسپل نے اب کے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ کانتی! ذرا اپنی لیڈی پرنسپل کی چٹھی انہیں دکھا دو۔ مسٹر سنہار پدم سنگھ، آپ کانتی کی انگریزی تقریر سن کر دنگ رہ جائیں گے۔ (ہنستے ہوئے) یہ مجھے کتنے ہی نئے محاورے سکھا سکتی ہے۔

مس کانتی نے شرماتے ہوئے اپنا سر ٹیفکیٹ پدم سنگھ کو دکھایا۔ وہ اسے پڑھ کر بولے: ”کیا آپ لیڈن بھی پڑھتی ہیں؟“
ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ لاٹن میں اب کے ایک تمنغہ انعام ملا ہے۔ کل کلب میں کانتی نے ایسا گیم (کھیل) دکھایا۔ کہ انگریز لیڈیاں حیرت میں آگئیں۔ اس نے سب کے چھکے چھڑا دیے۔ ”ہاں اب کی بار آپ ہندو معبروں کے جنسے میں نہیں تھے؟“

پدم سنگھ۔ جی نہیں میں ذرا مکان پر چلا گیا تھا۔
شیا ماچرن۔ آپ ہی کی تجویز درپیش تھی۔ میں تو مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ ابھی آپ اسے بورڈ میں پیش کرنے میں عجلت نہ کریں، ابھی کامیابی کی امید بہت کم ہے۔

تبغ علی۔ جناب مسلمان ممبروں کی طرف سے تو آپ کو پوری مدد ملے گی۔

شیا ماچرن۔ درست ہے۔ لیکن ہندو ممبروں میں تو اختلاف ہے۔

پدم سنگھ۔ اگر آپ اعانت فرمائیں۔ تو ہماری کامیابی یقینی ہے۔
 شیا ماچرن۔ مجھے آپ کی تجویز سے کامل ہمدردی ہے لیکن آپ کو
 معلوم ہے۔ میں گورنمنٹ کا نامزد کردہ ممبر ہوں۔ جب تک یہ تحقیق نہ
 ہو جائے۔ کہ گورنمنٹ اس تجویز کو پسند کرتی ہے۔ یا نہیں۔ اس وقت تک
 میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

بھٹل داس نے بے تمیزانہ انداز سے کہا۔ جب ممبر ہونے سے آپ
 کے خیالات کی آزادی میں فرق آتا ہے۔ تو میرے خیال میں آپ کو استعفا
 دے دینا چاہئے۔

تینوں آدمیوں نے بھٹل داس کی طرف ملامت آمیز نظروں سے
 دیکھا۔ ان کی یہ گفتگو بالکل بے موقع تھی۔ تیغ علی نے طنز سے کہا۔ استعفا
 دے دیں۔ تو یہ قدر و منزلت کیونکر حاصل ہو؟ لاٹ صاحب کے برابر
 کرسی پر کیسے بیٹھیں؟ آریسل کیونکر کھلائیں؟ بڑے بڑے انگریزوں سے
 ہاتھ ملانے کا اعزاز کیونکر حاصل ہو۔ سرکاری دعوتوں میں بڑھ بڑھ کر
 ہاتھ مارنے کے موقع کیونکر میسر ہوں۔ مینی ناں کی سیر کیونکر کریں۔ اپنی تقریر
 کا اعجاز کیونکر دکھائیں؟ یہ بھی تو سوچئے۔

بھٹل داس کٹ گئے۔ تیغ علی نے انہیں بڑی بے رحمی سے جھنجھوڑا۔
 پدم سنگھ پھپھٹائے۔ کہ ناحق ایسے آدمی کے ساتھ آئے۔

ڈاکٹر صاحب نے متین لہجہ میں کہا۔ عوام کا خیال ہے۔ کہ لوگ
 اسی اعزاز و وقار کی ہوس میں ممبری کے لئے دوڑتے ہیں۔ وہ مطلق نہیں

سمجھتے۔ کہ یہ کتنی عظیم ذمہ داری کا کام ہے۔ غریب ممبر کو اپنا کتنا وقت۔ کتنی محنت کتنی دولت اس ذمہ داری پر قربان کرنی پڑتی ہے۔ اس کے صلے میں اُسے بجز اس اطمینان کے اور کیا ملتا ہے۔ کہ میں اپنے ملک اور قوم کی خدمت کر رہا ہوں۔ یہ اطمینان نہ ہو۔ تو کوئی ممبری کی پروا بھی نہ کرے۔“

تیغ علی۔ جی ہاں اس میں کیا شک ہے۔ جناب صحیح فرماتے ہیں۔ جس کے سر پر عظیم الشان ذمہ داری پڑتی ہے۔ اس کا دل ہی جانتا ہے۔ گیارہ بج گئے تھے۔ پدم سنگھ اور بٹھل داس یہاں سے چلے، راستہ میں بٹھل داس نے کہا۔ ”میرے کھانے کا وقت آگیا۔ میں اب جاتا ہوں آپ شام کو تشریف لائے گا۔ پدم سنگھ نے کہا۔ ہاں ہاں شوق سے جائیے۔“ انہیں خیال آیا۔ کہ جب ایسا دھن کا پکا آدمی کھانے میں ذرا سی دیر ہو جانے پر بے چین ہو جاتا ہے۔ تو دوسروں سے کیا اُمید کی جاسکتی ہے۔ لوگ قوم اور ملک کے خادم تو بنتے ہیں۔ پر ذرا سی بھی تکلیف نہیں اٹھانی چاہتے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ لالہ بھگت رام کے مکان پر آ پہنچے۔ لالہ بھگت رام دھوپ میں تخت پر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ ان کی چھوٹی لڑکی گود میں بیٹھی ہوئی دھوئیں کو پکڑنے کے لئے بار بار لپکتی تھی۔ سامنے زمین پر کئی مستری اور معمار بیٹھے ہوئے تھے، بھگت رام پدم سنگھ کو دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور پا لاگن کر کے بولے۔ ”میں نے شام ہی کو سنا تھا۔ کہ آپ آگئے۔ آج صبح ارادہ کیا۔ کہ چلوں۔ لیکن کچھ

ایسی جھنجھٹ میں پھنس گیا۔ کہ فرصت ہی نہ ملی۔ یہ ٹھیکہ داری بڑے جھگڑے کا کام ہے۔ کام کرائے۔ اپنے روپے لگائے۔ اُس پر دوسروں کی خوشامد کیجئے۔ آج کل انجینئر صاحب نہ جانے کیوں مجھ سے ناراض ہیں۔ میرا کوئی کام انہیں پسند ہی نہیں آتا۔ ایک پُل بنانے کا ٹھیکہ لیا تھا۔ اسے تین بار گرا چکا ہوں کبھی کہتے ہیں۔ یہ نہیں بنا۔ کبھی کہتے ہیں۔ وہ نہیں بنا۔ نفع کیا ہوگا۔ اُسے نقصان اٹھارنا ہوں۔ کوئی سُنتے والا نہیں۔ آپ نے ہندو ممبروں کے جلسے کی کیفیت تو سنی ہوگی۔ پدم سنگھ جی ہاں سنا۔ اور سن کر۔ رنج ہوا۔ آپ سے مجھے پوری امید تھی۔ کیا آپ کو اس تجویز سے اتفاق نہیں ہے؟ بھگت رام۔ جناب محض اتفاق ہی نہیں ہے۔ اس کی دل سے مدد کرنی چاہتا ہوں۔ پر میں اپنی رائے کا مالک نہیں ہوں۔ میں نے اپنے تئیں غرض کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔ مجھے آپ گراموفون کارڈ سمجھئے۔ جو کچھ بھر دیا جاتا ہے۔ وہی کہتا ہوں۔ اور کچھ نہیں۔ پدم سنگھ۔ لیکن آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ قومی بہبود کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینی چاہئے۔

بھگت رام۔ جی ہاں اصولاً اسے تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن عمل کی جرأت نہیں۔ آپ جانتے ہیں میرا سارا کاروبار سیٹھ چمن لال کی مدد سے چلتا ہے اگر انہیں ناراض کر دوں۔ تو یہ سارا ٹھٹھاٹ بگڑ جائے۔ شہر میں میری جو کچھ عزت ہے۔ وہ اسی ٹھٹھاٹ کے باعث ہے۔ علم اور عقل ہے ہی نہیں

صرف اسی سوانگ کا بھروسہ ہے۔ آج اگر قلعی کھل جائے۔ تو کوئی بات بھی نہ پوچھے۔ دودھ کی مکھی کی طرح سماج سے نکال دیا جاؤں۔ بتلائیے شہر میں ایسا کون ہے۔ جو محض میرے اعتبار پر بلا سود کے ہزاروں روپے قرض دیدے؟ اور پھر صرف اپنی ہی فکر نہیں۔ کم سے کم تین سو روپیہ ہمارے خاندان کا خرچ ہے۔ قوم کے لئے میں خود تکلیف اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن عیال کو کیونکر منجھدھار میں چھوڑ دوں؟

ہم جب اپنے کسی فرض سے قاصر ہوتے ہیں۔ تو الزام سے بچنے کے لئے ایسی ایسی پرزور دلیلیں اختراع کرتے ہیں۔ کہ کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ اس وقت ہم شرم اور لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر بڑی دلیری سے اپنے متعلق ایسے ایسے رازوں کا افشا کر دیتے ہیں۔ جو کسی وقت ہماری زبان پر نہ آتے۔ پدم سنگھ سمجھ گئے۔ کہ ان سے بھی کوئی اُمید نہیں ہے۔ بولے۔ ”ایسی حالت میں آپ پر کیونکر زور دے سکتا ہوں۔ مجھے صرف ایک دوڑ کی فکر ہے۔ کوئی تدبیر بتلائیے کیونکر حاصل ہو؟“

بھگت رام میری صلاح تو یہ ہے۔ کہ آپ کنور صاحب کے پاس جائیے۔ ان کا دوڑ آپ کو یقیناً مل جائے گا۔ سیٹھ بل بھدر داس نے ان پر تیس ہزار کی نالش کی ہے۔ کل ان کی ڈگری بھی ہو گئی۔ کنور صاحب آج کل سیٹھ جی سے تنے ہوئے ہیں۔ بس چلے تو انہیں گولی مار دیں۔ انہیں قابو میں لانے کی ایک اور تدبیر آپ کو بتلاتا ہوں۔ آپ انہیں کسی جلسے کا پریزیڈنٹ بنا دیجئے۔ بس ان کی تکمیل آپ کے ہاتھ میں ہو

جائے گی۔

پدم سنگھ نے ہنس کر کہا: اچھی بات ہے۔ انہیں کے ہاں چلتا ہوں
دوپہر ہو گئی تھی۔ لیکن پدم سنگھ کو بھوک پیاس نہ تھی۔ بگھی پر بیٹھ کر
چلے۔ کنور صاحب برنا کے کنارے ایک بنگلہ میں رہتے تھے۔ آدمہ
گھنٹہ میں جا پہنچے۔ بنگلہ کے احاطہ میں نہ کوئی سجادہ تھی۔ نہ صفائی۔
پھول پتی کا نام نہ تھا۔ برآمدے میں کئی کتے زنجیروں سے بندھے کھڑے
تھے۔ کنور صاحب کو شکار کا بہت شوق تھا۔ کبھی کبھی کشمیر تک کا چکر
لگایا کرتے تھے۔ اس وقت وہ اپنے کمرہ میں بیٹھے ہوئے تار بجا رہے
تھے۔ دیواروں پر پہلوں کے سینگ اور چیتوں کی کھالیں زیب دے
رہی تھیں۔ ایک گوشہ میں کئی بندوقیں اور بھالے رکھے ہوئے تھے۔
دوسری طرف ایک بڑی میز پر ایک گھڑیاں بیٹھا ہوا تھا۔ پدم سنگھ
نے کمرہ میں قدم رکھا۔ تو اُسے دیکھ کر ایک بار چونک پڑے۔ کھال
میں ایسی صفائی سے بھوسا بھرا گیا تھا۔ کہ اس میں جان سی ٹپکئی
تھی۔

کنور صاحب نے پدم سنگھ کو دیکھا۔ تو ٹوٹ کر گلے ملے۔ اور بولے۔
”آئیے جناب۔ آپ کی تو اب زیارت ہی نہیں نصیب ہوتی۔ مکان سے
کب آئے؟“

پدم سنگھ۔ کل آیا۔

کنور۔ چہرہ اُترا ہوا ہے۔ بیمار تھے کیا؟

پدم سنگھ۔ جی نہیں۔ کوئی خاص شکایت نہیں ہے۔
 کنور۔ شربت پیجئے۔ پیاس لگی ہوگی؟
 پدم سنگھ۔ جی نہیں۔ معاف کیجئے۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔ کیا
 ستار کی مشق ہو رہی ہے؟

کنور۔ جی ہاں مجھے تو اپنے ستار ہی سے عشق ہے۔ ہارمونیم اور
 پیانو سن کر طبیعت مالش کرنے لگتی ہے۔ ان انگریزی باجوں نے ہمارے
 فن موسیقی کا قلع قمع کر دیا۔ ان کا چرچا ہی اٹھ گیا۔ جو کچھ تھوڑی سی کسریا
 رہ گئی تھی۔ وہ تھیسٹروں نے پوری کر دی۔ بس جسے دیکھے غزل اور قوالی
 کی رٹ لگا رہا ہے۔ چند دنوں میں ہمارے فن حرب کی طرح اس کا بھی
 خاتمہ ہو جائے گا۔ موسیقی دلوں میں پاکیزہ جذبات پیدا کرتی ہے جب
 سے فن نغمہ کی کساد بازاری ہوئی۔ ہم بے حس ہو گئے۔ ہمارے دلوں میں
 نازک جذبات کا مادہ ہی نہیں رہا۔ اور اس کا سب سے بڑا اثر ہماری
 ادبیات پر نظر آتا ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے۔ کہ جس قوم نے رامائن
 جیسی عظیم المثال تصنیف کی۔ سورساگر جیسا گلزار معانی سجایا۔ وہی قوم
 اب معمولی نادلوں کے لئے ترجمہ کی محتاج ہے۔ بنگال اور دکن میں
 ابھی تک گانے کا کچھ رواج ہے۔ اسی لئے دہاں جذبات کا ایسا فقدان
 نہیں ہے۔ آپ کی تجویز کا کیا حشر ہوتا نظر آ رہا ہے؟

پدم سنگھ۔ آپ یہ سوال پوچھ کر میرے اوپر ستم کرتے ہیں۔ مجھ کو آپ
 سے زیادہ ہمدردی کی توقع تھی۔

کنور صاحب نے قہقہہ مارا۔ اُن کی ہنسی کمرہ میں گونج اٹھی۔ پتیل
 کی ڈھال جو دیوار سے لٹک رہی تھی۔ اس آواز سے جھٹکارنے لگی۔ بولے
 ”آپ کو غالباً میری جانب سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے اپنی ساری
 قوتِ تقریر آپ کی حمایت میں صرف کی۔ اس سے زیادہ میں اور کیا کر
 سکتا تھا؟ یہاں تک کہ میں نے اس تجویز کے مخالفین سے متانت کے
 ساتھ بحث کرنا بھی بیکار سمجھا۔ طنز آمیز تمسخر کا پہلو اختیار کیا (کچھ یاد
 کر کے) ہاں ایک بات ہو سکتی ہے۔ سمجھ گیا۔ (پھر قہقہہ مار کر) اکیس بات
 ہے۔ تو میں کہوں گا۔ کہ میونسپل بورڈ بچھیا کے تاوڑوں ہی سے بھری
 ہوئی ہے۔ غالباً اس تمسخر کا منشا ہی کسی نے نہ سمجھا۔ کاشی کی روشن خیال
 حذب۔ معاملہ فہم بورڈ میں ایک شخص بھی ایسا سخن فہم نہ نکلا! سخت
 افسوس ہے۔ جناب آپ کو یقیناً میری جانب سے سخت غلط فہمی ہوئی۔
 معاف کیجئے۔ مجھے آپ کی تجویز سے کامل اتفاق ہے۔
 پدم سنگھ جب یہاں سے چلے تو ان کی طبیعت ایسی شگفتہ تھی۔ گویا
 کسی پُر فضا مقام کی سیر کر کے آئے ہوں۔ کنور صاحب کی شفقت اور
 اخلاق نے انہیں گردیدہ کر لیا تھا۔

————— (۱۳) —————

سدان جب مکان پر پہنچا تو اس کی حالت اُسی آدمی کی سی تھی۔
 جو برسوں کی کمائی لئے۔ دل میں ہزاروں منصوبے باندھتا۔ مسرت سے

بھولا گھر آئے۔ اور یہاں صندوق کھولنے پر اسے اپنی تھیلیاں خلل نظر
آئیں!

خیالات کی آزادی علم صحبت اور تجربہ سے پیدا ہوتی ہے۔ سدان
ان تینوں ارکانوں سے بے بہرہ تھا۔ یہ اُس کی زندگی کا وہ زمانہ تھا جب
ہمیں اپنے مذہبی عقاید پر اپنے معاشرتی رسوم پر ایک غور سا ہوتا
ہے۔ جب ہمیں اُن میں کوئی عیب نہیں نظر آتا۔ جب ہم ان کے خلاف
کوئی دلیل یا اعتراض سُنانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس وقت ہم میں "کیا"
اور "کیوں" کی تمیز نہیں ہوتی۔ سدان کو گھر سے نکل بھاگنا منظور ہوتا بجائے
اس کے کہ وہ اپنے گھر کی مستورات کو گنگا نہلانے لے جائے۔ اگر عورتوں
کی ہنسی کی آواز کبھی مردانے میں سنائی دیتی۔ تو وہ تیور بہ لے گھر میں آتا۔
اور اپنی ماں کو آڑے ہاتھوں لیتا۔ سچدرا کو اپنی ساس کی حکومت بھی
اتنی سخت نہ معلوم ہوتی تھی۔ اخلاقی کمزور لویں کو وہ فلسفی کی قیاض لگاہوں
سے نہیں۔ زاہد کی خشک لگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اس نے دیکھا تھا۔ کہ
اس کے گاؤں کے ایک بٹا کرنے ایک بیڑن گھر میں ڈال لی تھی۔ تو ساسے
گاؤں نے اس کے دروازہ پر آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ اور کچھ اس طرح اس
کے پیچھے پڑے تھے۔ کہ اُسے جبراً و قہراً بیڑن کو گھر سے نکالنا پڑا تھا۔ اس
میں کوئی شک نہیں۔ کہ وہ سمن بائی پر جہن دیتا تھا۔ لیکن اس کے
مذہب میں یہ محبت اتنا ناقابل عفو گناہ نہ تھا۔ جتنا سمن کی پرچھائیں کا
اس کے گھر میں آ جانا۔ اُس نے اب تک سمن کے یہاں پان تک نہ کھایا

تھا۔ وہ اپنی خاندانی نجابت اور مجلسی رسم و رواج کو اپنے ضمیر سے بھی زیادہ
 وقیع سمجھتا تھا۔ اُس ذلت اور رسوائی کا خیال ہی اس کے لئے ناقابل برداشت
 تھا۔ جو ایک خانہ برباد عورت سے قرابت ہو جانے کے باعث اس کے
 خاندان پر نازل ہوتی۔ اس کے مقابلے میں وہ ڈوب کر مرنا اچھا سمجھتا تھا۔
 جنوں سے دل میں پدم سنگھ کی باتیں سُن سن کر بے حد اشتعال ہو رہا تھا۔ وہ
 ڈرتا تھا۔ کہ کہیں والد صاحب اُن کی باتوں میں نہ آجائیں۔ اس کی
 سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ چچا صاحب کو کیا جنون ہو گیا ہے۔ اگر یہی دلیلیں
 اس نے کسی دوسرے آدمی کی زبان سے سنی ہوتیں۔ تو بے محابا اُس کی زبان
 پکڑ لیتا۔ لیکن پدم سنگھ کا وہ بہت لحاظ کرتا تھا۔ اور دل میں پیچ و تاب
 کھا کر رہ جاتا تھا۔ اس وقت اس کے دماغ میں جوانی دلیلوں کا ایک
 طوفان سا اُٹھا ہوا تھا۔ اس کی طبیعت کبھی اتنی جولاں نہ ہوئی تھی۔
 اور اگر یہ مباحثہ دلیلوں ہی تک رہتا۔ تو غالباً وہ ضرور اپنے چچا صاحب
 سے اُلجھ پڑتا۔ لیکن مدن سنگھ کی دست درازی نے اُس کے جذبہ تردید کو
 ہمدردی کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

ادھر سے مایوس ہو کر مدن کا دل بے قرار پھر سمن بائی کی طرف لپکا۔
 لذت نشاط کا چسکا پڑ جانے کے بعد طبیعت کو نہ کنا دشوار تھا۔ وہ پدم سنگھ
 کے ساتھ ہی بنارس چلا آیا۔ لیکن یہاں آکر وہ ایک سخت کشمکش میں مبتلا
 ہو گیا۔ اُسے اندیشہ ہونے لگا۔ کہ کہیں سمن کو ساری حقیقت معلوم نہ ہو
 گئی ہو۔ وہ خود تو وہاں نہ رہی ہوگی۔ ان لوگوں نے ضرور اسے ترک کر دیا

ہوگا۔ لیکن غیر ممکن ہے۔ کہ اُسے شادی کی خبر نہ دی ہو۔ اگر اس پر سب
 حالات روشن ہو گئے ہوں گے۔ تو وہ مجھ سے سیدھے منہ بات بھی
 نہ کہے گی۔ کیا عجب ہے۔ مجھے جھڑک دے۔ لیکن شام ہوتے ہی اُس
 نے کپڑے بدلے۔ گھوڑا کھینچوایا۔ اور دال منڈی کی طرف چلا۔ وصال
 کی دل خوش کن آرزو نے ان شکوک کو زیر کر دیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ سمن
 مجھ سے کیا کہے گی۔ اور میں اُسے کیا جواب دوں گا۔ کہیں اُسے کچھ نہ
 معلوم ہو۔ اور وہ جاتے ہی محبت سے میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہے تم
 بڑے بیوفا ہو۔ تو بڑا مزہ آئے۔ اس تخیل نے اس کے شوق کو اور بھی تیز
 کر دیا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اور ایک لمحہ میں دال منڈی کے سامنے
 جا پہنچا۔ لیکن جس طرح ایک کھلاڑی لڑکا مدرسہ کے دروازے پر آکر اندر
 جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اُسی طرح سدن دال منڈی کے سامنے آکر ٹٹک
 گیا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک ایسے مقام پر آکر کھڑا ہو گیا۔ جہاں سے سمن کا
 بالاخانہ صاف نظر آتا تھا۔ یہاں سے اُس نے نگاہ خوف سے سمن کے
 دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ قفل پڑا ہوا تھا۔ سدن کے
 دل پر سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ یہ بالوسی کامیابی سے بدرجہا اطمینان بخش
 ثابت ہوئی۔ اسے کچھ وہی مسرت ہوئی۔ جو اس آدمی کو ہوتی ہے۔ جو
 جیب میں پیسے نہ رہنے پر بھی لڑکے کی ضد سے مجبور ہو کر کھلونے کی دکان
 پر جائے۔ اور اُسے بند پائے۔

مگر یہ مسرت ناکامی بہت دیر تک قائم نہ رہی۔ سدن جب مکان

پر لوٹا تو بہت اُداس تھا۔ اُسے اپنے دل میں ایک خلا۔ ایک سونا پن جسوس
 ہوتا تھا۔ جیسے کچھ کھو گیا ہو، رات کو جب سب لوگ سو گئے۔ تو وہ چپکے
 سے اُٹھا۔ اور دال منڈی کی طرف چلا، جاڑے کی رات تھی۔ ٹھنڈی ہوا
 چل رہی تھی۔ چاند کُڑے کی آڑ سے جھانکتا تھا۔ اور کسی گھبرائے ہوئے
 آدمی کی طرح تیزی سے دوڑتا چلا جاتا تھا، سدن دال منڈی تک ہوا کی
 طرح آیا۔ پر یہاں آکر پھر اُس کے پیر بندھ گئے۔ اور جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا،
 اُسے خیال آیا۔ کہ اس وقت میرا یہاں آنا نہایت شرمناک ہے۔ سمن کے
 یہاں جاؤں۔ تو وہ مجھے کیا سمجھے گی؟ اس کے نوکر چاکر آرام سے سو رہے
 ہوں گے۔ مجھے کون پوچھتا ہے۔ اُسے تعجب ہوتا تھا۔ کہ میں یہاں کیسے
 چلا آیا۔ میری عقل کہاں چلی گئی تھی، وہ اسی وقت لوٹ پڑا۔
 دوسرے دن شام کو وہ پھر چلا۔ دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ اگر سمن
 نے مجھے دیکھ لیا۔ اور بلایا تو جاؤں گا۔ ورنہ سیدھے اپنی راہ چلا جاؤں گا۔
 اُس کا مجھے بلانا ہی بتلا دے گا۔ کہ اُس کا دل میری طرف سے صاف
 ہے۔ نہیں تو اس افسوسناک واقعہ کے بعد وہ مجھے بلانے ہی کیوں لگی۔
 کچھ دیر اور آگے چل کر اُس نے سوچا۔ کیا وہ مجھے بلانے کے لئے جھروکے
 پر بیٹھی ہو گی؟ اُسے کیا معلوم کہ میں یہاں آگیا۔ نہیں۔ مجھے ایک بار خود
 اس کے پاس چلنا چاہئے سمن کبھی مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتی ماور
 ناراض بھی ہو۔ تو کیا میں اُسے منانہیں سکتا۔ میں اس کے سامنے
 ہاتھ جوڑ دوں گا۔ اس کے پیر پڑوں گا۔ اور اپنے آنسوؤں سے اُس کے

دل کا غبار دھوؤں گا۔ وہ مجھ سے کتنی ہی بیزار ہو پر میری محبت کے نقش کو دل سے مٹا نہیں سکتی۔ آہ! وہ اگر اپنے کنوؤں کی سی آنکھوں میں آنسو بھرے میری طرف تا کے تو میں اس کے لئے کیا کچھ نہ کر ڈالوں گا! اُسے کوئی فکر ہو۔ تو اُس فکر کو دور کرنے کے لئے میں اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔ تو کیا وہ میری اس خطا کو معاف نہ کرے گی؟ لیکن جوں ہی دامنڈی کے مقابل پہنچا۔ اُس کی بے تابیاں اسی طرح غائب ہو گئیں۔ جیسے اپنے گاؤں میں شام کے وقت نیم کے نیچے دیوی کی مورت دیکھ کر اُس کی دیلیں غائب ہو جاتی تھیں۔ اس نے سوچا۔ کہیں وہ مجھے دیکھے اور دل میں کہے۔ وہ جا رہے ہیں۔ کنور صاحب۔ گویا سچ جج کسی ریاست کے مالک ہیں۔ کیسا منکار آدمی ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس کے پیروں میں زنجیر سی پڑ گئی۔ آگے نہ بڑھ سکا۔

اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ دن بھر اُس کی تمنائیں جو بالو کی دیوار کھڑی کرتیں۔ وہ شام کو دال منڈی کے سامنے جاتے ہی حجاب کے صدمہ سے گر پڑتی تھی۔

ایک دن وہ گھومتے ہوئے کوئٹہ پارک جا پہنچا۔ وہاں ایک شامیانہ تناسو اٹھا۔ اور لوگ فریش پر بیٹھے ہوئے پروفیسر رومیش دت کی پڑاؤ تقریر سن رہے تھے۔ سدان گھوڑے سے اُتر پڑا۔ اور بڑے غور سے تقریر سننے لگا۔ اُس کے دل نے فیصلہ کیا بے شک یہ عصمت فروش فرقہ سوسائٹی کے لئے زہر قاتل ہے۔ میں بہت بچاؤ نہ کہیں کا نہ رہتا۔ اسے شہر سے باہر نکال

دینا چاہئے۔ اگر سن بازار میں نہ ہوتی۔ تو میں اس کے دام محبت میں ہرگز نہ پھنستا۔

دوسرے دن وہ پھر کونٹس پارک کی طرف گیا۔ آج وہاں منشی ابو الوفا کی مرضع تقریر ہو رہی تھی۔ سدن نے اُسے بھی غور سے سنا۔ اور اپنے دل میں کہا: بے شک یہ فرقہ بے جا طور پر بدنام ہے۔ ٹھیک تو ہے۔ یہ نہ ہوں۔ تو ہمارے دیوتاؤں کی یاد خیر کرنے والا بھی کوئی نہ رہے۔ یہ بھی سچ ہی کہا کہ بازار حسن ہی وہ مقام ہے۔ جہاں ہندو مسلمان دل کھول کر ملتے ہیں جہاں حسد اور باہمی مخالفت کا گزر نہیں ہے۔ جہاں ہم کارزار ہستی سے دم لینے کے لئے۔ اپنے رنج و غم کو غلط کرنے کے لئے پناہ گزیں ہوتے ہیں۔ یقیناً انہیں شہر سے نکال دینا انہیں پر نہیں۔ ساری آبادی پر سخت ظلم ہو گا۔ کئی دن کے بعد اس کے خیال نے پھر پلٹا کھایا۔ اور یہ سلسلہ بند نہ ہوتا تھا۔ اس میں اپنی ذاتی رائے قائم کرنے کی۔ کسی مسئلہ کے حسن و قبح کے توڑنے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس کا سر ہر ایک پر زور دلیل کے سامنے جھک جاتا تھا۔

اس نے ایک دن پدم سنگھ کی تقریر کا نوٹس دیکھا۔ تین ہی بجے سے چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ اور چار بجے بینی باغ میں جا پہنچا۔ وہاں ابھی کوئی آدمی نہ تھا۔ ہاں کچھ لوگ فرنز بچھا رہے تھے۔ وہ گھوڑے سے اڑا۔ اور فرنز بچھانے میں لوگوں کی مدد کرنے لگا۔ پانچ بجتے بجتے جمع ہونے لگا۔ اور آدھ گھنٹہ میں وہاں ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہو گیا۔ تب اس نے ایک

فٹن پر پدم سنگھ کو آتے دیکھا۔ اس کا سینہ دھڑکنے لگا۔ پہلے مسٹر رستم بھائی نے ایک مختصر سی نظم پڑھی۔ جو خاص اس موقع کے لئے سید تیغ علی نے لکھی تھی۔ ان کے بیٹھنے پر لالہ بھٹل داس کھڑے ہوئے۔ اگرچہ ان کی تقریر دیکھی تھی۔ نہ کہیں لطف زبان تھا۔ نہ پُر مزہ چٹکیاں۔ لیکن ان کی باتوں کو لوگ بڑے غور سے سنتے رہے۔ ان کے بے عرض قومی مشاغل نے پبلک کو ان کا معتقد بنا دیا تھا۔ ان کی خشک اور پھکی تقریر کو لوگ ایسے شوق سے سنتے تھے۔ جیسے پیاسا آدمی پانی پیتا ہے۔ اُن کے پانی کے سامنے دوسروں کا شربت پھیکا پڑ جاتا تھا۔

بالآخر پدم سنگھ اُٹھے۔ سدن کے سینے میں گدگدی سی ہونے لگی۔ گویا کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے۔ تقریر نہایت دلاویز اور جذباتی درجہ سے پڑھتی۔ زبان کی سلاست اور لطافت دلوں پر تسخیر کا عمل کر رہی تھی۔ موقع موقع پر ان کا طرز بیان اتنا مؤثر ہو جاتا تھا۔ کہ سدن کے روئیں کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ہم نے اس اخراج کی تجویز اس لئے نہیں کی ہے۔ کہ ہمیں ان عورتوں سے نفرت ہے۔ ہمیں اُن سے نفرت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ ان کے ساتھ سخت بے انصافی ہوگی۔ یہ ہماری ہی ہوس رانیاں۔ ہماری ہی تمدنی بُرائیاں۔ ہماری ہی مذموم رسم و رواج ہیں۔ جنہوں نے یہ مجسم صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ بازارِ حسن ہماری پُر داغ معاشرت کا عکس۔ ہمارے ہی شیطانی نگراہیوں کی زندہ تصویر ہے۔ ہم کس منہ سے انہیں حقیر سمجھیں؟ اُن کی حالت

واقعی قابلِ رحم ہے۔ ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم انہیں راہِ راست پر لائیں۔
اُن کی اصلاح کریں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب وہ شہر سے باہر
مکرہات اور ترغیبات سے دور ہیں۔

سدن ہمہ تن گوش ہو کر یہ تقریر سنتا رہا۔ جب اس کے قریب کے
آدمی تقریر کی تعریف کرتے۔ بیچ بیچ میں تالیاں بجنے لگتیں۔ تو اس کا
دل خوشی سے متوالا ہو جاتا تھا۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ کہ
حاضرین ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اُن میں زیادہ وہ لوگ
تھے۔ جو اربابِ نشاط کی مذمت اور ان کے ناز برداروں کی ہجو سننے
کے لئے آئے تھے۔ انہیں پدم سنگھ کی یہ رواداری بے موقع معلوم ہوتی
تھی۔ پبلک بٹھل داس کی معتقد تھی۔ یا منشی ابوالوفا کی۔ پدم سنگھ کی
مصاحبت اندیشی اُسے قائل نہ کر سکتی تھی۔ وہ ندی کے اُس پار رہنا
چاہتی تھی۔ یا اس پار بیچ میں رہنا اُسے منظور نہ تھا۔

— (۱۴) —

سدن کو تقریروں کی ایسی چاٹ پڑی۔ کہ جہاں کہیں کسی تقریر کے
ہونے کی خبر پاتا دھال ضرور جاتا۔ دونوں طرف کی دایوں کو مہینوں
تک متواتر سننے اور ان پر غور کرنے سے اس میں اپنی رائے قائم
کرنے کی قابلیت پیدا ہونے لگی۔ اب وہ کسی دلیل کی جدت پر فریفتہ
نہ ہو جاتا تھا۔ بلکہ ثبوتوں کے حق و باطل کا فیصلہ کرنے کی کوشش

کرتا تھا۔ آخر اُسے تجربہ ہونے لگا۔ کہ بیشتر تقریریں محض رنگین الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ اُن میں حقیقی جوہر یا تو ہوتے ہی نہیں۔ یا وہی پُرانی باتیں نئی نئی صورتوں میں پیش کی جاتی ہیں۔ اس میں مبصرانہ نگاہ پیدا ہوتی۔ وہ اپنے چچا کا ہم خیال ہو گیا۔

لیکن ثقافتِ عمر سے اس کی تنقیدیں نہایت تعصب آمیز اور سخت ہوتی تھیں۔ اس میں اتنی سرچشمی نہ تھی۔ کہ وہ مخالفین کی نیکی نیتی کا قائل ہوتا۔ اسے یقین تھا۔ کہ جو حضرات اس تجویز کی مخالفت کر رہے ہیں۔ وہ سبھی عیش و نشاط کے غلام ہیں۔ ان خیالوں کا اُس پر اتنا اثر پڑا۔ کہ اُس نے دال منڈی کی طرف جانا چھوڑ دیا۔ اب وہ کسی طوائف کو پارک میں فٹن پر سیر کرتے یا ٹہلتے دیکھ لیتا۔ تو اُسے ایسا غصہ آتا تھا۔ کہ جا کر اُسے بھگا دوں۔ اس کا بس چلتا۔ تو اس وقت وہ دال منڈی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔ اس وقت ناز کرانے اور دیکھنے والے دونوں ہی اُس کی نظریں دنیا کی ذلیل ترین مخلوق تھے۔ وہ انہیں اکیلے پا جاتا۔ تو شاید ان کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتا۔ اگرچہ ابھی تک اس کے دل میں شکوک تھے۔ لیکن اس تجویز کے مفید ہونے میں اسے مطلق شبہ نہ تھا۔ اس لئے وہ ان شکوک کو مخفی رکھنا ہی مناسب سمجھتا تھا۔ کہ کہیں اُن کو ظاہر کرنے سے اُس کا پہلو کمزور نہ ہو جائے۔ سمن اب بھی اُس کے دل میں بسی ہوئی تھی۔ اُس کے دیدار کی تمنا اب بھی اسے بیتاب کرتی رہتی تھی۔ سمن کا حسن ملیح اس کی نظروں سے کبھی نہ اترتا

تھا۔ ان خیالات سے بچنے کے لئے اس نے اکیلے بیٹھنا ترک کر دیا۔
 علی الصباح گنگا نہانے چلا جاتا۔ رات کو دس بجے تک اخبار اور
 کتابیں پڑھا کرتا لیکن اتنی بندشوں پر بھی سمن اس کی یاد سے نہ اُترتی
 تھی۔ وہ طے طرح کے بھیس بدل کر اس کی نگاہ باطن کے سامنے آتی۔
 اور کبھی اسے منانی۔ کبھی شوق سے اس کے گلے میں باہیں لٹالتی پریم
 سے مسکراتی، دفعتاً سدن ہوشیار ہو جاتا۔ جیسے کوئی مہینہ سے چونکے
 اور ان شورش انگیز تخیلات کو ہٹا کر سوچنے لگتا۔ آج کل چچا صاحب
 اتنے اداس کیوں ہیں؟ کبھی سنتے نہیں نظر آتے جیتن اُن کے
 لئے روز دوائیں کیوں لاتا ہے؟ آخر انہیں کیا ہو گیا ہے۔ اتنے میں
 سمن پھر اس کے خانہ دل میں آجاتی۔ اور با چشم پُر آب کہتی: سدن تم
 سے ایسی اُمید نہ تھی۔ تم سمجھتے ہو۔ کہ یہ ایک بازاری عورت ہے۔ لیکن
 میں نے تمہارے ساتھ کوئی دغا نہیں کیا۔ اپنا سرمایہ الفت تمہیں پیش
 دیا۔ کیا تمہاری نگاہ میں اس کی ذرا بھی وقعت نہیں ہے؟ سدن
 پھر چونک پڑتا۔ اور پھر خیال کو ہٹانے کی کوشش کرتا۔ اس نے ایک
 تقریر میں سنا تھا۔ کہ انسان خود اپنی زندگی کا معمار ہے۔ وہ اپنے تعین
 جیسا چاہے ویسا بنا سکتا ہے۔ اس کا راز یہی ہے۔ کہ گندے اور
 محض اخلاق خیالات دل میں نہ آنے پائیں۔ وہ بزور ان خیالات
 کو دباتا رہے۔ اور پاکیزہ خیالات سے دل کو معمور رکھے۔ سدن
 اس اصول کو ایک دم کے لئے بھی فراموش نہ کرتا تھا۔ اسی تقریر میں

اس نے یہ بھی سنا تھا۔ کہ زندگی کو اعلیٰ بنانے کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت
 نہیں۔ صرف پاکیزہ خیالات اور محسوسات کی ضرورت ہے۔ اس لئے
 وہ تزکیہ نفس کی سعی میں مصروف رہتا تھا۔ ہزاروں آدمیوں نے اس کی
 تقریریں سنا تھا۔ کہ ہر ایک مگر وہ خیال ہماری اس زندگی ہی کو نہیں بلکہ
 آنے والی زندگی کو بھی خراب کر دیتا ہے۔ لیکن جو زیادہ عقیل تھے۔ وہ اس کے
 بھول گئے۔ سادہ دل سدن نے سنا۔ اور اُسے گانٹھ میں باندھ لیا۔
 جیسے کوئی غریب آدمی ایک اشرفی پا جائے۔ اور اسے جان سے
 زیادہ عزیز رکھے۔ آج کل سدن تہذیب نفس کی دُھن میں لگا رہتا
 تھا۔ راستہ میں اگر اس کی نگاہ کسی عورت پر پڑ جاتی۔ تو وہ فوراً اپنے تئیں
 ملامت کرتا۔ اور دل کو سمجھاتا۔ کہ تو ایک لمحہ کی لطف دید کے لئے
 اپنی مستقبل زندگی کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ اس تنبیہ سے اس کے
 دل کو ایک خاص تقویت ہوتی تھی۔

ایک دن گنگا نشان کو جاتے ہوئے سدن کو چوک میں طوائفوں
 کا ایک جلوس دکھائی دیا۔ شہر کی سب سے ممتاز طوائف نے عرس کیا
 تھا۔ یہ جلوس وہاں سے واپس آ رہا تھا۔ سدن نے حسن اور آرائش اور
 بانگیں کی ایسی بہار کبھی نہ دیکھی تھی۔ ریشم۔ رنگ۔ اور رونق کا ایسا دلکش
 نظارہ۔ نکھار اور نفاست۔ طنازی اور عنائی کا ایسا سرور انگیز ہنگامہ
 اس کے لئے بالکل نواکھا تھا۔ اُس نے اپنے اوپر بہت ضبط کیا۔
 پر بے سود۔ اُس نے حسن کے ان نورانی پیکروں کو ایک بار آنکھ

بھر کر دیکھا۔ جیسے کوئی طالب علم مہینوں کی ریاضت شاقہ کے بعد
امتحان سے فارغ ہو کر سیر مناظر میں محو ہو جائے۔ ایک نگاہ سے
اُسے تسکین نہ ہوئی۔ اس نے پھر نظر ڈالی۔ یہاں تک کہ اُس کی نگاہیں
پھر اسی طرف جم گئیں۔ گویا کسی نے انہیں زنجیر سے باندھ دیا ہو + وہ
راستہ چلنا بھول گیا۔ اور مدہوشی کے عالم خاموشی میں نقش دیوار بنا
کھڑا رہا۔ جب جلوس گزر گیا۔ تو اسے ہوش آیا۔ چونکا۔ اور اپنے اوپر فرین
کرنے لگا۔ میں نے مہینوں کی کمائی ایک لمحہ میں گنوا دی۔ اپنے نفس کو
کتنا پامال کر دیا۔ میں کتنا ضعیف ہوں۔ لیکن پھر اس نے اپنے تشیں سمجھایا
کہ محض نظارہ حسن سے میں گناہ کا مرتکب تھوڑا ہی ہو سکتا ہوں۔
میں نے انہیں نگاہ بد سے نہیں دیکھا۔ میرا دل فسق سے پاک تھا۔
باغبان قدرت کی گلکاریوں سے پاک لطف اٹھانا بھی ایک ذریعہ
عبادت ہے!

یہ سوچتے ہوئے وہ آگے چلا۔ لیکن اس کی روح کو تسکین نہ
ہوئی۔ میں اپنے ہی کو دھوکا دینا چاہتا ہوں! یہ تسلیم کر لینے میں کیا
قباحت ہے۔ کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ ہاں ہوئی اور ضرور ہوئی۔
لیکن میں اپنے دل کی موجودہ حالت کے اعتبار سے اسے معافی
کے قابل سمجھتا ہوں۔ میں ولی نہیں۔ زاہد نہیں۔ سنیاسی نہیں ایک
ضعیف العقل آدمی ہوں۔ اتنا اونچا معیار پیش نگاہ رکھ کر میں اس
پر عمل نہیں کر سکتا۔ آہ! حسن بھی کیا چیز ہے! لوگ کہتے ہیں نفس پرستی

سے چہرہ کی رونق غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن ان حسینوں کی نفس پرستی ان کے حُسن کو اور بھی دو بالا کرتی ہے۔ چہرہ کو دل کا آئینہ کہتے ہیں۔ یہ بھی لغو ہے۔

سَدن نے پھر دل کو سنبھالا۔ اور اُسے اس طرف سے منحرف کرنے کے لئے اس معاملہ کے دوسرے پہلو پر غور کرنے لگا۔ ہاں عیوب ہیں بہت ہی حسین ہیں۔ بہت ہی نازک بدن۔ لیکن انہوں نے اُن پاک نعمتوں کا کتنا بیجا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے اپنی روح کو کتنا نیچے گرا دیا ہے۔ محض ان ریشمی کپڑوں کے لئے ان جگہ گاتے ہوئے نرلوں کے لئے انہوں نے اپنی عصمت جیسی بے بہا جنس بیچ ڈالی ہے۔ وہ آنکھیں جن سے خلوس الفت کی شعاعیں نکلتی چاہئے تھیں۔ شوحی۔ شرارت اور نفسانیت سے بڑھ رہی ہیں۔ وہ دل جن میں خالص پاک محبت کا پشمہ رواں ہونا چاہئے تھا۔ کتنے متعفن اور زہریلی غلاظت سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ کتنا افسوسناک نظارہ ہے!

ان نفرت انگیز خیالوں سے سَدن کو کچھ تشکین ہوئی۔ وہ ٹھٹھکتا ہوا گنگا کے کنارے پہنچا۔ اس اُدھیڑ میں آج اُسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ اس گھاٹ پر نہ گیا۔ جہاں وہ معمولاً بسایا کرتا تھا۔ وہاں بھیڑ ہو گئی ہوگی۔ چنانچہ وہ اس گھاٹ پر گیا۔ جو بدھو آشرم سے ملحق تھا۔ وہاں ساٹھ تارہتا تھا۔ دور ہونے کے باعث شہر کے لوگ

دہاں کم جاتے تھے۔

گھاٹ کے قریب پہنچا۔ تو سدن کو گھاٹ کی طرف سے ایک عورت آتی ہوئی دکھائی دی۔ فوراً پہچان گیا۔ یہ سمن تھی۔ پر اس کی صورت کتنی متغیر ہو گئی تھی! نہ وہ لمبے لمبے سیاہ گیسو تھے۔ نہ وہ تن نازک۔ نہ وہ سنہتے ہوئے گلاب کے سے ہونٹ۔ نہ وہ رقیق اور مست آنکھیں۔ نہ وہ آرائش اور سنگار۔ نہ وہ مریض زلیوروں کی بہار۔ وہ محض ایک سفید ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اس کی رفتار میں متانت تھی۔ اور بشرہ سے مایوسی اور حسرت جھلک رہی تھی۔ داستان وہی تھی۔ لیکن استعارات سے پاک۔ اور اس لئے زیادہ سلیس اور پُر تاثیر۔ اُسے دیکھتے ہی سدن و فور شوق سے کئی قدم خوب تیز چلا۔ پر اس کی یہ کایا پلٹ دیکھی۔ تو ٹھٹک گیا۔ گویا اُسے پہچاننے میں غلطی ہوئی۔ گویا یہ سمن نہیں کوئی دوسری عورت ہے۔ اس کا جوش محبت دھیمّا پڑ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ یہ تغیر کیوں ہو گیا۔ اس نے پھر سمن کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کی طرف تاک رہی تھی لیکن اُس کی نگاہ میں جذبہ شوق کے بجائے ایک بیدلی تھی۔ گویا وہ پھلی باتوں کو یا تو بھول گئی ہے۔ یا بھولنا چاہتی ہے۔ گویا وہ دبی ہوئی آگ کو ابھارنا نہیں چاہتی۔ سدن کو ایسا کمان ہوا۔ کہ وہ مجھے خود غرض۔ مکار۔ اور بے وفا سمجھ رہی ہے۔ اس نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا۔ یہ یقین کرنے کے لئے کہ میرا کمان غلط تو

نہیں ہے۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ پر ملتے ہی ہٹ گئیں۔ سدن
 کو اپنے گمان کا یقین ہو گیا۔ اور اس یقین کے ساتھ ہی اس کے دل
 میں غرور کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے تنہیں دھتکارا۔ ابھی ابھی میں
 نے اپنے دل کو اتنا سمجھایا ہے۔ اور اتنی ہی دیر میں پھر انہیں ہیودہ
 خیالات میں پڑ گیا۔ افس نے پھر سمن کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ سر
 جھکائے اس کے سامنے سے نکل گئی۔ سدن نے دیکھا۔ کہ اس
 کے پیر کاٹ رہے تھے۔ لیکن وہ جگہ سے نہ ہلا۔ کسی قسم کا اشارہ نہ کیا۔
 اپنے خیال میں اس نے سمن پر ثابت کر دیا۔ کہ اگر تم مجھ سے ایک کوس
 بھاگو گی۔ تو میں تم سے سو کوس بھاگنے پر تیار ہوں۔ پر اسے یہ
 دھیان نہ رہا۔ کہ میں اپنی جگہ پر صورت تصویر کھڑا ہوں۔ جن
 جذبات کو اس نے پوشیدہ رکھنا چاہا۔ خود انہیں جذبات کی تصویر
 بن گیا۔ جب سمن کچھ دور نکل گئی۔ تو وہ لوٹ پڑا۔ اور اس کے
 پیچھے پیچھے اپنے تنہیں چھپاتا ہوا چلا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا۔ کہ سمن
 کہاں جاتی ہے۔ حزم نے خواہشات کے سامنے سر جھکا لیا تھا۔

حزیم (۱۵) حزم

جس دن سے بارات لوٹ گئی۔ اسی دن سے پنڈت بکشن چند
 پھر گھر سے باہر نہیں نکلے۔ افسردہ خاطر اپنے کمرہ میں بیٹھ رہتے
 انہیں اب کسی کو اپنا منہ دکھاتے ہوئے حزم آتی تھی۔ سمن نے

انہیں دنیا کی نظروں میں چاہے کم کر آیا ہو۔ لیکن اپنی ہی نظر میں وہ
 کہیں کے نہ رہے تھے۔ وہ اس رسوائی کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔
 وہ تین سال قید رہے۔ لیکن اپنی نگاہ میں اس قدر نیچے نہ گرے تھے۔
 وہاں انہیں اس خیال سے تسکین ہوتی تھی۔ کہ یہ میری بد اعمالیوں
 کی سزا ہے۔ لیکن اس داغ سیاہ نے ان کے غرور کو پاہل کر دیا۔ وہ
 اب اُن رذیل آدمیوں کے پاس بھی نہ جاتے تھے۔ جن کے ساتھ بیچ
 کر گانجہ اور چرس کے دم لگایا کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے۔ کہ میں اب
 اُن سے بھی نیچے گر گیا ہوں۔ انہیں معلوم ہوتا تھا۔ کہ ساری دنیا
 میں میری بدنامی ہو رہی ہے۔ لوگ کہتے ہونگے۔ کہ اس شخص کی لٹل
 یہ خیال آتے ہی وہ غیرت اور رنج کے اٹھانہندی میں
 ڈوبنے لگتے تھے۔ ہائے اگر میں جانتا۔ کہ میں لوں خاندان میں داغ
 لگائے گی۔ تو میں نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا۔ یہ میں جانتا ہوں
 کہ وہ عورات تھیں کسی بڑے گھر میں رہنے کے قابل تھیں۔ سامان معیش
 اور نمود پر جان دیتی تھیں۔ لیکن میں نہ جانتا تھا۔ کہ اس کا ضمیر اتنا کمزور
 ہے۔ دنیا میں ایسا کون خوش نصیب ہے جس کے سب دن برابر
 ہو جاتے ہوں؟ مصیبت سبھی پر آتی ہے۔ بڑے بڑے متمول
 گھرانوں کی عورتیں روٹی کپڑے کو محتاج ہو جاتی ہیں۔ پر کوئی ان
 کے چہرہ پر شکن تک نہیں دیکھ سکتا۔ وہ رو رو کر دن کاٹتی ہیں۔
 یہ کیا مجال کہ کوئی ان کی بھینگی ہوئی آنکھیں دیکھ لے۔ وہ سر جاتی

ہیں۔ لیکن کسی کا احسان سر پر نہیں لیتیں کسی کے سامنے اپنا دکھڑا نہیں
 رو تیں۔ وہ دیویاں ہیں۔ خاندان کے نام پر جیتی ہیں۔ اور اُسی کے نام پر
 مرجاتی ہیں۔ پر یہ بد نصیب یہ بے غیرت۔۔۔۔۔ اور اُس کا شوہر کیسا
 نالائق ہے۔ کہ اس کا سر نہیں کاٹ لیا جس وقت اُس نے گھر سے
 باہر پاؤں نکالے۔ اُس نے کیوں اس کا گلا نہیں دبا دیا۔ معلوم ہوتا
 ہے۔ وہ بھی بے حیا۔ بد کردار۔ نامراد آدمی ہے۔ اس میں اپنے خاندانی
 وقار کا لحاظ ہوتا۔ تو یہ نوبت نہ آتی، اُسے اپنی رسوائی کی شرم نہ ہوگی۔
 پر مجھے ہے۔ اور اس کی سزا سن کر کوئلے کی۔ جن ہاتھوں سے اُسے پالا۔
 کھلایا۔ انہیں ہاتھوں سے اس کی گردن پر تلوار چلاؤں گا۔ یہی آنکھیں
 کبھی اس کی خوش فعلیوں پر خوش ہوتی تھیں۔ اب وہ اُسے خون میں
 تڑپتے دیکھ کر شاد ہوئی۔ مٹی ہوئی آبرو کو بجال کرنے کی اس کے سوا کوئی
 تدبیر نہیں ہے۔ دنیا کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ خاندانی تنگ و ناموس
 پورنے والے بیجیائیوں کی کیا سزا دیتے ہیں!

یہ فیصلہ کر کے کرشن چندر اس تملک ارادہ کو پورا کرنے کے وسائل
 پر غور کرنے لگے جیل خانہ میں انہوں نے مجرموں سے قتل اور خون کے
 کتنے ہی منتر سیکھے تھے۔ شب و روز انہیں باتوں کے چرچے رہتے تھے
 انہیں سب سے بہتر ہی صورت معلوم ہوئی۔ کہ چل کر اُسے تلوار سے
 ماروں۔ اور تب خود پولیس کو اس کی اطلاع کر دوں۔ مجسٹریٹ کے
 روبرو میرا جو بیان ہوگا۔ اُسے سن کر لوگوں کی آنکھیں کھلی جائیں گی!

دل میں اس نشہ خون سے مست ہو کر وہ اپنا بیان مرتب کرنے لگے۔ پہلے مہذب جماعت کی ہوس پروری کا ذکر کروں گا۔ تب پولیس کے ہتھکنڈوں کی قلعی کھولوں گا۔ اس کے بعد رسم قرار دار اور جہیز پر ایسی ایسی چوٹیں کروں گا۔ کہ سینے والے دنگ رہ جائیں گے۔ لیکن سب سے معرکتہ الآرا اظہار کا وہ حصہ ہو گا۔ جس میں ثابت کروں گا۔ کہ اپنی بھیمتی کے حقیقی باعث ہم خود ہیں۔ ہم اپنی کم ہمتی سے۔ جان کے ڈر سے۔ رسوائی کے خوف سے۔ اولاد کی جھوٹی محبت سے اپنی بے شرمی سے اپنے حفظ وقار کی نا اہلیت سے ایسی ناشائستگیوں کو چھپاتے ہیں۔ ان پر پردہ ڈالتے ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ سفلہ طبیعتیں اس قدر میاں ہو گئی ہیں۔

کرشن چندر نے یہ عزم تو کر لیا۔ لیکن ابھی تک یہ نہ سوچا تھا۔ کہ شائستگی کیا گت ہوگی، غیرت نے ان کے دل میں اور کسی فکر کے لئے جگہ ہی نہ باقی رکھی تھی۔ ان کی حالت اس آدمی کی سی تھی۔ جو اپنے لخت جگر کو بستر مرگ پر چھوڑ کر اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ جو ڈونگی پر بیٹھا ہوا پانی میں ایک سانپ دیکھ اس کی طرف چھپٹے۔ اور اسے یہ خیال نہ رہے کہ اس جھوٹے سے ڈونگی ڈوب جائے گی۔

شام کا وقت تھا۔ کرشن چندر نے آج قصد خون کر لیا تھا۔ اس وقت ان کی طبیعت کچھ مضطرب تھی۔ یہ وہ اندر دگی تھی جو کسی

خونناک کام کرنے کے قبل دل پر مستولی ہو جاتی ہے۔ کئی دنوں تک
 غصہ و غم کے جنون میں رہنے کے بعد اس وقت اُن کے دل پر جمود
 کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ جیسے ہوا کچھ دیر تک تیزی سے چلنے کے
 بعد دھیمی پڑ جاتی ہے۔ کرشن چندر کو وہ دن یاد آ رہے تھے۔ جب ان
 کی زندگی کلفت و کاوش سے آزاد تھی۔ جب وہ روزِ شام کے وقت
 اپنی دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے کر سیر کو نکلتے تھے۔ کبھی سمن کو گود میں
 لیتے۔ کبھی شانتا کو۔ جب وہ گھر لوٹتے۔ تو گنگا جلی کس طرح شوقِ محبت
 سے مسرور ہو کر دونوں لڑکیوں کو پیار کرنے لگتی تھی، یادِ مسرتِ لطف
 مسرت سے زیادہ دلپذیر ہوتی ہے۔ وہی جنگل اور پہاڑ جو کبھی آپ کو
 سُنانا اور یہ طرِ معلوم ہوتے تھے۔ وہی ندیاں اور جھیلیں جن کے
 کنارہ سے آپ آنکھیں بند کئے نکل جاتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد
 نہایت دلکش اور خوش آئند صورتیں اختیار کر کے آپ کی نگاہ یاد
 کے سامنے آتے ہیں۔ اور پھر انہیں مناظر کی سیر کی تمنا آپ کے دل
 میں موج زن ہو جاتی ہے۔ کرشن چندر پر ایامِ گزشتہ کی یاد کرتے
 کرتے رقت طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔

انسوس! اس پُر مسرت زندگی کا ایسا غم ناک انجام ہو رہا ہے! میں
 ہی ہاتھوں سے اپنی گود کی کھلی ہوئی لڑکی کا خون کرنے پر آمادہ ہو
 رہا ہوں۔ دفعۃً کرشن چندر کو سمن پر رحم آیا۔ وہ غریب نادانی سے
 کنوئیں میں گر پڑی ہے۔ کیا میں ایسا بے رحم ہو جاؤں۔ کہ اوپر سے

اُس پر پتھر پھینکواں؛ لیکن یہ رحم اُن کے دل میں دیر تک نہ قائم
 رہا۔ جُوہنی اُنہیں خیال آیا۔ کہ اس کا دروازہ آج سب کے لئے
 کھلا ہے۔ ہندو مسلمان آج وہاں بے تکلف داخل ہو سکتے ہیں۔ ان کا
 احساس شرم پھر تازہ ہو گیا آتش غضب پھر دہک اُٹھی؛
 اسی اثنا میں پنڈت اماناتھ اُن کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ اور
 بوئے میں وکیلوں کے پاس گیا تھا۔ ان کی صلاح ہے کہ مقدمہ دائر
 کرنا چاہئے؛

کرشن چندر نے چونک کر پوچھا: کیسا مقدمہ؟
 اماناتھ۔ انہیں لوگوں پر جو دروازہ سے بارات لوٹا لے گئے؛
 کرشن چندر۔ اس سے کیا حاصل؟
 اماناتھ۔ اس سے یہ ہو گا۔ کہ یا تو وہ پھر لڑکی سے شادی کریں گے
 یا ہرجانہ دیں گے؛

کرشن چندر۔ لیکن کیا بدنامی اور زیادہ نہ ہوگی؟
 اماناتھ۔ بدنامی جو کچھ ہونی تھی ہو چکی۔ اب کس بات کا ڈر۔
 میں نے ایک ہزار روپے تیلک میں دئے۔ چار پانچ سو روپے تو وضع و
 تکریم میں خرچ کئے۔ یہ سب کیوں چھوڑ دوں؟ یہی روپے کسی اچھے
 کل کے آدمی کو دے دوں گا۔ تو وہ خوشی سے شادی کرنے پر تیار ہو
 جائے گا۔ ذرا ان روشن خیال حضرات کی قلعی تو کھلے؛
 کرشن چندر نے لمبی سانس بھر کر کہا۔ پہلے مجھے زہر دیدو۔ تب

مقدمہ دائرہ کردہ

اُمانا تھ نے چڑھ کر کہا "آپ کیوں اتنا ڈرتے ہیں؟"
 کرشن چندر تم نے مقدمہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے؟
 اُمانا تھ۔ ہاں میں نے پورا ارادہ کر لیا ہے۔ کل سارے شہر
 کے بڑے بڑے وکیل بیرسٹر جمع تھے۔ یہ مقدمہ اپنے ڈھنگ کا زالا
 ہے۔ اُن لوگوں نے بہت کچھ دیکھ بھال کر یہ مشورہ دیا ہے دو وکیلوں
 کو بیعانہ تک دے آیا ہوں؟
 کرشن چندر نے مایوسانہ انداز سے کہا "اچھی بات ہے۔ دائرہ
 کر دو؟"

اُمانا تھ۔ آپ کو اس کا اس قدر ملال کیوں ہے؟
 کرشن چندر۔ جب تم خود ہی نہیں سمجھتے۔ تو میں کیا بتاؤں۔ جو
 بات ابھی تک صرف قرب و جوار کے موضوعوں میں پھیلی ہوئی ہے۔
 وہ سارے شہر میں پھیل جائے گی۔ سن منور ہی اجلاس پر بلائی جائیگی۔
 میرا نام گلی گلی کے گاہ

اُمانا تھ۔ اب اس سے کہاں تک دوڑوں؟ مجھے بھی تو اپنی
 دونوں لڑکیوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ یہ کلنک اپنے ماتھے پر لگا رہنے دلا
 تو اُن کی شادی میں رخصت نہ پیدا ہوگا؟
 کرشن چندر۔ تو یہ مقدمہ تم اس لئے دائرہ کر رہے ہو جس میں تمہارے
 نام پر کوئی داغ نہ رہے؟

اُماناٹھ نے پُرخور لہجہ میں کہا: ہاں اگر آپ اس کے یہ معنے نکالتے ہیں۔ تو یہی سہی۔ بارات میرے ہی دروازے سے لوٹی ہے۔ لوگوں کا یہ گمان ہو رہا ہے۔ کہ سمن میری ہی لڑکی ہے۔ سارے شہر میں مجھی پر انگلیاں اٹھ رہی ہیں۔ میرا دعویٰ دس ہزار کا ہو گا۔ اگر پانچ ہزار کی بھی ڈگری ہو گئی۔ تو شانتا کی شادی کسی اچھے خاندان میں ہو جائیگی۔ آپ جانتے ہیں۔ جھوٹی چیز کھانے کے لئے مٹھاس کی ضرورت ہے جب تک روپوں کی گٹھری نہ دی جائے گی۔ شانتا کی شادی کیونکر ہو گی؟ ایک طرح سے میرے خاندان میں داغ لگ گیا۔ پہلے چولوگ مجھ سے ناتا کرنے میں اپنا فخر سمجھتے تھے۔ وہ اب لمبی نقیلی کے بغیر سیدھے منہ بات بھی نہ کریں گے۔ معاملہ کی یہ صورت ہے۔ مجھے روپیوں کی بجد ضرورت ہے۔ اور اتنے روپوں کے ہاتھ آنے کی دوسری کوئی تدبیر نہیں ہے۔

کرشن چندر۔ اچھی بات ہے مقدمہ دائر کر دو۔
اُماناٹھ چلے گئے۔ تو کرشن چندر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ یا
الہ! اب مجھے اٹھا لو۔ یہ ذلت نہیں سہی جاتی۔ آج انہیں اپنی
ناموسی کا حقیقی احساس ہوا۔ انہیں معلوم ہوا۔ کہ سمن کے خون
سے یہ داغ نہیں جھٹ سکتا۔ اسی طرح جیسے سانپ کو مارنے سے
اُس کا زہر نہیں اُترتا۔ اس کا خون کمنے سے رسوائی کے سوا اور
کیا ہو گا؟ پولیس گرفتار کرے گی۔ جینوں ادھر ادھر بار بار اٹھوں گا۔

اور اتنی ذلت و خواری کے بعد پھانسی پر چڑھا دیا جاؤں گا۔ اس سے
 تو کہیں بہتر ہے۔ کہ ڈوب مروں۔ اس چیلنج کو گل کر دوں۔ جس کی
 روشنی میں یہ خوفناک مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ ہائے بد نصیب
 سمن بے چاری شاننا کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبی۔ اس کی زندگی
 تباہ کر دی۔ الیشور اب تمہیں اس کا نباہ کر سکتے ہو۔ اب اس غریب
 لڑکی کا ہمارے سوا اور کوئی دستگیر نہیں۔ صرف مجھے یہاں سے
 اٹھائے چلو۔ کہ ان آنکھوں سے اُس کی مصیبت نہ دیکھوں!
 کھوڑی دیر میں شاننا کرشن چندر کو کھانا کھانے کے لئے بلانے
 آئی۔ شادی کے دن سے آج تک کرشن چندر نے اُسے نہیں دیکھا
 تھا۔ اس وقت انہوں نے اُسے دردناک نظروں سے دیکھا۔ دھندلے
 چراغ کی طرح روشنی میں انہیں اُس کے چہرہ پر ایک غیر فطری شگفتگی
 نظر آئی۔ اُس کی آنکھیں پاکیزہ روحانیت سے لبریز تھیں۔ رنج و
 غم کی جھلک تک نہ تھی۔ جب سے اس نے سدن کو دیکھا تھا۔
 اسے اپنے دل میں ایک مسرت انگیز تقویت کا احساس ہوتا تھا۔
 اُس میں خود داری کی ایک شان پیدا ہو گئی تھی۔ اپنی حمانی سے پہلے
 وہ سیدھے منہ بات نہ کرتی تھی۔ پر آج کل گھنٹوں بیٹھے اس کے پیر
 دبایا کرتی۔ اپنی ممیری بہنوں سے اب اُسے ذرا بھی حد پار شک
 نہ تھا۔ وہ اب ہنس ہنس کر کنوئیں سے پانی نکالتی۔ چکی پیسنے میں
 اب اسے سچی خوشی ہوتی تھی۔ اس کی زندگی میں محبت کی گلکاریاں

شروع ہو گئی تھیں۔ سدن اُسے نہ ملا۔ پرسدن سے بدرجہا بہتر چیز مل گئی۔
یہ سدن کی محبت تھی۔

کرشن چندر شانتا کی بشارت پر متحیر ہی نہیں۔ خائف ہو گئے۔
انہیں لگتا ہوا۔ کہ اس درد جانگزا نے خوف ناک صورت
اختیار کی ہے۔ اس کی طرف خطا و ارتکا ہوں سے دیکھ کر بولے۔
شانٹا ہے۔

شانٹا نے اُس کی طرف پُر سوال آنکھوں سے دیکھا۔
کرشن چندر کا گلا بھر آیا۔ بولے۔ آج چار سال سے میری زندگی کی
کشتی بھنور میں پڑی ہوئی ہے۔ اس حالت میں بھی مجھے اُمید تھی۔ کہ
شاید کبھی کنارے پر پہنچ جاؤں۔ لیکن اب اپنی اولاد کی مصیبتیں
نہیں دیکھی جاتیں۔ میں اس کشتی سے اب لہروں میں کودتا ہوں۔
میں جانتا ہوں۔ کہ یہ سب میری ہی ناقصیت اندیشیوں کے نتیجے
ہیں۔ اگر میں پہلے سے ہشیار ہو جاتا۔ تو آج تم لوگوں کی یہ حالت
نہ ہوتی۔ پر اب پچھتانے سے کیا فائدہ! اگر کبھی ابھاگنی سمن سے
تمہاری ملاقات ہو جائے۔ تو کہہ دینا۔ کہ میں نے اسے معاف کیا۔
اُس نے جو کچھ کیا۔ اس کا الزام میری گردن پر ہے۔ آج سے دو دن قبل
تک میں اسے قتل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ پر ایشور نے مجھے اس گناہ
سے بچا لیا۔ اس سے کہہ دینا۔ کہ وہ اپنے کو نہ نصیب باپ اور
مال پر رحم کرے۔

یہ کہتے کہتے کرشن چندر روک گئے۔ شاننا خاموش کھڑی تھی۔ اُسے
اپنے باپ کی حالت پر درد آتا تھا۔ ایک لمحہ کے بعد کرشن چندر پھر
بولے بیٹی۔ میں تم سے ایک التجا کرتا ہوں۔
شاننا کہنے لگا کیا حکم ہے؟
کرشن چندر۔ یہی کہ صبر کو مت چھوڑو۔ یہ منتر بُرے سے
بُرے وقت پر بھی تمہیں سنبھالتا رہے گا۔
شاننا تاڑ گئی۔ کہ یہ کچھ اور کسنا چاہتے تھے۔ مگر لحاظ کے باعث
نہ کہہ سکے۔ اُن کے دل کی بات اُس سے چھپی نہ رہی۔ اُس نے متکبرانہ
انداز سے سر اٹھا لیا۔ اور پُر غور نظروں سے کرشن چندر کی طرف دیکھا۔
اُس کی اس اعتقاد انگیز نگاہ نے وہ سب کچھ۔ اور اُس سے
بہت زیادہ کہہ دیا۔ جو وہ اپنی زبان سے کہہ سکتی۔

حصہ دوم (۱۶)

آدھی رات گزر چکی تھی۔ کرشن چندر گھر سے باہر نکلے۔ ناظورہ
قدرت کسی ضعیفہ کی طرح کمرے کی موٹی چادر اوڑھے چپ چاپ
پڑی ہوئی تھی۔ آسمان میں چاند منہ چھپائے ہوئے تیزی سے
دوڑا چلا جاتا تھا۔ معلوم نہیں کہاں!
کرشن چندر کے دل میں ایک بیتا بانہ اشتیاق پیدا ہوا شاننا
کو کیونکر دیکھوں؟ دنیا میں یہی ایک چیز ان کے اچھے دنوں کی

یادگار باقی رہ گئی تھی۔ مایوسی کی گہری تاریکی میں بھی ایک روشنی کی جھلک انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ تھوڑی بہتک دروازہ پر خاموش کھڑے رہے۔ اور تب ایک ٹھنڈی سانس بھر کر آگے بڑھے انہیں ایسا معلوم ہوا۔ گویا گنگا جلی آسمان پر بیٹھی ہوئی مجھے بلا رہی ہے۔

کرشن چندر کے دل میں اس وقت کوئی خواہش۔ کوئی آرزو۔ کوئی فکر نہ تھی۔ دنیا سے ان کی طبیعت بیزار ہو گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ کسی طرح جلد گنگا کنارے پہنچوں۔ اور اس کی لہروں میں ڈوبوں ہو جاؤں۔ انہیں خوف ہوتا تھا۔ کہ کہیں دیر نہ ہونے سے میری ہمت ٹوٹ نہ جائے۔ انہوں نے اپنے عزم کو مشتعل کرنے کے لئے دوڑنا شروع کیا۔

لیکن تھوڑی ہی دور چل کر وہ پھر ٹھٹک گئے۔ اور سوچنے لگے۔ پانی میں کود پڑنا کچھ بہت مشکل تو نہیں۔ جہاں زمین سے پیرا کھڑے کام تمام ہوا۔ اس خیال سے ان کا دل کانپ اٹھا۔ دفعۃً ان کے دھیان میں آیا۔ کہ کہیں بھاگ کیوں نہ جاؤں؟ جب یہاں ہوا گا۔ ہی نہیں۔ تو زبانِ خلق سے مجھے ہر کیا اثر ہوگا۔ لیکن اس خیال کو انہوں نے اپنے دل میں ٹھہرنے نہ دیا۔ ہوس دنیا کی یہ دام افگنی انہیں دھوکا نہ دے سکی۔

اگرچہ کرشن چندر کا مسیلاں مذہبی عقائد کی جانب نہ تھا۔ اور نا ایدہ

کے ایک موم سوم خوف سے ان کا دل کانپ رہا تھا۔ لیکن اپنے ارادہ کو مستقل رکھنے کے لئے وہ اپنے تنیں یقین دلارہے تھے۔ کہ پرانا بڑا رحیم اور غفور ہے۔ ان کے باطن پر پردہ سا بڑ گیا تھا۔ اُن کے نفس کی حالت اس لڑکے کی سی تھی۔ جو اپنے کسی بھولی کے کھلونے توڑ ڈالنے کے بعد اپنے ہی گھر میں جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔

کرشن چندر اسی طرح قدم بڑھاتے ہوئے چار میل تک چلے گئے۔ جوں جوں گنگا قریب آتی تھی۔ اُن کے دل کی حرکت بڑھتی جاتی تھی۔ خوف سے حواس پریشان ہوئے جاتے تھے۔ لیکن وہ اس ضعف قلب کو کچھ تو اپنی سرعتِ کام اور کچھ ملامت اور تحقیر سے دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے، آہ! میں کتنا بے شرم۔ بے غیرت ہوں؟ درُدا ہونے پر بھی موت سے ڈرتا ہوں۔ دفعۃً اُن کے کان میں گانے کی آواز آئی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے تھے۔ وہ آواز قریب ہوتی جاتی تھی، گانے والا انہیں کی طرف چلا آتا تھا۔ اس خاموشی میں کرشن چندر کو وہ صدا بہت سُریلی معلوم ہوئی۔ کان لگا کر سننے لگے۔ اگرچہ نغمہ دلکش نہ تھا۔ لیکن اصولِ فن کے مطابق تھا۔ اس لئے کرشن چندر کو بہت لطف حاصل ہوا، اس فن میں اُنہیں اچھا ذوق تھا۔ اس نغمہ سے ان کے قلب مضطرب نہ ہوئے۔

گانا بند ہو گیا۔ اور ایک لمحہ کے بعد کرشن چندر نے ایک دراز

قد۔ جٹا دھاری سادھو کو اپنی طرف آتے دیکھا سادھو نے ان کا نام
اور مقام پوچھا۔ اور تب مؤذبانہ انداز سے بولا: اس وقت آپ
کساں جا رہے ہیں؟

کرشن چندر۔ کچھ ایسا ہی کام آپڑا ہے:
سادھو۔ آدھی رات کو آپ کا گنگا کنارے کیا کام ہو سکتا ہے؟
کرشن چندر نے ترشی سے جواب دیا: آپ تو روشن ضمیر ہیں۔ آپ کو
معلوم ہونا چاہئے؟

سادھو۔ میں روشن ضمیر نہیں ہوں۔ اور نہ مجھے سادھو ہونے
کا دعویٰ ہے۔ میں محض ایک بھکاری برہمن ہوں۔ لیکن اس وقت
میں آپ کو اس طرف نہ جانے دوں گا۔
کرشن چندر۔ تم اپنی راہ جاؤ۔ میرا واسطہ روکنے کا نہیں ہوگا۔
حق نہیں ہے؟

سادھو۔ حق نہ ہوتا۔ تو میں آپ کو روکتا کیونکر۔ آپ مجھے
جانتے نہیں ہیں لیکن میں آپ کا دھرم پتر ہوں۔ میرا نام گجادیہ
پانڈے ہے؟

کرشن چندر۔ اچھا آپ پنڈت گجادیہ پرشاد ہیں۔ آپ نے
یہ بھیس کب سے اختیار کیا۔ آپ سے ملنے کی مجھے بہت خواہش
تھی۔ مجھے آپ سے بہت باتیں پوچھنی ہیں؟

سادھو۔ میرا ڈیرا اس وقت گنگا کے کنارے ایک درخت

کے نیچے ہے۔ چلے وہاں تھوڑی دیر آرام کیجئے۔ میں سارا واقعہ آپ سے
بیان کروں گا۔

راستہ میں دونوں آدمیوں میں کچھ گفتگو نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر میں وہ
لوگ اُس درخت کے نیچے آ پہنچے۔ وہاں ایک موٹا سا کُند اجل رہا تھا۔
زمین پر پیال بچھا ہوا تھا۔ اور اُس پر ایک مرگ چھالا۔ ایک مکندل اور
کتا بول کا ایک بستہ رکھا ہوا تھا۔

کرشن چندر نے آگ پر ہاتھ سینکتے ہوئے پوچھا: ”آپ اب سادھو
ہو گئے ہیں۔ سچ کہتے گا۔ سمن کی چال ت کیوں ہو گئی؟“

گجاند آگ کی روشنی میں کرشن چندر کے چہرہ کو مبصرانہ انداز سے
دیکھ رہے تھے۔ انہیں اُن کے چہرے پر اُن کے دل کی ساری کیفیات
جلی حروف میں لکھی ہوئی نظر آتی تھیں۔ وہ اب گجا دھری پُڈت نہ تھے۔
فقیروں کی صحبت اور مشق و ریاضت نے ان کے باطن کو روشن کر دیا
تھا۔ اب وہ اس واقعہ پر جتنا ہی غور کرتے تھے۔ اتنا ہی انہیں افسوس
ہوتا تھا۔ سمن سے اب انہیں ہمدری ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی ان کا جی چاہتا
تھا کہ چل کر سمن سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگوں۔ کرشن چندر سے بولے

”اس کا سبب میری حماقت تھی۔ یہ میری ہی بے رحمی اور وحشیانہ برتاؤ
کا نتیجہ تھا۔ وہ عورت دل کی رانی تھی۔ وہ اس قابل تھی کہ کسی بڑے گھر کی
مالکن بنتی۔ مجھ جیسا کمینہ۔ پست ہمت اور ناشناس آدمی اُس کے
قابل نہ تھا۔ اس وقت میری موٹی نگاہیں اُس کی ذاتی خوبیوں کو نہ

دیکھ سکتی تھیں، ایسی کوئی تکلیف نہ تھی۔ جو اس غریب کو میرے ساتھ نہ اٹھانی پڑی ہو۔ پر وہ کبھی آزدہ خاطر نہیں ہوئی۔ وہ میری عزت کرتی تھی۔ لیکن اُس کا یہ برتاؤ دیکھ کر مجھے شبہ ہوتا تھا۔ کہ وہ میرے ساتھ دغا کر رہی ہے۔ اُس کی قناعت۔ اُس کی متانت۔ اُس کی وفاداری میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میں سمجھتا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی چال چل رہی ہے۔ اگر وہ ذرا اسی باتوں کے لئے مجھ سے جھگڑے کرتی۔ روتی۔ کوستی۔ طعنے دیتی۔ تو شاید مجھے اس پر زیادہ اعتبار ہوتا۔ اس کی بلند نظری ہی میری بدگمانی کا سبب تھی۔ میں اس کی عصمت پر شبہ کرنے لگا۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی۔ کہ ایک دن صرف رات کو ایک سہیلی کے گھر پر دیر ہو جانے کے باعث میں نے اسے گھر سے نکال دیا۔

کرشن چندر نے قطع کلام کیا: "تمہاری عقل اس وقت کہاں گئی تھی؟ تمہیں ذرا بھی خیال نہ رہا۔ کہ تم ان سخت گیر یوں سے کتنے بڑے خاندان کی تباہی کے سامان کر رہے ہو؟

گجانبند۔ ہمارا جاب کیا عرض کروں۔ کہ مجھے کیا ہو گیا تھا میں نے پھر اس کی خبر نہ لی۔ پر میں قسم کھا سکتا ہوں۔ اس کا دل پاک تھا۔ اب وہ بدصوا آشرم میں رہتی ہے۔ اور وہاں سب اُس کی عزت کرتے ہیں۔ سب اُس کی نیکی اور شرافت کے مداح ہیں۔

گجانبند کی باتیں سن کر کرشن چندر کا دل ٹپکنے لگا۔ اس کی طرف سے نرم پڑ گیا۔ لیکن جیسے پانی کی دھارا ایک طرف سے رک کر دوسری طرف

بنے لگتی ہے۔ اسی طرح اُن کا غصہ سمن کی جانب سے پھر کر گجاندہ کی جانب مائل ہوا۔ وہ انہیں غضبناک لگا ہوں سے دیکھ کر بوئے گجاندہ تم نے میرے خاندان کو ڈبو دیا۔ تم نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رکھا تم نے میری لڑکی کی جان لی۔ اُسے تباہ کر دیا۔ تیرے بھی تم میرے سامنے اس طرح شان سے بیٹھے ہو۔ گویا کوئی ہمارا تھا ہو۔ تمہیں چلو بھر پانی میں ڈوب کر مرنا چاہئے۔“

گجاندہ زمین کی مٹی کھڑج رہے تھے۔ سر نہ اٹھایا۔ کرشن چندر نے پھر کہا: تم غریب تھے۔ اس میں تمہاری کوئی خطا نہ تھی۔ تم اگر اپنی بیوی کی مناسب طریق سے داشت نہ کر سکتے تھے۔ تو اس کا الزام تمہارے سر پر نہیں۔ تم اس کے دل کی کیفیتوں کو نہ جان سکے۔ اس کے حسن سلوک کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ اس کے لئے میں تمہیں خطا وار نہیں ٹھہراتا۔ تمہاری خطا یہ ہے کہ تم نے اُسے گھر سے نکال کیوں دیا؟ تم نے اُسے مار کیوں نہیں ڈالا؟ اگر تمہیں اس کی عصمت پر شبہ تھا۔ تو تم نے اس کا سر کیوں نہیں کاٹ لیا؟ اور اگر اتنی جرأت نہ تھی۔ تو خود کشی کیوں نہ کر لی؟ زہر کیوں نہ کھا لیا؟ اگر تم نے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا ہوتا۔ تو اس کی وہ حالت نہ ہوتی جو ہوئی۔ میرے خاندان میں وہ داغ نہ لگتا۔ جو لگا۔ تم بھی کہو گے۔ کہ میں مرد ہوں۔ تمہاری اس کم سمجھی پر۔ اس بے شرمی پر آف ہے۔ جو انسان اتنا بے غیرت ہے۔ کہ اپنی بیوی کی بے عصمتی پر اس کے خون میں جوش نہیں آ جاتا۔

دیکھ سکتی تھیں، ایسی کوئی تکلیف نہ تھی۔ جو اس غریب کو میرے ساتھ نہ اٹھانی پڑی ہو۔ پر وہ کبھی آرزوہ خاطر نہیں ہوئی۔ وہ میری عزت کرتی تھی۔ لیکن اُس کا یہ برتاؤ دیکھ کر مجھے شبہ ہوتا تھا۔ کہ وہ میرے ساتھ دغا کر رہی ہے۔ اُس کی قناعت۔ اُس کی متانت۔ اُس کی وفاداری میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میں سمجھتا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی چال چل رہی ہے۔ اگر وہ ذرا اسی باتوں کے لئے مجھ سے جھگڑے کرتی۔ روٹی۔ کوسنی۔ طعنے دیتی۔ تو شاید مجھے اس پر زیادہ اعتبار ہوتا۔ اس کی بلند نظری ہی میری بدگمانی کا سبب تھی۔ میں اس کی عصمت پر شبہ کرنے لگا۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی۔ کہ ایک دن صرف رات کو ایک سہیلی کے گھر پر دیر ہو جانے کے باعث میں نے اسے گھر سے نکال دیا۔

کرشن چندر نے قطع کلام کیا: "تمہاری عقل اس وقت کہاں گئی تھی؟ تمہیں ذرا بھی خیال نہ رہا۔ کہ تم ان سخت گیر لوں سے کتنے بڑے ظالان کی تنہائی کے سامان کر رہے ہو؟

گجانبند۔ ہمارا جاب کیا عرض کروں۔ کہ مجھے کیا ہو گیا تھا میں نے پھر اس کی خبر نہ لی۔ پر میں قسم کھا سکتا ہوں۔ اس کا دل پاک تھا۔ اب وہ بدصوا آشرم میں رہتی ہے۔ اور وہاں سب اُس کی عزت کرتے ہیں۔ سب اُس کی نیکی اور شرافت کے مداح ہیں۔

گجانبند کی باتیں سن کر کرشن چندر کا دل سُسن کی طرف سے نرم پڑ گیا۔ لیکن جیسے پانی کی دھارا ایک طرف سے رُک کر دوسری طرف

بنے لگتی ہے۔ اسی طرح اُن کا غصہ سمن کی جانب سے پھر کر گجاستہ کی جانب مائل ہوا۔ وہ انہیں غضبناک لگا ہوں سے دیکھ کر بولے: گجادھر تم نے میرے خاندان کو ڈبو دیا۔ تم نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رکھا تم نے میری لڑکی کی جان لی۔ اُسے تباہ کر دیا۔ تیرے بھی تم میرے سامنے اس طرح شان سے بیٹھے ہو۔ گویا کوئی ہمانا ہو۔ تمہیں چلو بھر پانی میں ڈوب کر مرنا چاہئے؟“

گجاستہ زمین کی مٹی کھڑج رہے تھے۔ سر نہ اٹھایا۔ کرشن چندر نے پھر کہا: تم غریب تھے۔ اس میں تمہاری کوئی خطا نہ تھی۔ تم اگر اپنی بیوی کی مناسب طریق سے داشت نہ کر سکتے تھے۔ تو اس کا الزام تمہارے سر پر نہیں۔ تم اس کے دل کی کیفیتوں کو نہ جان سکے۔ اس کے حسن سلوک کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ اس کے لئے میں تمہیں خطا وار نہیں ٹھہراتا۔ تمہاری خطا یہ ہے کہ تم نے اُسے گھر سے نکال کیوں دیا، تم نے اُسے مار کیوں نہیں ڈالا؟ اگر تمہیں اس کی عصمت پر شبہ تھا۔ تو تم نے اس کا سر کیوں نہیں کاٹ لیا؟ اور اگر اتنی جرأت نہ تھی۔ تو خود کشی کیوں نہ کر لی؟ زہر کیوں نہ کھا لیا؟ اگر تم نے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا ہوتا۔ تو اس کی وہ حالت نہ ہوتی جو ہوئی۔ میرے خاندان میں وہ داغ نہ لگتا۔ جو لگا۔ تم بھی کہو گے۔ کہ میں مرد ہوں۔ تمہاری اس کم سمجھی پر۔ اس بے شرمی پر انت ہے۔ جو انسان اتنا بے غیرت ہے۔ کہ اپنی بیوی کی بے عصمتی پر اس کے خون میں جوش نہیں آ جاتا۔

وہ حیوانوں سے بھی گیا گزرا ہے۔
 گجاند کو اب معلوم ہوا۔ کہ سمن کو بے خطا ثابت کرنے کی دُھن
 میں میں خود ایک دلیل میں آپھنسا۔ وہ پھٹانے لگے۔ کہ فیاضی کے
 جوش میں میں اتنا ہلک کیوں گیا۔ وہ اپنے خیال میں اس سخت طعن
 اور شینے کے سزاوار نہ تھے۔ چوٹ کھایا ہوا دل ایسی ملامت چاہتا
 ہے۔ جس میں ہمدردی اور غم گساری ہو۔ وہ نہیں جس میں ذلت
 اور خشونت ہو۔ لپکا ہوا پھوڑا شتر کا زخم چاہتا ہے۔ پتھر کی چوٹ
 نہیں۔ گجاند اپنی ندامت پر پھپھٹائے۔ ان کا دل پھر سمن کو خطاوا
 ثابت کرنے کے لئے بے قرار ہونے لگا۔

دفعۃً کرشن چندر نے گرج کر کہا: کیوں تم نے اسے مار کیوں نہیں
 ڈالا؟

گجاند نے تحمل سے جواب دیا: "میرا دل اتنا سخت نہیں تھا؟"
 کرشن چندر۔ تو اُسے گھر سے کیوں نکال دیا؟
 گجاند۔ محض اس لئے کہ اُس وقت مجھے اس سے اپنا گلا چھڑانے
 کی کوئی تدبیر نظر نہ آتی تھی۔

کرشن چندر نے منہ چڑھا کر کہا: "کیوں زہر تو کھا سکتے تھے؟"
 گجاند اس زخم سے تڑپ گئے۔ بولے: "جان دینا بے سود تھا؟"
 کرشن چندر۔ بے سود زندگی سے بے سود موت بہتر ہوتی ہے
 گجاند۔ آپ میری زندگی کو بے سود نہیں کہہ سکتے۔

کرشن چندر۔ کیا اسی لئے کہ تم یہ سوانگ بنائے پھرتے ہو؟
 گجانشند۔ جی نہیں۔ اس لئے کہ میری زندگی سے دوسروں کو
 کچھ نہ کچھ نفع ضرور پہنچا ہے۔ آپ سے پنڈت امانا پتہ لے کساہ ہو گا کہیں
 میں نے اسی طرح بھیک مانگ مانگ کر شانتالی شادی کے لئے پندرہ
 سو روپے دئے تھے۔ اور اس وقت بھی انہیں کے پاس ایک ہزار
 روپیہ اور لئے جا رہا تھا۔

یہ کہتے کہتے گجانشند خاموش ہو گئے۔ انہیں خیال آگیا کہ اس امر
 کا ذکر کرنا میری کم ظرفی ہے۔ شرم سے سر جھکا لیا۔
 کرشن چندر نے مثبتہ انداز سے کساہ انہوں نے اس کے متعلق کچھ
 سے کچھ نہیں کسا۔

گجانشند۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جو وہ آپ سے کہتے میری
 زبان سے بھی یہ بات سہو ا نکل گئی۔ معاف کیجئے۔ میری منشا صرف
 یہ ہے۔ کہ اپنی جان دے کر میں دنیا کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکتا تھا۔ اس
 دغ نے مجھے اپنی زندگی کی اصلاح پر مائل کیا ہے۔ ضمیر خفتہ کو بیدار
 کرنے کے لئے ہماری غلطیاں ایک قسم کی نداء غیب ہیں۔ جو ہمیں ہمیشہ
 کے لئے ہتیار کر دیتی ہیں۔ تعلیم۔ صحبت۔ تلقین کسی کا بھی ہمارے اوپر
 وہ نیک اثر نہیں پڑتا۔ جو اپنی غلطیوں کے بڑے نتائج سے پڑتا
 ہے ممکن ہے۔ آپ اسے میری بے خبری نہ سمجھ رہے ہوں۔ لیکن وہی
 بے خبری میرے سکون قلب اور عمل خیر کی تحریک کا ایک وسیلہ بن گئی

ہے۔ ایک عورت کی زندگی تباہ کر کے آج میں صد ہا بد نصیب کنواری
 لڑکیوں کی ناؤ پارنگانے کے قابل ہو گیا ہوں۔ اور یہ مجھے دیکھ کر بید
 مسرت ہوتی ہے۔ کہ یہی تحریک نیک سمن پر بھی اثر ڈال رہی ہے۔
 میں نے اپنی کٹی میں بیٹھے ہوئے۔ اُسے گنگا اشان کرتے ہوئے دیکھا
 ہے۔ اور اُس کے خلوص ارادت پر متحیر ہو گیا ہوں۔ اس کے چہرہ پر صفائی
 باطن کی روشنی نظر آتی ہے۔ وہ اگر پہلے خانہ داری میں ہوشیار تھی۔ تو
 اب وہ حسن باطن سے آراستہ ہے۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ وہ ایک دن
 طبقہ انات کا زیور بنے گی۔

کرشن چندر نے پہلے تو ان باتوں کو اس طرح سنا۔ جیسے ہوشیار
 گاہک کسی سوداگر کی پراصرار خوش کلامیوں کو سنتا ہے۔ وہ کبھی نہیں
 بھولتا۔ کہ سوداگر مجھ سے اپنے مطلب کی باتیں کر رہا ہے۔ لیکن رفتہ
 رفتہ کرشن چندر پر اس تقریر کا اثر پڑنے لگا۔ انہیں محسوس ہونے لگا۔ کہ
 میں نے اپنی درشت کلامیوں سے اس شخص کا دل دکھایا ہے۔ جو اپنی
 حرکت پر نادم ہے۔ اور جس کے احساسوں کے پوچھ سے میں دبا ہوا ہوں
 میں کیسا احسان فراموش ہوں! یہ یاد کر کے ان کی آنکھیں بھر آئیں
 صاف دل آدمی موم بتی کی طرح جتنی جلد سخت ہو جاتا ہے۔ اتنی ہی جلدی
 پگھل بھی جاتا ہے۔

گجانبند نے ان کے چہرے کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھ
 کر کہا: اس وقت آپ اگر ایک فقیر کے ہمان بن جائیں۔ تو کیسا ہو؟

صبح آپ جہاں کہیں گے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ اس کمل میں آپ کو جاڑا نہ لگے گا۔“

کرشن چندر نے ملائمت سے کہا: کمل کی ضرورت نہیں لیٹ رہوں گا۔“

گجائند۔ آپ سمجھتے ہیں کمل ادڑھنے سے آپ گنہگار ہو جائیں گے لیکن یہ کمل میرا نہیں ہے میں نے اسے حملوں ہی کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔“

کرشن چندر نے زیادہ انکار نہ کیا۔ انہیں سردی لگ رہی تھی کمل اوڑھ کر لیٹے اور فوراً نیند آگئی۔ لیکن سکون انگیز نیند نہیں۔ ان کے درد دل کا محض ایک مرقع تھی۔ انہوں نے خواب دیکھا۔ کہیں جیل خانہ میں بستر مرگ پر پڑا ہوا ہوں۔ اور جیل کا داروغہ میری طرف نگاہ نفرت سے دیکھ کر کہہ رہا ہے۔ تمہاری رہائی ابھی نہیں ہو سکتی۔ اتنے میں گنگا جلی اور میرے والد دونوں اگر چار پائی کے پاس کھڑے ہو گئے۔ اُن کے چہرے مسخ اور بیاہ تھے۔ گنگا جلی نے رو کر کہا تمہارا ہی باعث میری یہ حالت ہو رہی ہے۔ والد نے غضبناک لہجہ میں کہا۔ کیا تمہاری رو سیاہی ہماری زندگی کا انعام ہوگی؟ اسی لئے ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا؟ اب یہ سیاہی کبھی ہمارے چہرے سے دور نہ ہوگی۔ ہم ہمیشہ یہ عذاب جھیلنے رہیں گے۔ تو نے محض چار دن کی زندگی کے لئے ہمیں اس عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ پر ہم ابھی تیری

زندگی کا خاتمہ کئے دیتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ ایک کھسار اٹھے ہوئے
میری طرف جھپٹے۔

کرشن چندر کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُن کی چھاتی دھڑک رہی تھی۔
سوتے وقت وہ بھول گئے تھے۔ کہ میں گھر سے کس کام کو چلا تھا۔ اس
خواب نے اس کی یاد دلا دی۔ انہوں نے اپنے تئیں نفیس کی۔

انہیں یقین ہوا کہ محض خواب نہیں صدائے غیب ہے۔ گماندہ
کی تالیف کا اثر رفتہ رفتہ اُن کے دل سے مٹنے لگا۔ سمن اب چاہے
عصمت کی دیوی ہو جائے۔ پر اس سے وہ داغ سیاہ تو نہ مٹے گا۔

جو اس نے ہمارے چہرے پر لگا دیا ہے۔ یہ جہالتا کہتے ہیں۔ گناہ ہے
انسان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ مجھے تو یہ بالکل انوکھی بات معلوم
ہوتی ہے۔ میں نے بھی تو گناہ کئے ہیں۔ پر مجھے گناہ کے اس مصلحانہ

اثر کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ کچھ نہیں۔ یہ سب اُن کی لتانی ہے۔ انہوں
نے اپنی بے غیرتی کو چھپانے کے لئے یہ لفاظی کی ہے۔ یہ بالکل لغو خیال
ہے۔ گناہ سے گناہ ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر گناہ سے خواب ہوتا۔ تو آج

دنیا میں کوئی گنہگار باقی نہ رہتا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھے گماندہ
بھی الاؤ کے قریب ہی پڑے ہوئے تھے۔ کرشن چندر چپکے سے اٹھے
اور گنگا کنارے چلے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ اب اس درد کا خاتمہ

ہی کر کے چھوڑوں گا۔

چاند غروب ہو چکا تھا۔ کُرا اور بھی گھنا ہو گیا تھا۔ تاریکی نے

کوہ و شجر اور ساحل و دریا میں کوئی تمیز نہ رکھتی تھی۔ کرشن چندر ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ لیکن نگاہ کی بہ نسبت قیاس سے زیادہ کام لینا پڑتا تھا۔ سنگریزوں اور جھاڑیوں سے بچنے میں وہ ایسے محو تھے۔ کہ اپنی حالت کا دھیان نہ تھا۔

کرار کے کنارے پر پہنچ کر انہیں کچھ روشنی نظر آئی۔ وہ نیچے اترے۔ گنگا کسی مریض کی طرح کُسرے کی چادر اوڑھے کر اہ رہی تھی۔ آس پاس کی تاریکی اور گنگا میں صرف روانی کا فرق تھا۔ یہ رواں تاریکی تھی چاروں طرف ایسی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ جو کسی کی وفات کے بعد گھر پر چھا جاتی ہے۔

کرشن چندر ندی کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے سوچا۔ ہائے! اب میری موت کتنی قریب ہے۔ ایک لمحہ میں یہ جان نہ جانے کہاں چلی جائے گی! وہاں نہ جانے اس کی کیا گت ہوگی! آج دنیا سے نانا ٹوٹتا ہے! ایشور! اب مجھ پر رحم کرو۔ مجھے سنبھالو!

اس کے بعد ایک لمحہ تک انہوں نے اپنے دل کو خوب مستحکم کیا۔ انہیں یقین ہو گیا۔ کہ مجھے کسی قسم کا خوف نہیں ہے۔ وہ پانی میں گھستے پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ کرشن چندر کا ایک ایک عضو شل ہو گیا۔ وہ اس کی پروا نہ کر کے آگے بڑھتے چلے گئے۔ گردن تک پانی میں پہنچ کر انہوں نے ایک بار پھر مسلط تاریکی پر نگاہ ڈالی۔ یہ رشتہ دنیا کی آخری لڑی تھی۔ یہ استقلال کی خلوص غیرت کی آخری آزمائش تھی۔ اب تک

انہوں نے جو کچھ کیا تھا۔ وہ محض اسی امتحان کی تیاری تھی۔ ارادہ اور
 ہوس کا یہ آخری معرکہ تھا۔ ہوس نے پوری طاقت سے انہیں اپنی
 طرف کھینچا۔ سُن سنیا سی بنی ہوئی روبرو آئی۔ شانتا حسرت و غم
 میں ڈوبی ہوئی سامنے آکھڑی ہوئی۔ ابھی کیا بگڑا ہے؟ کیوں نہ
 سادھو ہو جاؤں۔ میں ایسا کون بڑا نامور آدمی ہوں۔ کہ دنیا میرے
 نام اور ناموس کا چرچا کرے گی؟ ایسی نہ جانے کتنی لڑکیاں روزِ نفس
 کے پنجہ میں پھنسا کرتی ہیں۔ دُنیا کس کی پرواہ کرتی ہے۔ میں نادان
 ہوں۔ جو یہ سوچتا ہوں۔ کہ دنیا میری ہنسی اڑائے گی۔ ارادہ نے
 کتنا ہی زور لگایا۔ کہ اس دلیل کی تردید کرے۔ پر کامیاب نہ ہوئی۔
 صرف ایک ڈبکی کی کسر تھی۔ زندگی اور موت میں صرف ایک قدم کا
 فاصلہ تھا! پیچھے کا قدم کتنا آسان تھا۔ کتنا زودِ عمل۔ آگے کا قدم کتنا
 مشکل تھا۔ کتنا خوفناک!

کرشن چندر نے پیچھے لوٹنے کو پیرا اٹھائے۔ ہوس نے اپنی قوت کا
 اعجاز دکھا دیا۔ مگر فی الواقع یہ محبتِ دنیا نہیں تھی۔ یہ خوف
 غائب تھا!

اس وقت کرشن چندر کو معلوم ہوا۔ کہ اب میں پیچھے نہیں پھر
 سکتا۔ وہ آہستہ آہستہ خود بخود آگے کھسکتے جاتے تھے۔ وہ زور سے
 چیخ اٹھے۔ اپنے ٹھٹھرے ہوئے پیروں کو پیچھے ہٹانے کی انتہائی
 کوشش کی۔ مگر نوشتہٴ تقدیر اودھ آگے ہی کھسکتے گئے۔

گجاند نے صرف یہ الفاظ سنے ہیں یہاں ڈوباجاتا ہوں : اور پھر
لہروں کی سفاکانہ ٹانے و صُحو کے اور کچھ نہ سُنائی دیا :
گجاند دیر تک کنارے پر کھڑے رہے۔ وہی الفاظ چاروں
طرف سے ان کے کانوں میں آئے تھے۔ پاس کی پہاڑیوں اور سامنے
کی لہروں اور چاروں طرف چھائی ہوئی تاریکی سے انہیں الفاظ کی
بازگشت صدائیں آرہی تھیں :



علی الصباح امولا میں اس سانحہ کی خبر پھیل گئی۔ لیکن چند ایسے
گنے آدمیوں کے سوا کوئی بھی اُماناقتہ سے تعزیت کرنے نہ آیا۔ اگر قدرتی
موت ہوئی ہوتی۔ تو غالباً ان کے دشمن بھی آکر چار آلسو بھا جاتے۔
لیکن خود کشی ایک خوف ناک شے ہے۔ اس موقع پر دوست بھی
دشمن ہو گئے۔

گجاند نے اماناتہ سے جس وقت یہ حال کیا۔ وہ کٹوئیں پر

نہا رہے تھے۔ انہیں ذرا بھی رنج یا حیرت نہ ہوئی۔ اس کے برعکس انہیں کرشن چندر پر غصہ آیا۔ پولیس کی مداخلت کے خوف نے غم کو پس پشت ڈال دیا۔ انہیں اس دن اشان دھیان میں بہت دیر لگی۔ طبع فکر مند کو اپنے حوال پر غور کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔ اُسے احساسِ وقت نہیں رہتا۔

جانہوی نے کھرام مچا نا شروع کیا۔ اسے روتے دیکھ کر اُس کی دونوں بیٹیاں بھی رونے لگیں۔ ہمسایہ کی مستورات فرضِ تشفی ادا کرنے کے لئے جمع ہو گئیں۔ انہیں پولیس کا خوف نہ تھا۔ لیکن یہ شور ماتم جلد ہی بند ہو گیا۔ کرشن چندر کے عیب و ہنر کی تنقید ہونے لگی۔ اتفاقِ رائے نے فیصلہ کیا۔ کہ ان کی خویوں کا پہلا نقال اُن پر غالب تھا۔ دوپہر کو جب اُماناٹھ گھر میں شربت پینے آئے۔ اور کرشن چندر کے متعلق چند ناسزاوار باتیں کیں۔ تو جانہوی نے اُن کی طرف تیز لگا ہوں سے دیکھ کر کہا: کیسی چھوٹی باتیں منہ سے نکالتے ہو؟ اُماناٹھ شرمندہ ہو گئے۔

جانہوی اپنے سرور قلب کا لطف تنہا اُٹھا رہی تھی۔ اس کیفیت کو وہ اتنا رکیک اور شرمناک سمجھتی تھی۔ کہ اُماناٹھ سے بھی اُسے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ سچا غم شانتا کے سوا اور کسی کو نہ ہوا۔ اگرچہ اپنے باپ کو وہ دوسرے کا دستِ نگر سمجھتی تھی۔ تاہم دُنیا میں اُس کی زندگی کا ایک سہارا موجود تھا۔ اپنے باپ کی خستہ حالی ہی اس

کی پدر پرستی کا باعث تھی۔ اب وہ دنیا میں یکہ و تنہا رہ گئی۔ لیکن اس صدمہ
 یاس نے اُس کے نیک ارادوں کو مغلوب نہ کیا۔ اس کا دل اور بھی درد مند
 ہو گیا۔ آج سے شانتا تحمل اور ضبط کا مجسمہ بن گئی۔ برسات کی آخری
 بوندوں کی طرح انسان کی آخری نصیحتیں بیکار نہیں جاتیں۔ شانتا اب
 منہ سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکالتی جس سے اس کے باپ کی روح کو تکلیف
 ہو۔ ان کی زندگی میں وہ کبھی کبھی ان سے بے ادبی کر بیٹھتی تھی۔ لیکن
 اب وہ ان کی شان میں کسی خود غرضانہ خیال کو دل میں بھی نہ آنے دیتی۔
 اُسے یقین تھا۔ کہ قید عناصر سے آزاد ہو کر روح کو ظاہر و باطن کا یکساں
 علم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اب وہ جانوی کو خوش رکھنے کے لئے کوئی دقیقہ
 نہ اٹھا رکھتی تھی۔ لیکن جانوی دن میں دو چار مرتبہ ضرور ہی اُس کے
 زخم کو تازہ کر دیا کرتی۔ شانتا کو غصہ آتا۔ پر وہ زہر کے کھونٹ پی کر رہ
 جاتی۔ تنہائی میں بھی نہ روتی تھی۔ اسے خوف ہوتا۔ کہ والد مرحوم کو میرے
 گریہ و زاری سے ملال ہوگا۔ ہولی کے دن امانا تھ اپنی دونوں لڑکیوں
 کے لئے اچھی اچھی ساڑیاں لائے۔ جانوی نے بھی اپنی ریشمی ساڑی
 نکالی۔ لیکن شانتا کو اپنی پُرانی دھوئی ہی پسینی پڑی۔ اُس کا دل غم
 سے پارہ پارہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ذرا بھی شکن نہ آئی۔ دونوں
 بہنیں منہ پھلائے بیٹھی تھیں کہ ساڑیوں میں فیتے نہیں لگوائے گئے
 اور شانتا خوش خوش گھر کے کام دھندے کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ
 جانوی کو بھی اُس پر رحم آگیا۔ اُس نے اپنی پُرانی لیکن ریشمی ساڑی

نکال کر شانتا کو دے دی۔ شانتا نے ذرا بھی انکار نہ کیا۔ اُسے پس کر پھر لپکاں بنانے میں مصروف ہو گئی۔

ایک دن شانتا اماناٹھ کی دھوتی دھونا بھول گئی۔ دوسرے دن علی الصبح اماناٹھ نہانے چلے۔ تو دھوتی گیلی پڑی تھی۔ وہ تو کچھ نہ بولے لیکن جانہوی نے شانتا کو اتنا کوسا کہ وہ رو پڑی۔ روتی تھی۔ اور دھوتی چانتی جاتی تھی اماناٹھ کو یہ دیکھ کر رنج ہوا۔ انہوں نے دل میں سوچا۔ ہم محض پیٹ کی روٹیوں کے لئے ایک یتیم کو اس قدر ستا رہے ہیں۔ ایشور کے یہاں کیا جواب دیں گے۔ جانہوی سے تو انہوں نے کچھ نہ کہا۔ پر دل میں فیصلہ کیا۔ کہ بہت جلد ان یتیم آزار یوں کا خاتمہ کرنا چاہئے۔ مراسم وفات سے فارغ ہو کر آجکل اماناٹھ پنڈت مدن سنگھ پر قانونی چارہ جوئی کرنے کی فکر میں منہمک تھے۔ وکیلوں نے انہیں یقین دلایا تھا۔ کہ ضرور تمہاری فتح ہوگی۔ پانچ ہزار روپے ہاتھ آجانے کی اُمید نے اماناٹھ کے دل میں بڑے بڑے منصوبے پیدا کر دئے تھے۔ وہ اس سرور میں مست ہو جایا کرتے تھے۔ نئے مکان کا خاکہ تیار ہو گیا تھا۔ اس کے لئے موقعہ کی زمین کی تلاش بھی شروع ہو گئی تھی۔ ان مسرت ناک ارادوں میں انہیں شانتا کی فکر بھی نہ رہی تھی۔ آج جانہوی کی سخت کلامیوں نے انہیں شانتا کی درد رسی کی جانب مائل کیا۔ گجاند کے دئے ہوئے ایک ہزار روپے جو انہوں نے مقدمہ کے مصارف کے لئے الگ رکھ دئے تھے۔ گھر

میں موجود تھے۔ ایک دن انہوں نے جاٹھوی سے شانتا کی شادی کے متعلق کچھ گفتگو کی۔ شانتا نے یہ باتیں سُن لیں۔ استغاثہ کے چرچے سن کر بھی اُسے رنج ہوتا تھا۔ پر وہ اس میں دخل دینا حد درجہ نامناسب سمجھتی تھی۔ لیکن شادی کا ذکر سن کر وہ خاموش نہ رہ سکی۔ ایک پُر زور تحریک باطن نے اُس کے شرم اور حجاب کو دور کر دیا۔ جوہنی اُمانا تھہ باہر چلے گئے۔ وہ جاٹھوی کے پاس جا کر بولی: ”ابھی ماموں تم سے کیا کہہ رہے تھے؟“

جاٹھوی نے بیدلی سے کہا: ”کہہ کیا رہے تھے۔ اپنا دکھ رو رہے تھے۔ ابھاگنی سمن نے یہ سب کچھ کیا۔ ورنہ کئے ہوئے کو پھر کیوں کرنا پڑتا۔ اب نہ اچھا خاندان ہی ملتا ہے۔ اور نہ اتنا اچھا بڑ۔ حقوڑی دور پر ایک گاؤں ہے۔ وہیں ایک بڑ دیکھنے گئے تھے؟“

شانتا نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے جواب دیا: ”کیا میں تم لوگوں کو اتنی بھاری ہو گئی ہوں۔ کہ مجھے پھینکنے کی پڑی ہوئی ہے؟“ آپ ماموں سے کہہ دیجئے۔ کہ وہ میرے لئے کوئی تڑد نہ کریں؟“

جاٹھوی: ”تم ان کی پیاری بھانجی ہو۔ اُن سے تمہاری مصیبت نہیں سی جاتی۔ میں نے بھی تو یہی کہا تھا۔ کہ ابھی رہنے دو۔ جب مقدمہ کے روپے ہاتھ آجائیں۔ تو اطمینان سے شادی کرنا۔ وہ میری مائیں تھ تو!“

شانتا مجھے وہیں کیوں بتیں پہنچا دیتے؟

شانتا نے استعجاب سے پوچھا: کہاں؟
 شانتا نے سادگی سے جواب دیا: ”چاہے چنار۔ چاہے
 کاشی۔“

جانھوی کیسی لنگھوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہو
 سکتا۔ تو رونا کا ہیکا تھا۔ ان لوگوں کو تجھے گھر میں رکھنا ہوتا۔ تو یہ
 صبر کیوں مچاتے؟

شانتا سو بنا کر نہ رکھیں گے۔ لوٹتی بنا کر تو رکھیں گے۔
 جانھوی نے بیدردی سے کہا: ”تو چلی جاؤ روکتا کون ہے؟
 منارے ماموں سے یہ کبھی نہ ہوگا۔ کہ وہ تمہیں سرچڑھا کر لے جائیں
 اور پھر اپنی بدنامی کر کے واپس لائیں۔ وہ تو ان لوگوں کا سرچل کر ان سے
 اپنے تاداں کے روپے وصول کریں گے۔“

شانتا۔ نامی وہ لوگ چاہے کیسے مغرور ہوں لیکن میں ان کے
 دروازہ پر جا کر کھڑی ہو جاؤں گی۔ تو انہیں مجھ پر رحم آہی جائے گا۔ مجھے
 یقین ہے۔ کہ وہ مجھے اپنے دروازہ سے دُتکار نہ دیں گے۔ اپنا دشمن
 بھی دروازہ پر آجائے۔ تو اُسے بھگانے لحاظ ہوتا ہے۔ میں تو پھر
 بھی۔۔۔۔۔

جانھوی کو اب صبر کی تاب نہ رہی۔ یہ بے شرمی اس سے نہ برداشت
 ہوئی۔ بات کاٹ کر بولی: ”چپ بھی رہ۔ شرم و حیا تو تجھے جیسے چھو نہیں
 گئی۔ مان نہ مان میں تیرا حمان۔ جو اپنی بات نہ پوچھے۔ وہ چاہے دھنا

سیٹھ ہی ہو۔ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھوں۔ اب تو وہ لوگ
 یساں آکر ناک بھی گھسیں۔ تو میں انہیں دور ہی سے بھگا دوں۔
 شانتا خاموش ہو گئی۔ دُنیا چاہے جو کچھ سمجھتی ہو۔ لیکن وہ اپنے
 کو بیاہتا ہی سمجھتی تھی۔ ایک منسوبہ لڑکی کا دوسرے گھر بیاہ ہو۔ یہ
 اُسے انتہا درجہ شرمناک اور نفرت انگیز معلوم ہوتا تھا۔ بارات آنے
 کے ایک ماہ قبل ہی سے وہ سدن کے اوصاف سُن سُن کر اُس کے
 ہاتھوں بک چکی تھی۔ اس نے اپنے دروازہ پر دوار پوچھا کہ وقت
 سدن کو اُسی نگاہ سے دیکھا تھا۔ جیسے کوئی عورت اپنے شوہر کو دیکھتی
 ہے۔ اس طرح نہیں گویا وہ کوئی بیگانہ آدمی ہے۔ اب کسی دوسرے مرد
 کا خیال اس کے شیشہ عصمت پر پتھر کی طرح لگتا تھا۔ وہ اتنے دنوں
 تک سدن کو اپنا شوہر سمجھنے کے بعد اب اُسے دل سے نکال نہ سکتی
 تھی۔ دھرم کی زنجیر کو توڑ نہ سکتی تھی۔ سدن اب اُس کا شوہر تھا۔ چاہے
 اُسے قبول کرے یا نہ کرے۔ چاہے اُس کی بات پوچھے یا نہ پوچھے۔ اگر دوار
 پوچھا کہ بعد ہی سدن اس کے سامنے آتا۔ تو وہ اس سے اسی طرح
 ملاقات کرتی۔ گویا وہ اس کا شوہر ہے۔ شادی رسوم کا طوہار تہیں محض
 دل کی ایک کیفیت ہے۔

شانتا کو ابھی تک یہ امید تھی۔ کہ کبھی نہ کبھی میں ضرور اپنی سُسرال
 جاؤں گی۔ لیکن آج اپنی شادی یا ازدواج ثانی کا ذکر سُن کر اُس کا دل
 پُر درد کانپ اٹھا۔ اس نے شرم اور حیا چھوڑ دی۔ اور جہانوی سے

منت کی کہ مجھے سسرال بھجوا دو۔ اتنا ہی اس کے امکان میں تھا۔
 اس کے سوا وہ اور کیا کرتی۔ لیکن جانھوی کی پیرجانہ گفتگو سن کر اس کا
 صبر ہاتھ سے جاتا رہا۔ دل کا اضطراب بڑھنے لگا۔ رات کو جب سب
 لوگ سو گئے۔ تو اس نے پنڈت پدم سنگھ کے نام ایک خط لکھنا شروع
 کیا۔ یہ اس کی آخری تدبیر تھی۔ اس کے ناکام ہونے پر اس نے اپنے
 طرز عمل کا فیصلہ کر لیا تھا۔ خط جلد تمام ہو گیا۔ مضمون پہلے ہی سے ذہن
 میں موجود تھا۔ صرف لکھنے کی دیر تھی۔

”میرے قابل تعظیم دھرم پتا۔ میں بڑی مصیبت
 میں ہوں۔ مجھ پر رحم کیجئے۔ یہاں کی حالت کیا لکھوں۔
 پتاجی گنگا میں ڈوب گئے۔ آپ لوگوں پر مقدمہ
 چلانے کی صلاح ہو رہی ہے۔ میری دوبارہ شادی
 ہونی قرار پائی ہے۔ جلد خبر لیجئے۔ ایک ہفتہ
 تک آپ کی راہ دیکھوں گی۔ اس کے بعد اس
 بکس یتیم کی فریاد آپ کے کانوں تک نہ پہنچے
 گی۔“

— (۱۸) —

پدم سنگھ کا پہلا بیاہ اس وقت ہوا تھا جب وہ کالج میں پڑھتے
 تھے۔ اور ایف۔ اے پاس ہوئے تو وہ ایک بیٹے کے باپ تھے۔ پر

بیوی ناتجربہ کار تھی بچے کی پرورش کرنا نہ جانتی تھی، پیدائش کے وقت
 نولڑکا تو انا و تندرست تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ دُبلّا ہونے لگا۔ اور
 چھٹے مہینے میں ماں اور بیٹا دونوں دُنیا سے رخصت ہو گئے۔
 پدم سنگھ نے ارادہ کیا کہ اب شادی نہ کروں گا مگر وکالت پاس کر
 چکنے پر انہیں پھر مجبوراً شادی کرنی پڑی۔ سبھا اب سو بن کر آئی۔ اسے
 آج سات برس ہو گئے۔

پہلے دو تین سال تک تو پدم سنگھ کو اولاد کی کوئی فکر ہی نہ ہوئی۔
 اگر بھانا کبھی اس کا ذکر کرتی۔ تو وہ ٹال جاتے تھے۔ کہتے مجھے اولاد
 کی ہوس نہیں۔ مجھ سے یہ بوجھ نہ سنبھلے گا۔ ابھی تک انہیں اولاد کی
 اُمید تھی۔ اس لئے بے صبر نہ ہوتے تھے۔ لیکن جب چوتھا سال بھی
 یونہی کٹ گیا۔ تو انہیں کچھ مایوسی ہونے لگی۔ فکر ہوئی کیا فی الواقع
 میں لا ولد ہی رہوں گا، جوں جوں دن گزرتے تھے۔ یہ فکر بڑھتی
 جاتی تھی۔ اب انہیں اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے
 لگا۔ سبھا اسے وہ محبت نہ رہی۔ سبھا راتا ٹوٹ گئی۔ اُسے صدمہ تو
 ہوا پر اسے نوشتہ تقدیر سمجھ کر صبر کیا۔

پدم سنگھ اپنے تئیں بہت سمجھاتے کہ تمہیں اولاد ملے کر کیا کرنا
 ہے۔ روز ولادت سے پچیس سال تک اُسے جلاؤ۔ کھلاؤ۔ پڑھاؤ۔
 لکھاؤ۔ اس پر بھی یہ اندیشہ لگا ہی رہتا ہے۔ کہ کیسی ڈھنگ کا ہوگا۔
 بھی یا نہیں۔ کہیں لڑکا مر گیا۔ تو اس کے نام کو بیٹھ کر روؤ۔ اور جو

کمیں خود ہی مر گئے۔ تب تو غریب لڑکے کی زندگی ہی تباہ ہو گئی ہمیں
 ایسی نعمت کی ضرورت نہیں لیکن ان خیالات سے دل کو تشفی نہ
 ہوتی تھی۔ وہ سجدہ سے اپنا درد دل چھپانے کی کوشش کرتے
 تھے۔ اور اُسے معذور سمجھ کر حسب سابق اس کے ساتھ محبت کرنا
 چاہتے تھے لیکن جب دل پر یاس کی تاریکی چھائی ہوئی ہو۔ تو
 چہرہ پر مسرت کی روشنی کہاں سے آئے۔ موٹی نگاہ کا آدمی بھی کہہ
 سکتا تھا۔ کہ میاں بیوی کے درمیان کشیدگی ضرور ہے۔ خیریت
 یہی تھی۔ کہ سجدہ اپنے شوہر کی محبت اور دلجوئی میں کوئی دقیقہ
 نہ چھوڑتی تھی۔ وہ اپنی دلجوئیوں سے اولاد کی تمنا کو مٹانا چاہتی
 تھی۔ مگر اس امر دشوار میں وہ اس شخص سے زیادہ کامیاب نہ
 ہوتی تھی۔ جو مرلیض کو گیتوں سے اچھا کرنا چاہتا ہو۔ خانہ داری
 کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اُسے ہمیشہ دبنا پڑتا تھا۔ اور جب
 سے سدن یہاں رہنے لگا تھا۔ کتنی ہی بار سدن کے پیچھے اُسے
 جھڑکیاں سننی پڑی تھیں، عورت اپنے شوہر کے ہاتھ سے بھالے
 کا زخم بھی برداشت کر سکتی ہے۔ لیکن کسی دوسرے شخص کے پیچھے اگر
 شوہر اُسے تیز نگاہ سے بھی دیکھے۔ تو اسے برداشت نہیں ہوتی۔
 سدن سجدہ کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ آخر کل وہ
 وہ اہل ہی پڑی۔ گرمی کی شدت تھی۔ مسرائں کسی وجہ سے نہ آئی تھی۔
 سجدہ کو رسوئیں بنانا پڑی۔ اُس نے پدم سنگھ کے لئے باریک

پھلکیاں بنائیں۔ لیکن گرمی سے بیتاب تھی چوہے کے سامنے
 بیٹھا نہ جاتا تھا۔ سدن کے لئے موٹی موٹی روٹیاں لپکا دیں۔ پدم
 سنگھ کھانا کھانے بیٹھے۔ تو سدن کی نقالی میں موٹی روٹیاں نظر آئیں
 غصہ کے مارے انہوں نے اپنی پھلکیاں اس کی نقالی میں رکھ دیں۔
 اور اس کی روٹیاں اپنی نقالی میں ڈال لیں۔ سجدہ رائے جل کر کچھ
 طنز آمیز باتیں کہیں۔ پدم سنگھ نے ان کا ویسا ہی جواب دیا۔ پھر
 جواب الجواب کی نوبت آئی۔ یہاں تک کہ وہ جھڈا کر اٹھ آئے۔
 کھانا ہتھیں کھایا۔ سجدہ رائے بھی منا دن نہیں کیا۔ اُس نے رسوئیں
 اٹھا دی۔ اور جا کر لیٹ رہی۔ تب سے پورا ایک دن گزر گیا۔ مگر دو
 میں سے ایک کا بھی غصہ فرو نہیں ہوا۔ مسرائن نے آج کھانا لپکایا
 پر نہ پدم سنگھ نے کھایا۔ اور نہ سجدہ رائے۔ سدن باری باری سے
 دونوں کی خوشامد کر رہا تھا۔ ایک طرف سے جواب پاتا۔ ابھی بھوک
 نہیں ہے۔ اور دوسری طرف سے جواب ملتا۔ کھالوں کی بیٹھوٹ
 ہی چھوٹے گا۔ یہی چھوٹ جاتا۔ تو کیوں کسی کی دھونس سہنی پڑتی۔
 تعجب یہ تھا کہ سجدہ رائے سدن سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھی۔ حالانکہ
 وہی کل کی بد مزگیوں کا غاص باعث تھا۔ ہرں خوب جانتا ہے کہ
 ٹٹی کی آرٹ سے آنے والا تیر دراصل صیاد کا شوق شکار یا تمنائے
 گوشت ہے۔

تیسرا پر ہو گیا تھا۔ پدم سنگھ سو کر اٹھے تھے۔ اور جمائیاں لے

رہے تھے۔ ان کے دل میں سجدہ کی جانب سے ایک غبار بھرا
 ہوا تھا۔ اسی اثنا میں ڈاکے نے ایک بیرنگ خط لاکر انہیں دیا۔
 انہوں نے ڈاکہ کی طرف ترش نگاہوں سے دیکھا۔ گویا بیرنگ
 چٹھی لاکر اُس نے کوئی خطا کی ہے۔ پہلے تو ان کے جی میں آیا۔ کہ
 اسے واپس کر دیں کیسی مفلس موکل نے اس میں اپنی مصیبت
 کی کھٹا گائی ہوگی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر چٹھی لے لی۔ اور اُسے پڑھنے
 لگے۔ یہ شانتا کا خط تھا۔ اُسے ایک بار پڑھ کر میز پر رکھ دیا۔ ایک لمحہ
 کے بعد اُسے پھر پڑھا۔ اور تب کمرہ میں ٹہلنے لگے۔ اس وقت اگر
 مدن سنگھ وہاں موجود ہوتے۔ تو وہ انہیں یہ خط دکھاتے اور کہتے۔
 یہ آپ کے خوف رسوائی کا۔ آپ کے خاندانی و جاہت کے غرور
 کا نتیجہ ہے۔ آپ نے ایک انسان کا خون کیا ہے۔ اور وہ خون آپ
 کی گردن پر ہے۔ اُمانا تھ کے استغاثہ کا ذکر پڑھ کر پدم سنگھ کو گونہ مسرت
 ہوئی۔ بہت اچھا ہو۔ کہ یہ استغاثہ دائر ہو جائے۔ اور ان حضرت
 کا غرور و نجابت خاک میں مل جائے۔ اُمانا تھ کی ڈگری ضرور ہی
 ہوگی۔ تب بھائی صاحب کو معلوم ہوگا۔ کہ یہ تماشا کتنا حسن کا پڑا
 انسوس! اس غریب لڑکی کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ پدم سنگھ
 نے پھر اس خط کو پڑھا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے حسن عقیدت
 ٹپکا پڑتا تھا۔ شانتا نے انہیں ”دھرم پتا“ لکھا تھا۔ یہ ایک لفظ
 ان کے دل پر جادو کا سا عمل کر رہا تھا۔ اُس نے اُن کے جذبہ انصاف

کو متحرک اور ان کے دل کے تار حمایت کو مرتعش کر دیا۔ فوراً کپڑے پہنے اور بھٹل داس کے مکان پر جا پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا۔ کہ وہ کنویر ماز دھنگہ کے یہاں گئے ہوئے ہیں۔ فوراً بالٹکل ادھر پھیر دی وہ شانتا کے متعلق اسی وقت کچھ نہ کچھ فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں خوف تھا۔ کہ کہیں تاخیر اس جوش کو ٹھنڈا نہ کر دے؟ کنور صاحب کے یہاں آج گوالیر کا ایک جل ترنگیا آیا ہوا تھا۔ اس کا گانا سننے اور اس کا کمال دیکھنے کے لئے انہوں نے اپنے احباب کو مدعو کیا تھا۔ پدم سنگھ وہاں پہنچے تو دیکھا۔ کہ بابو بھٹل داس اور پروفیسر دیش دت کے درمیان ایک سرگرم مناظرہ ہو رہا ہے۔ اور کنور صاحب۔ پنڈت پر بھا کر راؤ اور سید تیغ علی بیٹھے ہوئے اس مناظرہ کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ گویا بٹیروں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ پدم سنگھ کو دیکھتے ہی کنور صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور بولے: ”آئیے آئیے۔ یہاں خونریز جنگ ہو رہی ہے۔ کسی طرح انہیں الگ کیجئے۔ نہیں تو دونوں لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔“

اتنے میں پروفیسر دت بولے: ”تھیا صوفسٹ ہونا کوئی کالی نہیں ہے۔ میں تھیا صوفسٹ ہوں۔ اور اسے ساری دنیا جانتی ہے۔ یہ ہماری ہی سوسائٹی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کہ آج امریکہ جرمنی۔ روس وغیرہ ملکوں میں آپ کے رام اور کرشن کے معتقد

اور گیتا۔ اُپنشد وغیرہ مقدس کتابوں کے شائق نظر آنے لگے ہیں۔
 ہماری سوسائٹی نے ہندو قوم کا رتبہ بڑھا دیا ہے۔ اُس کے
 دائرہ اثر کو وسیع کر دیا ہے۔ اور اُس سے اُس مسند اعزاز پر بٹھا
 دیا ہے۔ جسے وہ اپنی آرام طلبی اور جمود کے باعث صدیوں سے
 چھوڑے بیٹھی تھی، یہ ہندو قوم کی احسان فراموشی ہوگی۔ اگر
 وہ ان لوگوں کی منت گزار نہ ہو۔ جنہوں نے اپنی شمعوں سے
 اُسے بصارت عطا کی ہے۔ یہ شمع چاہے میڈم بلیوٹسکی نے روشن
 کی ہو۔ چاہے کرنل الکٹ نے ہمیں اس سے بحث نہیں ہمیں
 جن لوگوں کی ذات سے فیض پہنچا ہے۔ ان کا مشکور ہونا ہمارا
 فرض ہے۔ اگر آپ اسے روحانی غلامی کہتے ہیں۔ تو آپ کی صریح
 بے انصافی ہے :

بھٹل داس نے اس تقریر کو ایسی لا پرواہی سے سنا۔ گویا یہ
 کوئی فصل بکو اس ہے۔ اور بولے : جسے آپ احسان گزاری کہتے
 ہیں اسی کو میں روحانی غلامی کہتا ہوں۔ بلکہ غلام تو ایک
 طرح سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کا جسم چاہے جکڑا ہوا ہو۔ لیکن
 اس کی روح آزاد ہوتی ہے۔ آپ لوگوں نے تو اپنی روحانی
 آزادی ہی کو بیچ دیا ہے۔ آپ کی انگریزی تعلیم نے آپ کو اتنا
 پست ہمت بنا دیا ہے۔ آپ اپنے روحانی اور مذہبی اعتقادات
 میں بھی یورپین علما کے فیصلے کے منتظر رہتے ہیں۔ آپ اُپنشدوں

کی عزت اس لئے نہیں کرتے ہیں۔ کہ وہ بجائے خود عزت کے قابل ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ہلویٹسکی اور میکسمور نے ان کی تعریف کی ہے۔ آپ کے مذہبی رسوم و رواج سب بے معنی تھے۔ لیکن اب جو اہل مغرب نے ان کے اوصاف ظاہر کئے۔ تو آپ کو ان میں سرتاپا خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ آپ لوگوں میں اپنی عقل اور تمیز سے کام لینے کی طاقت سلب ہو گئی ہے۔ ابھی چند سال قبل تک آپ یہاں کے تانترک و دیا کی بات بھی نہ پوچھتے تھے۔ یورپین علمائے جب ان کے معنی کا انکشاف کرنا شروع کیا۔ تو آپ جھاڑ بھونک۔ ٹوٹنے ٹوٹنے کے قائل ہو گئے ہیں۔ یہ ذہنی متابعت جسمانی انقیاد سے کہیں زیادہ حقیر ہے آپ اپنشدوں کو انگریزی میں پڑھتے ہیں۔ اور گیتا کو جرمن میں۔ آپ ارجن کو ارجنا کہتے ہیں۔ کرشن کو کرشنا۔ رام کو راما۔ یہ آپ کی زبان دانی ہے۔ آپ نے اسی ذہنی غلامی کے باعث اس ملک میں بھی اطاعت قبول کر لی۔ جہاں ہم اپنے بزرگوں کے علم اور کمال کی بدولت قیامت تک اپنی سر بلندی کے پھر ریے اڑا سکتے تھے؟“

رومیش دت کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ اس کا کچھ جواب دینا ہی چاہتے تھے۔ کہ کنور صاحب بول اُٹھے۔ ”یارو! اب مجھ سے بولے بغیر نہیں رہا جاتا۔ بابو بھٹل داس آپ اپنے اس ”غلامی“ کے الزام کو واپس لیجئے؟“

بھٹل داس۔ کیوں واپس لوں؟

کنور صاحب۔ آپ کو یہ الزام دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

بھٹل واس۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھتا۔

کنور صاحب۔ میرا مطلب یہ ہے۔ کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی دوسرے شخص کو غلام کہنے کا حق نہیں رکھتا۔ انڈھوں کی بستی میں کون کسی کو انڈھائے گا۔ ہم سب کے سب امیر ہوں یا غریب۔ راجہ ہوں یا فقیر غلام ہیں۔ ہم اگر جاہل۔ مفلس۔ گنوار ہیں۔ تو تھوڑے غلام ہیں ہم اپنے رام کا نام لیتے ہیں۔ اپنی دھوئی پگڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ اپنی بولی بولتے ہیں۔ اپنی گائے پالتے ہیں۔ اور اپنی پاک گنگائیں نہاتے ہیں۔ اور اگر ہم تعلیم یافتہ صاحب ثروت اور بیدار مغز ہیں۔ تو بہت غلام ہیں۔ کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ بدیسی زبان بولتے ہیں۔ کتے پالتے ہیں۔ ٹب میں نہاتے ہیں اور اپنے بھائیوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ ہماری ساری قوم انہیں دو جاعتوں میں منقسم ہے۔ اس لئے کوئی کسی کو غلام نہیں کہہ سکتا۔ غلامی کو مختلف صورتوں میں تقسیم کرنا خیال باطل ہے۔ غلامی صرف روح سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی دوسری صورتیں اسی میں مشتمل ہیں۔ موڑ۔ بنگلے۔ پولو اور پیا نو یہ سب لوہے کی ایک بیڑیاں ہیں جس نے ان بیڑیوں کو نہیں پہنا۔ انہیں کو سچی آزادی کا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ وہ کون لوگ ہیں۔ جو اپنے پسینہ کی کمائی کھاتے ہیں۔ اپنا قومی لباس۔ قومی زبان اور قومی معاشرت کے لئے کسی غیر کے محتاج نہیں۔ ہم جو مذہب اور

روشن خیال ہیں۔ لوہے کی بیڑیاں پہن کر اپنی روحانی آزادی کو مافقہ سے لکھو کر کسانوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ انہیں قابل رحم سمجھتے ہیں۔ مگر دراصل قابل رحم ہم ہیں۔ جو اپنی روٹیوں کے لئے بھی دوسروں کے دست کرم کے محتاج ہیں۔ یہ ہم ہی ہیں۔ جو بنگلوں پر حبیبی سائیاں کرتے ہیں۔ خانساموں کے ناز اٹھاتے ہیں۔ پھولوں کی ڈالیاں لئے لئے در بدر گھومتے ہیں۔ کسانوں کو بھی کسی نے یہ بیہودہ حرکتیں کرتے دیکھا ہے؟ ہم پالتو کتے ہیں۔ جو جنگل کے آزاد جانوروں کا شکار کرتے پھرتے ہیں۔ ہمارے لئے اس سے بہتر کوئی تشبیہ نہیں ہو سکتی۔

پر بھاکر راڈ نے مسکرا کر کہا: آپ کو کسان بن جانا چاہئے؟
کنور صاحب۔ کسان بن جاؤں تو اپنے پہلے جہنم کی سزائیں کیونکر جھیلوں گا؟ بڑے دن میں میوے کی ڈالیاں کیسے لگاؤں گا۔ سلامی کے لئے خانساموں کی خوشامدیں کیسے کروں گا۔ خطابوں کے لئے نبینی تال زیارت کیونکر کروں گا۔ ڈنر پارٹی دے کر لیڈیوں کے کتوں کو کیونکر گود میں اٹھاؤں گا۔ اپنے آقاؤں کو خوش رکھنے کے لئے قومی بہبود کی تجاویز کی مخالفت کیونکر کروں گا۔ یہ سب انسانی نپستی کے آخری درجے ہیں۔ اس منزل کو طے کئے بغیر بیماری نجات نہیں ہو سکتی، (پدم سنگھ سے) کئے شرابی۔ آپ کی تجویز بورڈ میں کب آئے گی؟ آپ آج کل کچھ افسردہ خاطر نظر آتے ہیں۔

کیا اس تجویز کا بھی وہی حشر ہوگا۔ جو ہماری بیشتر قومی تحریکیوں کا ہوا کرتا ہے؟

ادھر کچھ دنوں سے فی الواقع پدم سنگھ بے دل سے ہو رہے تھے۔ جوں جوں تجویز کے پیش ہونے کا زمانہ قریب آتا تھا۔ ان کا اعتماد کمزور ہوتا جاتا تھا۔ انہیں اس سے فائدہ کے بجائے نقصان ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ لیکن وہ اپنے شکوک کو کسی پر ظاہر کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ کنور صاحب کی طرف نگاہ اعتماد سے دیکھ کر بولے ”جی نہیں۔ یہ بات تو نہیں ہے۔ ہاں ان دنوں ذرا فرصت کم تھی۔ اس وجہ سے اتنی سرگرمی سے کام نہ ہو سکا۔“

کنور صاحب۔ تجویز کی کامیابی میں تو اب کوئی رُو کاوٹ نہیں ہے؟

پدم سنگھ نے تیغ علی کی طرف دیکھ کر کہا ”مسلمان ممبروں کا بھروسہ ہے۔“

تیغ علی نے عارفانہ انداز سے کہا ”ان پر اعتماد کرنا ریت پر دیوار بنانی ہے۔ آپ کو معلوم نہیں۔ ادھر کیا ریشہ دو انیمیاں ہو رہی ہیں۔ عجب نہیں۔ کہ وہ حضرات آپ کو عین وقت پر دھوکا دیں؟“

پدم سنگھ۔ مجھے ان سے ایسی اُمید نہیں ہے۔

تیغ علی۔ یہ آپ کی شرافت ہے۔ وہاں اس وقت اردو ہندی کا قضیہ درپیش ہے۔ گاؤ کشی۔ جداگانہ انتخاب۔ سود کا مجوزہ قانون۔

ان سبھی مسائل سے مذہبی تعصبات کو برا نگینہ کرنے کی کوشش
کی جا رہی ہے۔

پر بھا کر راؤ۔ کیا سیٹھ بل بھدر داس تشریف نہ لائیں گے۔ کسی
طرح انہیں اپنی طرف کھینچنا چاہئے۔

کنور صاحب۔ میں نے انہیں دعوت ہی نہیں دی۔ کیونکہ میں
جانتا تھا۔ کہ وہ نہ آئیں گے۔ وہ اختلاف رائے کو جانی دشمنی خیال کرتے
ہیں۔ ہمارے لیڈروں کی بالعموم یہی حالت ہے۔ یہی ایک امر ہے
جس میں ان کی زندہ ملی ظاہر ہوتی ہے۔ آپ نے اُن سے ذرا بھی
اختلاف کیا۔ اور وہ آپ کی جان کے گاہک ہو گئے۔ آپ سے بولنا
تو دور رہا۔ آپ کی صورت سے گریز کریں گے۔ بلکہ موقع پائیں گے۔
تو حکام سے آپ کی شکایت کریں گے۔ اپنے جوار حین میں آپ کے
طور و طریق۔ عادات و اطوار کا مضحکہ اڑائیں گے۔ آپ بوہن ہیں۔
نو آپ کو بھکاری کہیں گے۔ آپ چھتری ہیں۔ تو اجڑ کنوار کا لقب
عطا کریں گے۔ آپ ویش ہیں۔ تو آپ کو بقال اور ڈنڈی تول کا خطاب
ملے گا۔ اور اگر آپ شودر ہیں۔ تب تو آپ بنے بنائے چاندل ہیں۔
آپ کو اگر گانے کا شوق ہے۔ تو آپ پاکھنڈی اور لوپ ہیں۔ یہاں
تک کہ آپ کی مستورات پر بھی کیچڑ پھینکنے کی کوشش کی جائے گی۔
ہمارے یہاں اختلاف رائے بدترین گناہ ہے۔ اور اس کا کوئی کفارہ
نہیں۔ اے وہ دیکھئے ڈاکٹر شیاماچرن کاموڑ آگیا۔

ڈاکٹر صاحب موڑ سے اترے اور حاضرین کی طرف مربیانہ انداز سے

دیکھتے ہوئے بولے "I am sorry I was so late"

کنور صاحب نے ان کی تعظیم کی۔ اور لوگوں نے بھی ہاتھ دلائے۔
اور ڈاکٹر صاحب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

When is the performance to begin

کنور صاحب نے کہا: "ڈاکٹر صاحب آپ بھولتے ہیں۔ یہ کالے
آدمیوں کی مجلس ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر کہا: معاف کیجئے۔ مجھے یاد نہ رہا۔ کہ یہاں
بلیچھوں کی زبان میں گفتگو کرنا منع ہے؟

کنور صاحب۔ لیکن دیوتاؤں کی مجلس میں تو آپ سے شاید
کبھی ایسی غلطی نہ ہوتی ہو؟

ڈاکٹر۔ تو ہمارا آج اس گناہ کا پرائیجٹ کر لیجئے؟

کنور صاحب۔ اس کا پرائیجٹ ہے۔ کہ آپ ہم جیسے گنواروں
سے مادری زبان میں باتیں کیا کیجئے؟

ڈاکٹر۔ آپ راجہ صاحب ہیں۔ آپ سے یہ عہد پورا ہو سکتا ہے
ہمارا انگریزی زبان سے شب و روز کا واسطہ ہے۔ ہم اس عہد کو نہیں نبھا
سکتے۔ اور پھر آپ جانتے ہیں۔ کہ یہی زبان آج اس ملک کی

Lingues Franca ہے۔

کنور صاحب۔ آپ ہی جیسے معزز اصحاب نے تو اسے

یہ رتبہ دے رکھا ہے۔ فارس اور کابل کے کندہ نائزاش فوجیوں اور
ہندو سوداگروں کے میل جول سے اردو جیسی زبان وجود میں آگئی
اگر ہمارے مختلف صوبہ جات کے اہل علم باہمی تعلقات میں اپنی ہی
زبان پر تکیہ کرنے پر مجبور ہوتے۔ تو اب تک یہاں قومی زبان پیدا
ہو جاتی۔ جب تک ہمارا صاحب علم طبقہ انگریزی زبان کا شیدا
بن رہا ہے گا۔ کسی قومی زبان کا ایجاد ہونا محال ہے۔ مگر یہ ایک وقت
طلب امر ہے۔ اس میں کون جان کھپائے۔ یہاں تو انگریزی جیسی
مکمل زبان مل گئی۔ بس لوگ اُسی کے ہو رہے۔ اب چاروں طرف
سے یہی صدائیں آتی ہیں۔ کہ انگریزی ہماری لنگو افرینکا ہے۔ اور
ہمیں کسی ہندوستانی زبان کو یہ شرف بخشنے کا خیال ترک کر دینا
چاہئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ انگریزی زبان میں بولنا اور
لکھنا لوگ کیوں اس قدر باعث فخر سمجھتے ہیں۔ میں نے بھی انگریزی
پڑھی ہے۔ دو سال انگلستان میں بھی رہ چکا ہوں۔ اور آپ کے
کتنے ہی انگریزی پر جان دینے والوں سے بہتر انگریزی لکھ اور بول
سکتا ہوں۔ پر مجھے اس سے ایسی ہی نفرت ہوتی ہے۔ جیسے کسی انگریز کے
اُتارے ہوئے کپڑوں سے۔

پدم سنگھ ان مباحثوں میں شریک نہ ہوئے۔ جو یہی موقع ملا۔ انہوں
نے بھٹل داس کو قریب بلا کر شائستا کا خط دکھلایا۔ بھٹل داس نے پوچھا۔
”اب آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“

پدم سنگھ - میری تو کچھ عقل ہی کام نہیں کرتی جب سے یہ خط
ملا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میں ندی میں بہا جاتا ہوں؟
بھٹل داس - کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا؟

پدم سنگھ - کیا کروں؟

بھٹل داس - شانتا کو رخصت کرالائیے؟

پدم سنگھ - سارے خاندان سے ناتا ٹوٹ جائے گا؟

بھٹل داس - ٹوٹ جائے۔ اس وقت فرض یہی ہے۔ اس

سے منہ موڑنا مناسب نہیں؟

پدم سنگھ - آپ یہ بجا فرماتے ہیں لیکن مجھ میں اتنا استقامت نہیں

ہے۔ میں بھائی صاحب کو ناراض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا؟

بھٹل - اپنے گھر میں نہ رکھئے۔ بدھو آشرم میں رکھ دیجئے یہ

تو مشکل نہیں؟

پدم سنگھ - ہاں یہ آپ نے اچھی تدبیر نکالی۔ مجھے اتنا بھی نہ

سوچنا تھا۔ مشکلات میں میری عقل جیسے چرنے چلی جاتی ہے؟

بھٹل - لیکن جانا آپ کو پڑے گا؟

پدم سنگھ - یہ کیوں۔ کیا آپ کے جانے سے کام نہ چلے گا؟

بھٹل داس - بھلا اُمانا اُسے میرے ساتھ کیوں بھیجنے

لگے؟

پدم سنگھ - اس میں انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟

بھٹل داس۔ آپ تو کبھی کبھی بچوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ شانتا ان کی بیٹی نہ سہی۔ لیکن اس وقت وہی اس کے سر پرست ہیں۔ وہ اُسے ایک بیگانہ آدمی کے ساتھ کیوں آنے دیں گے؟

پدم سنگھ۔ بھائی صاحب! آپ ناراض نہ ہوں۔ میں فی الواقع کچھ بدحواس ہو گیا ہوں۔ لیکن میرے چلنے سے معاملہ طول پکڑ جائیگا۔ بھائی صاحب سنیں گے۔ تو مجھے مار ہی ڈالیں گے۔ جنوا سے میں انہوں نے مجھے جس بُری طرح دبوچا تھا۔ وہ مجھے یاد ہے۔ بھٹل۔ خیر آپ نہ چلئے۔ میں ہی چلا جاؤں گا۔ لیکن امانا تھکے کے نام ایک خط لکھ دینے میں تو آپ کوتاہی نہ ہوگا؟

پدم سنگھ۔ میں ڈرتا ہوں۔ کہ آپ مجھے نرا مٹی کا تو وہ سمجھنے لگیں گے۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے۔ ایسی کوئی حکمت بتلائیے۔ کہ خدا خواستہ کوئی بات پیدا ہو۔ تو میں صاف نکل جاؤں۔ بھائی صاحب کو مجھ پر الزام رکھنے کا موقع نہ ملے۔

بھٹل داس نے جھنجھلا کر کہا: "جناب میری فکر اتنی رسا نہیں ہے۔ بھلے آدمی! آپ بھی اپنے تئیں انسان کہیں گے۔ کہاں تو وہ دھواں دھار تقریریں کرتے ہو۔ اور ایسے بلند جذبات سے پُر کہ معلوم ہوتا ہے۔ ساری دنیا سے مستغنی ہو۔ اور کہاں یہ محل وسوسے!"

پدم سنگھ نے خفیف ہو کر کہا: اس وقت آپ جو چاہیں کہیں۔
اس قسم کی ساری ذمہ داری آپ کے سر رہے گی۔

بھٹل داس۔ اچھا ایک تار تو دیدیجئے۔ یا اتنا بھی نہ ہوگا؟

پدم سنگھ نے اچھل کر کہا: ہاں میں تار دیدوں گا۔ میں تو جانتا تھا۔
کہ آپ کوئی نہ کوئی راہ فرار ضرور نکالیں گے۔ اب اگر کبھی بات آئی
تو کہہ دوں گا۔ کہ تار میں نے نہیں دیا تھا۔ کسی غیر شخص نے میرے نام
سے دے دیا ہوگا۔

مگر ایک ہی لمحہ میں ان کا خیال تبدیل ہو گیا۔ اپنے ضعف قلب
پر غیرت آئی۔ دل میں سوچا بھائی صاحب ایسے کم اندیش نہیں ہیں۔
کہ اس کا رخیرے لئے مجھ سے ناراض ہو جائیں۔ اور اگر ناراض بھی
ہوں۔ تو مجھے اس کی پروا نہ کرنی چاہئے؟

بھٹل۔ تو آج ہی تار دے دیجئے؟

پدم سنگھ۔ لیکن یہ سراسر جلسازی ہوگی؟

بھٹل۔ اس میں بھی کوئی شک ہے!

پدم سنگھ۔ میں بھی چلوں تو کیسا ہو؟

بھٹل۔ نہایت مناسب۔ سارا کام بن جائے یہ ایک بات بوجھ

احسن طے ہو جائے؟

پدم سنگھ۔ بہتر ہے۔ ہم اور آپ دونوں چلیں؟

بھٹل داس۔ تو کب؟

پدم سنگھ۔ بس آج تار دے دیتا ہوں۔ پرسوں شام کی گاڑی سے
چلے چلیں گے؟

بھٹل۔ طے ہو گیا نا؟
پدم سنگھ۔ جی ہاں مستقل طور پر۔ آپ میرے کان پکڑ کر کھینچ
لے جائیے گا۔

بھٹل داس نے اپنے سادہ دل دوست کو اعتقاد کی نظروں سے
دیکھا اور تب دونوں آدمی جل زنگ سننے جا بیٹھے جس کی دلاویز
صدائیں فضا میں گونج رہی تھیں۔

بند (۱۹) بند

جب ہم حصول صحت کے لئے آب و ہوا تبدیل کرنے جاتے
ہیں۔ تو خاص احتیاط کرتے ہیں۔ کہ ہم سے کوئی بد پرہیزی نہ ہو، مقررہ
وقت پر کھاتے ہیں۔ سیر کرتے ہیں۔ آرام کرتے ہیں۔ ہم کو ہر وقت اپنی
صحت کی فکر لگی رہتی ہے۔ سمن بدھوا آشرم میں روحانی نصیحت حاصل
کرنے گئی تھی اور اپنے مدعا کو ایک دم کے لئے بھی فراموش نہ کرتی
تھی۔ وہ اپنی بیوہ بہنوں کی خدمت میں حاضر رہتی۔ اور فرصت
کے وقت مذہبی کتابیں پڑھتی۔ روزگنگا اشنان کرنے جاتی ان
کاموں سے اس کے دل پر درد کو سکون ملتا تھا۔

بھٹل داس نے امولا کی خبریں اس سے چھپائی تھیں۔ لیکن

جب شانتا کو آشرم میں رکھنے کا قطعی فیصلہ ہو گیا۔ تو انہوں نے
سمن کو اس کے لئے تیار کرنا مناسب سمجھا۔ گنور صاحب کے
یہاں سے آکر انہوں نے اس کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔

آشرم میں سناٹا چھپا یا ہوا تھا۔ رات بہت جا چکی تھی۔ پر
سمن کو کسی طرح نیند نہ آتی تھی۔ اُسے آج اپنی غلط روی کا واقعی
صدمہ پورا ہوا تھا۔ جس طرح کوئی مریض کلوروفارم سونگھ لینے کے
بعد ہوش میں آکر اپنے چہرے پر ہونے پھوٹے کسے گہرے زخم کو
دیکھتا ہے۔ اور درد اور خوف سے پھر غش کھا جاتا ہے۔ وہی حالت
اس وقت سمن کی تھی۔ ماں باپ اور بہن۔ تینوں اُسے اپنے سامنے
بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ماں آشرم سے اور غم سے سر جھکائے
اداس ہو رہی تھی۔ باپ کھڑے اُس کی طرف غضبناک اور پرخون
آنکھوں سے تاک رہے تھے۔ اور شانتا حسرت اور یاس کی تصویر
بنی ہوئی کبھی زمین کی طرف دیکھتی تھی کبھی آسمان کی طرف بہن
طاثر حُروح کی طرح تڑپ اٹھی۔ وہ ایک عالم جنوں میں چار پائی سے
اٹھی۔ اور دیوار پر اپنا سر ٹک دیا۔ وہ اپنی ہی نگاہ میں اس وقت
بھتنی معلوم ہوتی تھی۔ سر میں چوٹ لگنے ہی وہ تیور اکر گر پڑی۔
ایک لمحہ کے بعد اُسے ہوش آیا۔ سر سے خون جاری تھا۔ اُس نے
آہستہ سے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ آنگن میں اندھیرا چھپا یا ہوا تھا۔
وہ لپکی ہوئی پھاٹک پر آئی۔ پر وہ بند تھا۔ اس نے نالے کو کئی بار

پلایا لیکن نہ کھول سکی۔ بوڑھا چوکیدار پھاٹک کے قریب ہی سو رہا تھا۔
 سمن آہستہ سے اس کے پاس آئی۔ اور اس کے بستر پر کنبی ٹٹولنے لگی۔
 چوکیدار چونک پڑا۔ اور چور چور چلائے لگا۔ سمن وہاں سے بے سناشا
 بھاگی۔ اور اپنے کمرہ میں آکر کیواڑ بند کر لئے۔ اس پر رقت کی کیفیت
 طاری ہو گئی۔ وہ بلک کر رونے لگی۔ ہائے! مجھ جیسی خانہ خراب عورت
 دنیا میں نہ ہوگی۔ میں نفس پروری کی ہوس میں اپنے خاندان کو غارت
 کر دیا۔ میں اپنے باپ کی قاتلہ ہوں۔ میں نے شانتا کی گردن پر چھڑی
 چلائی ہے۔ میں اسے یہ روئے سیاہ کیونکر دکھاؤں گی۔ اس کے
 سامنے کیونکر تاکوں گی۔ دادا نے جس وقت میری داستان سنی ہوگی
 انہیں کس قدر صدمہ ہوا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ پھر رونے لگی۔ یہ خیال
 اور سب تکلیفوں سے جانگزا تھا۔ اگر کرشن چندر سے یہ باتیں کہنے
 کے بجائے مدن سنگھ اُسے کو ٹھوس پل دیتے۔ ہاتھی کے پیروں سے
 کچلوا دیتے۔ آگ میں جھونک دیتے۔ گتوں سے نچوا دیتے۔ تو وہ ذرا
 بھی چوں نہ کرتی۔ وہ جس وقت گھر سے نکلی تھی۔ اُسے یہ گمان بھی نہ
 تھا۔ کہ مجھے دال منڈی میں بیٹھنا پڑے گا۔ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے
 نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اُس یاس اور اندوہ کی حالت میں اُسے کھول
 گیا تھا۔ کہ میرا باپ اور بہن بھی ہے، عرصہ دراز کی جدائی نے اس کے
 دل میں ان کی یاد ہی باقی نہ رکھی تھی۔ وہ دنیا میں اپنے کو اکیلی۔ بے یار
 و مددگار سمجھتی تھی۔ میں کسی دوسری دنیا میں ہوں۔ جہاں کوئی اپنا

شنا سا اپنا عزیز نہیں ہے۔ یہاں میں جو کچھ کروں کی۔ وہ چھپا رہے گا۔
 کوئی مجھ پر ہنسنے والا۔ مجھ پر آنسو بہانے والا نہیں ہے۔ پر اب ایسے
 اتفاق آپڑے تھے کہ وہ پھر اپنے تئیں عزیزوں اور یگانوں کے
 رشتہ میں بندھا ہوا پانی تھی جنہیں وہ بھول گئی تھی۔ وہ پھر اس کے
 سامنے آگئے تھے۔ اپنے یگانوں نے قرب نے اُس کی شمع غیرت کو
 روشن کر دیا۔

سمن نے باقی رات ایک روحانی عذاب کی حالت میں بسر کی۔ چار
 بجے پر جو نہی پھاٹک کھلا۔ وہ گنگا نشان کرنے چلی۔ وہ اکثر اکیلے ہی جایا
 کرتی تھی۔ اس لئے چوکیدار نے کچھ پوچھا نہیں۔
 گنگا کنارے پہنچ کر سمن اندھرا دھرتا کھنے لگی۔ وہ آج گنگا میں نہانے
 نہیں ڈوبنے آئی تھی۔ اُسے کسی قسم کا خوف گھبراہٹ یا اضطراب نہ
 تھا۔ کل کسی وقت شاننا آشرم میں آجائے گی۔ اس سے ملاقات کرنے
 کی بہ نسبت گنگا کی گود میں منہ چھپا لینا کتنا آسان تھا!
 ناگاہ اس نے دیکھا کہ کوئی آدمی اس کی طرف چلا آ رہا ہے۔ ابھی
 کچھ کچھ اندھیرا تھا۔ لیکن سمن کو اتنا معلوم ہو گیا کہ وہ سادھو ہے، سمن
 کی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی۔ اس نے ارادہ کیا کہ اسے سادھو کو
 دیدوں۔ لیکن جو نہی وہ قریب آیا۔ سمن نے شرم حقارت اور دہشت سے
 منہ چھپا لیا۔ یہ گمان نہ تھے!

سمن کھڑی تھی۔ گمان نہ اُس کے پیروں پر گر پڑے۔ اور کھڑی تھی۔

ہوئی آواز سے بولے "سمن میرا قصور معاف کر دے"

سمن ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی نظر دروں کے سامنے اس شب بربادی کا نقشہ کھینچ گیا۔ زخم تازہ ہو گیا۔ اُس کے جی میں آیا۔ کہ اسے خوب ذلیل کر دیں۔ کہوں کہ تم میرے باپ کے قاتل۔ میری زندگی کو تباہ کرنے والے ہو۔ پر کچھ گجانتہ کے ندامت میز انکسار۔ کچھ ان کے فقیرانہ بھیس اور کچھ اُس جوش عفو نے جو ایسی حالت میں دل پر طاری ہو جاتا ہے۔ اُسے بگھلا دیا۔ اُس کی آنکھیں بھرا آئیں۔ رقت آمیز لہجہ میں بولی "تمہارا کوئی قصور نہیں۔ جو کچھ ہوا وہ سب میرے کرموں کا پھل تھا۔"

گجانتہ۔ نہیں سمن ایسا نہ کہو۔ یہ سب میری جہالت اور حماقت کا پھل ہے۔ میں نے سوچا تھا۔ کہ اس کی کچھ پر اُٹھت کر سکوں گا لیکن اس کے مہلک نتائج دیکھ کر پر اُٹھت کی طرف سے مالوس ہو گیا آہ! میں نے انہیں آنکھوں سے پنڈت کرشن چندر کو گنگا میں ڈوبتے دیکھا ہے!

سمن نے بے تاب ہو کر پوچھا "کیا آپ اُس وقت وہاں موجود تھے؟"

گجانتہ۔ ہاں موجود تھا۔ میں رات کو امولا جارا تھا۔ راستہ میں مجھے مل گئے۔ مجھے آدھی رات کو انہیں ندی کی طرف جاتے دیکھ کر شبہ ہوا۔ انہیں اپنے ڈیرے پر لایا۔ اور انہیں تشفی دینے کی

کوشش کی، پھر یہ سمجھ کر کہ میرا منشا پورا ہو گیا۔ میں سو گیا، قصوری دیر
میں جب میری آنکھ کھلی۔ تو انہیں وہاں نہ دیکھا، فوراً گنگا کی طرف
دوڑا۔ اس وقت اُن کے پکارنے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔
لیکن جب تک میں یہ فیصلہ کر سکوں۔ کہ وہ کہاں ہیں۔ ہرجم لہروں
نے انہیں چھپا لیا، وہ نفس پاک میری آنکھوں کے سامنے جنت
کو سدھارا، تب مجھے معلوم ہوا۔ کہ میں نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔
معلوم نہیں ایشور کے یہاں اس کی کیا سزا ملے گی؟

گجانبند کی روحانی کونٹ نے سن کے دل پر وہی کام کیا۔ جو صابون
میل کے ساتھ کرتا ہے۔ اس نے دل میں بیٹھے ہوئے غبار کو اوپر کر دیا۔
وہ خیالات نکل پڑے۔ جنہیں وہ مخفی رکھنا چاہتی تھی۔ بولی۔ ایشور
نے تمہارے باطن کو روشن کر دیا ہے۔ تم اپنی نگو کاریوں سے چاہے
کچھ کر بھی لو۔ پر میری کیا گت ہوگی۔ میں تو دونوں جہاں سے گئی۔ ہائے
میری ہوس عیش نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اب کیا چھپاؤں تمہاری
غریبی اور اس سے زیادہ تمہارے دلازارانہ ہوتاؤں نے مجھے اپنی
حالت سے بیزار کر دیا تھا۔ اُس وقت اس پھپھو لے کو پھوٹنے کے
لئے ذرا سی ٹھیں بھی بہت تھی۔ تمہاری محبت۔ تمہاری ہمدردی۔
تمہاری ملائمت۔ تمہاری شفقت اس پھپھو لے پر ہم کام کرتی۔
لیکن تم نے اسے بے دردی کے ساتھ مسل دیا۔ میں درد سے بیتاب۔
بیہوش ہو گئی۔ تمہارے اس بے رحمانہ سلوک کو جب یاد کرتی ہوں

تو دل میں ایک شعلہ سادہ یک ٹھٹھتا ہے۔ اور تہ دل سے تمہارے لئے بددعا نکل آتی ہے۔ یہ میرا آخری وقت ہے۔ ایک لمحہ میں یہ گناہ آلود جسم گنگا میں ڈوب جائے گا۔ اس لئے ایشور سے اب دعا کرتی ہوں۔ کہ وہ تمہاری خطائیں معاف کرے۔ تم میرے اور اپنے گناہوں کی پرانشیت کر سکو۔“

گجاند نے متفکرانہ انداز سے کہا: سمن اگر جان دیدینے سے گناہوں کی پرانشیت ہو جاتی۔ تو میں اب تک کبھی کا جان دے چکا ہوتا ہوں۔“

سمن نے کہا: کم سے کم مصیبتوں کا تو خاتمہ ہو جائے گا۔“
 گجاند ہاں تمہاری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن ان کی مصیبتوں کا خاتمہ نہ ہو گا۔ جو تمہارے دکھ سے دکھی ہو رہے ہیں۔ تمہارے ماں باپ قید جسم سے آزاد ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کی روخیں تمہارے آس پاس پھر رہی ہیں۔ وہ اب بھی تمہارے سکھ سے سکھی اور تمہارے دکھ سے دکھی ہوں گی، سوچ لو۔ اپنی جان دے کر ان کی روحوں کو عذاب میں ڈالو گی۔ یا اپنی زندگی کو سدھار کر انہیں نجات دوں گی، یہ بھی سوچو۔ کہ تمہارے نہ رہنے سے اس بیکس شاننا کی کیا حالت ہو گی۔ جس نے ابھی تک زمانہ کا اونچ بیچ نہیں دیکھا۔ تمہارے سوا دنیا میں اس کا اور کون ہے؟ امانا خد کا حال تم جانتی ہو۔ وہ اس کا نباہ نہیں کر سکتے۔ ان میں رحم ہے۔ پر رحم سے

زیادہ لالچ ہے۔ کبھی نہ کبھی وہ اس سے ضرور ہی اپنا گلا چھڑالیں گے اس وقت وہ کس کی سو کر رہے گی؟

سمن کو گجاند کی باتوں میں سچی ہمدردی کی جھلک نظر آئی۔ اُس نے ان کی طرف عاجزانہ انداز سے دیکھ کر کہا: "اسی لئے میں نے گنگا میں ڈوبنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ شانتا سے ملاقات کرنے کے مقابلہ میں مجھے ڈوب مرنا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے۔ اس نے کئی دن ہوئے۔ پنڈت پدم سنگھ کے پاس ایک خط بھیجا تھا۔ امانا تھا اس کی شادی کسی دوسری جگہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسے منظور نہیں کرتی؟"

گجاند۔ دیوی ہے؟

سمن۔ شراجی بیچارے اور کیا کرتے۔ انہوں نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ اُسے لا کر آشرم میں رکھیں۔ اگر ان کے بھائی صاحب راضی ہو گئے۔ تب تو اچھا ہے۔ ورنہ اس دکھیا کو نہ معلوم کتنے دنوں تک آشرم میں رہنا پڑے گا۔ وہ کل یہاں آجائے گی۔ اس کے سامنے جانے کا خوف۔ اُس سے آنکھیں ملانے کی شرم مجھے مارے ڈالتی ہے۔ جب وہ ملاست کی نظروں سے میری طرف دیکھے گی۔ اس وقت میں کیا کروں گی؟ اور جو کہیں اُس نے نفرت کے باعث مجھ سے گلے ملنے سے پرہیز کیا۔ تب تو میں اسی وقت زہر کھالوں گی اس ذلت سے تو مر جانا ہی بہتر ہے؟

گجانتہ نے سمن کو ارادہ مندانہ نظروں سے دیکھا۔ انہیں محسوس
ہوا۔ کہ ایسی حالت میں میرے دل کی بھی وہی حالت ہوتی جو اس وقت
سمن کی ہو رہی ہے۔ بولے "سمن تمہاری باتیں سچی ہیں۔ لیکن تمہارے
دل پر چاہے جو کچھ گزرے شائستگی خاطر تمہیں سب کچھ برداشت کرنا پڑیگا۔
تمہاری ذات سے اس کی جتنی بھلائی ہو سکتی ہے۔ اتنی دوسرے کی ذات
سے ممکن نہیں۔ اب تک تم اپنے لئے جیتی تھیں۔ اب دوسروں کے
لئے جیو۔"

یہ کہہ کر گجانتہ جدھر سے آئے تھے۔ اُدھر ہی چلے گئے۔ سمن گنگا
کنارے دیر تک کھڑی ان کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ تب اُٹھ کر کے شرم
کی طرف چلی جیسے کوئی سپاہی جنگ میں شکست کھا کر سر جھکائے ہوئے
گھر کی طرف جاتا ہے۔

— غیب (۲۰) غیب —

شانتا نے پدم سنگھ کے نام خط تو لکھ دیا تھا۔ پر اُسے جواب کی
کوئی اُمید نہ تھی۔ تین دن گزر گئے۔ اُس کی مایوسی روز بروز بڑھتی
جاتی تھی۔ اگر موافق جواب نہ آیا۔ تو اُماناۃ ضرور ہی میری شادی کر
دیں گے۔ یہ سوچ کر اس کا دل کانپنے لگتا تھا۔ وہ دن میں کئی بار دیوچی
کے چہرے پر جاتی۔ اور طمع طرح کی منتیں مانتی۔ گھبی شیو جی
کے مندر میں جاتی۔ اور اُن سے اپنی مراد مانگتی۔ سدن ایک

لمحہ کے لئے بھی اس کے دھیان سے نہ اترتا تھا۔ وہ اس کی تصویر سے
مناطب ہو کر کستی پر ان ناٹھ۔ مجھے کیوں نہیں اپنا سہ؟ کیا بدنامی کے
خیال سے؟ ہائے کیا میری جان اتنی سستی ہے۔ کہ ان دایوں کے۔
تم مجھے ترک کر رہے ہو۔ مجھے آگ میں جھونک رہے ہو۔ محض اس لئے
کہ میں سمن کی بن سوں۔ یہی انصاف ہے! کہیں تم مجھے مل جاتے۔
میں تمہیں پکڑ لیتی۔ پھر دیکھتی۔ کہ تم مجھ سے کیسے بھاگتے ہو تم پھر
نہیں ہو۔ کہ میرے آنسوؤں سے نہ پھل جاؤ۔ تم اپنی آنکھوں سے
ایک بار میرا حال زار دیکھ لیتے۔ تو پھر تم سے نہ رہا جاتا۔ ہاں تم سے
ہرگز نہ رہا جاتا۔ تمہارا وسیع دل درد سے خالی نہیں ہو سکتا۔ کیا کروں؟
تمہیں اپنے دل کی حالت کیونکر دکھاؤں؟

چوتھے دن علی الصبح پدم سنگھ کا تار ملا شانتا سہم گئی۔ اُس کا
جذبہ الفت کچھ دھیما پڑ گیا۔ اپنی آنے والی حالت کے تفکرات نے
دل کو مشوش کر دیا۔

لیکن اماناٹھ پھولے نہ سائے۔ یا جے کا انتظام کیا۔ سواریاں
جمع کیں۔ سارے گاؤں میں نوید بھیجی چو پال میں فرش فروش بچھوائے
گاؤں کے لوگ حیران تھے۔ کہ یہ کیسا گونہ ہے؟ شادی تو ہوئی ہی
نہیں۔ گونہ کیسا؟ وہ سمجھتے تھے۔ کہ اماناٹھ نے کوئی نہ کوئی چال
چلی ہے۔ ایک خزانٹ ہے۔ وقت معینہ پر اماناٹھ اسٹیشن گئے
اور باجے بچوائے ہوئے ہمانوں کو گھر لائے۔ اور چو پال میں انہیں

اُتارا۔ صرف تین آدمی تھے۔ بھٹل داس۔ پدم سنگھ اور نیک
ملازم۔

دوسرے دن شام کے وقت رخصتی کی صورت تھی۔ تیسرا
پہر ہو گیا۔ مگر اماناتہ کے گھر میں گاؤں کی کوئی عورت نظر نہیں آتی۔
وہ بار بار اندر آتے ہیں۔ تیور بدلتے ہیں۔ دیواروں کو دھمکا کر کہتے
ہیں۔ میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔ جاٹھوی سے بگڑ کر کہتے ہیں۔
میں ان سبھوں کی خبر لوں گا۔ لیکن وہ دھمکیاں جو کبھی نمبرداروں
کا زہرہ آب کر دیا کرتی تھیں۔ آج کسی پر اثر نہیں کرتیں۔ برادری
بیجا دباؤ نہیں برداشت کرتی۔ سخت اور تکبر کا سرنچا کرنے کے
لئے وہ ایسے ہی موقعوں کی منتظر رہتی ہے۔

شام ہوئی۔ کماروں نے پالکی دروازہ پر لگا دی۔ جاٹھوی
اور شاننا خوب گلے مل کر روئیں۔ شاننا کا دل درد محبت سے بھرا
ہوا تھا۔ اس گھر میں اُس نے جو جو مصیبتیں جھیلیں وہ سب اس
وقت بھول گئی تھیں۔ ان لوگوں سے اب پھر ملاقات نہ ہوگی۔
اس گھر کے درو دیوار کے پھر درشن نہ ہوں گے۔ ان سے ہمیشہ
کے لئے رشتہ ٹوٹتا ہے۔ اس خیال سے اس کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے
ہوا جاتا تھا۔ جاٹھوی کے دل میں بھی ہمدردانہ رحم کی موجیں اُٹھ
رہی تھیں۔ اس غریب یتیم لڑکی کو ہماری ذات سے بہت تکلیف
ہوئی۔ یہ سوچ کر وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکتی تھی۔ دونوں

کے دل خالص سچے اور نازک جذبات سے اُٹے ہوئے
تھے۔

اُمانا تھ گھر میں آئے۔ تو شانتا ان کے پیروں سے لیٹ گئی۔
اور بین کر کے رونے لگی۔ "تمہیں میرے باپ ہو۔ اپنی اس بد نصیب
بیٹی کو بھول نہ جانا۔ میری بہنوں کو گھسنے کپڑے دینا۔ ہولی اور
تیجے میں بلانا۔ لیکن میں تمہارے دو حرفوں ہی کو نعمت سمجھوں گی۔"
اُمانا تھ نے اُسے تشفی دیتے ہوئے کہا "بیٹی میری جیسی دو بیٹیاں ہیں
وہی ہی ایک تم بھی ہو۔ پر مانتا تمہیں ہمیشہ آرام سے رکھے۔ یہ کہہ کر
وہ رونے لگے۔

شام کا وقت تھا۔ مٹی گائے گھر آئی۔ تو شانتا اس کے گلے
سے چپٹ کر رونے لگی۔ اس نے تین چار سال تک اس گائے کی
خدمت کی تھی۔ اب وہ کس کے لئے بھوسا لے کر دوڑے گی؟
کس کے گلے میں کالے ڈورے میں کوڑیاں گوندھ کر پھنسا ئیگی؟
مٹی سر جھکائے اُس کے ہاتھوں کو چاٹتی تھی۔ اس کا درد فراق اُس
کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

جانھوی نے شانتا کو لا کر پالکی میں بٹھا دیا۔ کساروں نے
پالکی اٹھائی۔ شانتا کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا میں گھر سے پانی میں
بھی جا رہی ہوں۔

گاؤں کی عورتیں اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی پالکی کو دیکھتی

تھیں۔ اور روتی تھیں۔

اُماناٹھ اسٹیشن تک لوگوں کو پہنچانے گئے۔ چلتے وقت اپنی
پگڑی اُتار کر پدم سنگھ کے پیروں پر رکھ دی۔ پدم سنگھ نے انہیں گلے
سے لگا لیا۔

جب گاڑی چلی۔ تو پدم سنگھ نے بھٹل داس سے کہا: اب اس
ڈرامے کا سب سے مشکل حصہ آگیا۔

بھٹل داس۔ میں آپ کا منشا نہیں سمجھا۔
پدم سنگھ۔ کیا ثنائی سے کچھ کہے بغیر ہی اُسے آشرم میں پہنچا
دیکھئے گا: اُسے پہلے سے تیار رکھنا چاہئے۔

بھٹل داس۔ ہاں۔ یہ آپ نے خوب یاد دلایا۔ تو جا کر
کدوؤں؟
پدم سنگھ۔ ذرا سوچ تو لیجئے۔ کیا کہئے گا۔ ابھی تو یہ سمجھ رہی
ہے۔ کہ میں سُسرال جا رہی ہوں۔ صدمہ غم میں یہ اُمید اُسے سنبھالے
ہوئے ہے۔ لیکن جب اُسے ہماری حرفتیں معلوم ہو جائیں گی۔ تو
اُسے کتنا رنج ہوگا! مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ کہ میں نے پہلے ہی یہ راز
کیوں نہ کہہ دیا۔

بھٹل داس۔ تو اب کہہ دینے میں کیا بگڑا جاتا ہے۔ مرزا پور
میں گاڑی دیر تک ٹھہرے گی۔ میں جا کر اُسے سمجھا دوں گا۔
پدم سنگھ۔ مجھ سے سخت غلطی ہوئی۔

بھٹل داس۔ اگر اس غلطی پر پچھتا نے ہی سے کام چل جائے۔ تو
خوب جی بھر کر پچھتا لیجئے:

پدم سنگھ۔ اگر آپ کے پاس پنسل ہو۔ تو لائیے۔ اُسے ایک خط
لکھ کر سارا حال روشن کر دیں:

بھٹل داس۔ نہیں تا ر دیدیجئے۔ یہ اور بھی بہتر ہوگا۔ آپ
عجیب آدمی ہیں۔ سیدھی سی بات میں اس قدر پس و پیش کرنے
لگتے ہیں:

پدم سنگھ۔ موقع ہی ایسا آ پڑا ہے۔ میں کیا کروں۔ ایک بات
میری سمجھ میں آتی ہے۔ مغسراٹے میں دیر تک رُکنا پڑے گا۔ بس میں
اس کے پاس جا کر سب ماجرا کہہ سناؤں:

بھٹل داس۔ یہ آپ بہت دور کی کوڑی لائے۔ اسی لئے
عقل مندوں نے کہا ہے۔ کہ کوئی کام بلا سمجھے نہ کرنا چاہئے +
آپ کی عقل راستہ پر آتی ہے۔ لیکن بہت جگہ گھما کر۔ یہی بات آپ
کو پہلے نہ سوچھی:

شاننا ڈیوڑھے درجہ کے زنانے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔
وہاں دو عیسائی لیدیاں اور بھی بیٹھی تھیں۔ وہ شاننا کو دیکھ کر انگریزی
میں باتیں کرنے لگیں:

”معلوم ہوتا ہے۔ یہ لڑکی سسرال جا رہی ہے۔“
”ایسا دوری ہے۔ گویا کوئی ڈھکیلے لئے جاتا ہو۔“

”شوہر کی ابھی تک صورت ہی نہ دیکھی ہوگی۔ محبت کیونکر ہو
 سکتی ہے۔ مارے خوف کے بے حال ہوئی جاتی ہے۔“
 ”یہ ان کے یہاں نہایت یہودہ رواج ہے۔ بیچاری لڑکی غیروں میں
 بھیج دی جاتی ہے۔ جہاں کوئی اس کا ہمدرد نہیں ہوتا۔“
 ”یہ اسی دور تحش کی باقیات ہیں۔ جب لوگ لڑکیوں کو بزور اکھاڑ
 لے جاتے تھے۔“

ایک لیڈی نے شانتا سے پوچھا: ”کیوں بائی جی۔ سسرال جا رہی
 ہو؟“

شانتا نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا: ”ہاں۔“
 ”تم اتنی خوب رو ہو تمہارا شوہر بھی تمہارے ہی جوڑ کا ہے؟“
 شانتا نے متانت سے جواب دیا: ”شوہر میں خوبصورتی نہیں دیکھی
 جاتی؟“

اگر وہ کالا کلوٹا ہو تو؟“

شانتا نے پُر غور لہجہ میں جواب دیا: ”ہمارے لئے وہ دیوتا ہے
 چاہے کیسا ہی ہو۔“

”اچھا مان لو تمہارے سامنے دو آدمی آئیں۔ ایک خوب صورت ہو
 دوسرا کمزور۔ تو تم سے پہلے کروگی؟“

شانتا نے مستقل انداز سے کہا: ”جیسے ہمارے ماں باپ پنہر

کر رہے۔“

شاننا سمجھ رہی تھی۔ کہ یہ دونوں لیڈیاں ہمارے طریق ازدواج پر
آوازے کس رہی ہیں۔ وہ اس کا جواب دینا ضروری سمجھتی تھی۔ بھٹوڑی دیر
کے بعد اس نے پوچھا: ”میں نے سنا ہے۔ آپ لوگ اپنے شوہر خود چُن
لیتی ہیں؟“

”ہاں۔ اس معاملہ میں ہم کو کامل آزادی ہے۔“
”آپ اپنے سب والدین سے زیادہ عقل مند سمجھتی ہیں؟“
ہمارے والدین کیا جان سکتے ہیں۔ کہ ہم کو اُن کے چنے ہوئے شوہر
سے محبت ہوگی یا نہیں؟“

”تو آپ شادی میں محبت کو اول سمجھتی ہیں؟“
”ہاں اور کیا۔ شادی محبت کا رشتہ ہے۔“
”ہم لوگ شادی کو دھرم کا رشتہ سمجھتے ہیں۔ ہماری محبت دھرم کے
پیچھے پیچھے چلتی ہے۔“

لونبجے گاڑی مغسرائے پنچی بٹھل داس نے آکر شاننا کو اتارا۔
اور ذرا دیر بٹ کر پلیٹ فارم پر ایک قالین بچھا کر اسے بٹھا دیا۔ بنارس
کی گاڑی کے کھلنے میں آدھ گھنٹہ کی دیر تھی۔

شاننا نے دیکھا۔ کہ ہزاروں آدمی سر پر بڑے بڑے گھڑ رکھے ایک
تنگ دروازہ کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور باہر نکلنے کے لئے ایک دوسرے
پر گرے پڑتے ہیں۔ ایک دوسرے تنگ دروازہ پر ہزاروں آدمی اندر
آنے کے لئے دھکم دھکا کر رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ایک چوڑے

دروازہ سے انگریز لوگ چھڑی کھماتے۔ کتوں کو لئے لیڈیوں سے ہاتھ ملائے۔ بہ آسائش آتے جاتے ہیں۔ کوئی انہیں نہیں روکتا۔ کوئی ان سے نہیں بولتا۔ پولیس کے ملازم بھی جھجک جھجک انہیں سلام کرتے ہیں۔

اتنے میں پنڈت پدم سنگھ اس کے قریب آئے۔ اور پوچھے۔ شانتا میں تمہارا دھرم پتا پدم سنگھ ہوں۔

شانتا کھڑی ہو گئی۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ کر انہیں پرنام کیا۔ پدم سنگھ نے کہا۔ تمہیں تعجب ہو رہا ہوگا۔ کہ ہم لوگ چنار کیوں نہیں اترے۔ اس کا سبب یہی ہے۔ کہ ابھی تک میں نے بھائی صاحب سے تمہاری بابت کچھ نہیں پوچھا۔ تمہارا خط پا کر میں ایسا کھرا یا۔ کہ مجھے پہلے تمہیں امولا سے رخصت کرانا سب سے ضروری معلوم ہوا۔ بھائی صاحب سے کچھ کہنے سننے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ اس لئے ابھی کچھ دنوں تک تمہیں بنارس رہنا پڑے گا۔ میں نے تجویز کی ہے۔ کہ تمہیں اس وقت اُسی آشرم میں ٹھہراؤں۔ جہاں آج کل تمہاری بہن سمن رہتی ہے۔ سمن کے ساتھ رہنے میں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ تم نے سمن کے متعلق جو شرمناک افواہیں سنی ہیں۔ انہیں دل سے نکال ڈالو۔ اب دیوی ہے۔ اس کی زندگی اب نمونہ کے قابل ہو گئی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو میں تمہیں اس کے ساتھ رکھنے پر ہرگز راضی نہ ہوتا۔ ہمیں دو ہمینہ ہیں میں بھائی صاحب کو راضی کر لوں گا۔ اگر تمہیں یہ انتظام پسند

ہو۔ تو مجھ سے صاف صاف کہہ دو۔ تاکہ میں کوئی دوسری فکر کر دوں۔
 پدم سنگھ نے ان الفاظ کو بڑی مشکل سے ختم کیا۔ سمن کی انہوں
 نے جو تعریف کی تھی۔ اُس پر انہیں خود اعتبار نہ تھا۔ بدن سنگھ کے
 متعلق بھی وہ اس سے زیادہ کہہ گئے جتنا وہ کہنا چاہتے تھے انہیں
 اس بھولی بھالی لڑکی کو اس طرح مغالطہ دیتے ہوئے روحانی صدمہ
 پہن رہا تھا۔

شانتا روتی ہوئی پدم سنگھ کے پیروں پر گر پڑی۔ اور یہ الفاظ
 اس کے منہ سے نکلے۔ "میں اب آپ کی شرمن ہوں۔ جو مناسب سمجھے وہ
 کیجئے۔" شرم۔ یاس اور غم کا اظہار ان سے بہتر لفظوں میں نہیں ہو
 سکتا تھا۔

شانتا کے دل پر سے ایک بوجھ سا اٹھ گیا۔ اب اسے اپنے
 مستقبل کی بابت کسی اندیشہ کی ضرورت نہ تھی۔ اُسے کچھ دلوں کے لئے
 اپنی زندگی کا راستہ معین نظر آنے لگا۔ اس وقت اُس کی حالت اس
 آدمی کی سی تھی۔ جو اپنے جھونپڑے میں آگ لگ جانے سے اس
 لئے خوش ہو۔ کہ کچھ دیر کے لئے وہ تاریکی کے خوف سے آزاد
 ہو جائے گا۔

گیارہ بجے یہ لوگ آشرم میں داخل ہوئے۔ بھٹل داس اترے
 کہ جا کر سمن بابی کو خبر دوں۔ پر دیکھا۔ تو وہ بخار سے بہوش پڑی ہوئی
 تھی۔ آشرم کی کئی عورتیں اُس کی تیمارداری میں مصروف تھیں۔

کئی عورتوں نے شانتا کو گاڑی سے اتارا۔ شانتا آہستہ آہستہ
 صحن کے کمرہ میں گئی۔ اور اس نئے سرہانے کھڑی ہو کر بولی: "ہن۔"
 سمن نے آنکھیں کھول دیں۔ شانتا مورت کی طرح کھڑی اپنی
 ہن کو دلسوز اور پُر آب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔
 یہ میری وہی پیاری ہن ہے جس کے ساتھ میں تین چار سال قبل کھیل
 کرتی تھی۔ وہ لمبے لمبے سیاہ گیسو کہاں ہیں؟ وہ کندن سادھنا ہوا
 رخ روشن کہاں ہے؟ وہ شوخ مسکراتی ہوئی آنکھیں کہاں گئیں۔
 وہ اینگور سے بھرا ہوا جسم۔ وہ لب گلفام۔ وہ قدرِ عنا۔ وہ نزاکت۔
 وہ ملاحت کہاں غائب ہو گئیں؟ یہ سمن ہے یا اس کی لاش! شانتا
 کا دل درد اور پریم سے اُٹھ آیا۔ اس نے دوسری عورتوں کو وہاں سے
 ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ اور تب وہ روتی ہوئی سمن کے گلے
 سے لپٹ گئی۔ اور بولی: "ہن کیسی طبیعت ہے؟ تمہاری شانتی
 کھڑی ہے؟"

سمن نے آنکھیں کھولیں۔ اور شانتا کو وحشت آمیز لگا ہوں
 سے دیکھ کر بولی: "کون شانتی؟ ہٹ جا: مجھے مت چھو۔ میں ابھاگنی ہوں
 میں۔ دسیا ہوں۔ تو دیوی ہے۔ تو پاک نفس ہے۔ میرے قریب مت
 آ۔ یہاں سے بھاگ جا۔"

یہ کہتے کہتے سمن پھر بیہوش ہو گئی۔ شانتا ساری رات سمن کے
 پاس بیٹھی پنکھا جھلتی رہی۔

حبیب (۲۱) حبیب

شانتا کو آشرم میں آئے ایک ماہ سے زائد ہو گیا۔ لیکن پدم سنگھ نے ابھی تک اپنے گھر میں کسی سے اس کا چرچا نہیں کیا، کبھی سوچتے۔ بھائی صاحب کو خط لکھوں۔ کبھی سوچتے چل کر اُن سے خود کموں۔ کبھی بٹھل داس کو بھیجنے کا خیال کرتے۔ لیکن کوئی قطعی رائے نہ قائم کر سکتے تھے۔

ادھر اُن کے احباب اخراج کی تجویز کو بورڈ میں پیش کرنے کے لئے اصرار کر رہے تھے۔ انہیں اُس کی کامیابی کی پوری امید تھی۔ یونٹ ہوتا تھا۔ کہ تاخیر سے کوئی نیا رخ نہ پیدا ہو جائے۔ پدم سنگھ ان لوگوں کو بھی ٹالتے آتے تھے۔ یہاں تک کہ مئی کا مہینہ آ گیا۔ اور اب بٹھل داس اور پروفیسر رویش دت نے انہیں اتنا تنگ کیا۔ کہ انہیں مجبور ہو کر بورڈ میں باضابطہ طور پر اپنی تجویز کی اطلاع کرنا پڑی۔ دن اور وقت معین ہو گیا۔

جوں جوں دن قریب آتا جاتا تھا۔ پدم سنگھ کا انتشار قاب بڑھتا جاتا تھا۔ انہیں محسوس ہوتا تھا۔ کہ محض اس تجویز کے منظور ہو جانے سے مقصود نہ حاصل ہوگا۔ اسے عملی صورت میں لانے کے لئے شہر کے جملہ معززین کی ہمدردی اور امداد کی ضرورت ہوگی۔ اسی لئے وہ حاجی ہاشم کو کسی نہ کسی طرح اپنے موافق حال بنانا چاہتے

فقہ۔ حاجی صاحب کا شہر میں اتنا دباؤ تھا۔ کہ ارباب نشاط بھی ان کی مرضی کی خلاف ورزی نہ کر سکتی تھیں۔ بالآخر حاجی صاحب بھی پگھل گئے۔ انہیں پدم سنگھ کی نیک نیتی پر یقین آگیا۔

آج بورڈ میں یہ تجویز پیش ہوگی۔ میونسپل کورٹ کے احاطہ میں بڑی بھڑ بھڑ ہے۔ فوج حسن نے خوب مسلح ہو کر اپنی پوری جمعیت سے بورڈ پر حملہ کیا ہے۔ دیکھیں بورڈ کی کیا حالت ہوتی ہے۔

بورڈ کی کارروائی شروع ہو گئی جملہ اراکین جلوہ افروز ہیں۔ ڈاکٹر شیا ماچرن نے سپاڑ پر جانا ملتوی کر دیا ہے۔ منشی ابوالوفا کو تو آج رات بھر نیند نہیں آئی۔ وہ کبھی اندر جاتے ہیں کبھی باہر آتے ہیں۔ ان کا جوش اور انہماک آج اعتدال سے متجاوز ہو گیا ہے۔

پدم سنگھ نے اپنی تجویز پیش کی۔ اور تلے ہوئے الفاظ میں اس کی تصریح کی۔ یہ تین حصوں میں منقسم تھی۔

(۱) طبع الفول کو شہر کے مرکزی مقامات سے ہٹا کر بستی سے دور رکھا جائے۔

(۲) انہیں شہر کی خاص سیرگاہوں اور باغوں میں آنے کی ممانعت کی جائے۔

رقص کی مجلسوں پر ایک شدید ٹیکس لگایا جائے۔ اور ایسے جلسے کسی حالت میں کھلے مقامات میں نہ کئے جائیں۔

پروفیسر رومیٹش دت نے اس تجویز کی تائید کی۔

سید شفقت علی نے فرمایا: ”مجھے اس تجویز سے اتفاق کُلّی ہے لیکن
 بغیر مناسب ترمیم کے میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔ میری رائے ہے۔
 کہ تجویز کے پہلے حصّہ میں یہ الفاظ بڑھادئے جائیں: ”بہ استثناء
 اُن کے جو نو ماہ کے اندر اپنا نکاح کر لیں۔ یا کوئی ایسا ہنر سیکھ لیں جس
 سے وہ جائز طریق پر اپنی زندگی بسر کریں۔“

کنور احمد صاحب نے فرمایا: ”مجھے اس ترمیم سے کامل اتفاق
 ہے ہمیں اس طبقہ کو قابل نفرت سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ
 ہماری عین کج فہمی ہے۔ ہم جو شب و روز رشوتیں لیتے ہیں۔ سود
 کھاتے ہیں۔ غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ پکیسوں کا گلا کاٹتے ہیں۔
 ہرگز اس قابل نہیں ہیں۔ کہ جمہور کے کسی حصّہ کو حقیر سمجھیں۔
 سب سے ذلیل ہم ہیں۔ سب سے بڑے گنہگار۔ بدکار۔ اور سبہ کار
 ہم ہیں۔ جو اپنے تئیں مذہب۔ ممتاز۔ منور اور مرفع سمجھتے ہیں۔
 ہمارے مذہب برادران وطن ہی کی بدولت دال منڈی آباد
 ہے۔ چوک میں چیل پیل ہے۔ چکلوں میں ردق ہے۔ یہ مینا بازار
 ہمیں لوگوں نے سجایا ہے۔ یہ چڑیاں ہمیں لوگوں نے پھنسی
 ہیں۔ یہ کٹھ پتلیاں ہمیں نے بنائی ہیں۔ جس قوم میں جابر زمیندار
 رشوت خوار عمال سرکار۔ خون آشام مہاجن اور خود غرض عزیز اور دوست
 اعزاز اور وقار کے قابل سمجھے جائیں۔ دال منڈی کیوں نہ آباد
 ہو۔ حرام کی دولت حرام کاری کے سوا اور کہاں جاسکتی ہے؟ جس

دن نذرانہ۔ رشوت۔ سود در سود اور ناجائز منافعہ کا خاتمہ ہوگا۔ اسی روز دال منڈی ویران ہو جائے گی۔ وہ چڑیاں اڑ جائیں گی۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں۔ خاص تجویز اس ترمیم کے بغیر نشتر کا وہ زخم ہے جس پر مریم نہیں۔ میں اُسے قبول نہیں کر سکتا۔

پنڈت پر بھا کر راؤ نے فرمایا ”میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس ترمیم کو اصل رزولوشن سے کیا تعلق ہے۔ اسے آپ الگ ایک دوسری تجویز کی صورت میں پیش کر سکتے ہیں۔ اس طبقہ کی اصلاح کے لئے آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ تمام تر قابل تائش ہے۔ لیکن کام بستی سے ہٹ کر بھی اتنا ہی آسان یا مشکل ہے۔ جتنا شہر کے اندر۔ بلکہ باہر اس کا زیادہ سہل الحصول ہونا ممکن ہے۔“

منشی ابوالوفابو لے ”مجھے اس ترمیم سے پورا اتفاق ہے۔“
منشی عبد اللطیف نے فرمایا ”اس ترمیم کے بغیر تجویز ہرگز قابل پذیرائی نہیں۔“

دینا ناگہ تیواری نے بھی ترمیم پر زور دیا۔
سید تیغ علی نے فرمایا ”اس ترمیم سے اصل تجویز کی منشا کے فوت ہونے کا احتمال ہے۔ آپ تو ایک مکان کا صدر دروازہ بند کر کے عقب کی طرف ایک دوسرا دروازہ کھول رہے ہیں۔ یہ غیر ممکن ہے۔ کہ وہ عورتیں جو اب تک عیش اور تکلف کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ مشقت اور مزدوری کی زندگی بسر کرنے پر رضا مند ہو

جائیں۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ وہ اس ترمیم سے ناچار فائدے اٹھائیں گی۔
 کوئی اپنے بالا خانہ پر سنگری کی ایک مشین رکھ کر اپنا بچاؤ کر لے گی۔
 کوئی موزے کی ایک مشین رکھ لے گی۔ کوئی پان کی دکان کھول
 لے گی۔ کوئی اپنے بالا خانہ پر سیب اور انار کے خوائے سجادے کی۔
 نقلی نکاحوں اور فرضی شادیوں کا بازار گرم ہو جائے گا۔ اور اس
 پردہ کی آرٹ میں پہلے سے بھی زیادہ حرام کاریاں ہونے لگیں گی۔
 اس ترمیم کو منظور کرنا انسانی خصلت سے بیگانگی کا اظہار کرنا
 ہے۔“

حکیم شہرت خاں نے کہا: ”مجھے سید تیغ علی صاحب کے خیالات
 بجا معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے ان خبیث ہستیوں کو شہر بدر کر دینا چاہیے
 اس کے بعد اگر وہ جائز طریق پر زندگی بسر کرنا چاہیں۔ تو کافی اطمینان
 کے بعد انہیں امتحاناً شہر میں آباد ہونے کی اجازت دینی چاہئے۔
 شہر کا دروازہ کسی پر بند نہیں ہے۔ مجھے کامل یقین ہے۔ کہ ترمیم
 سے اس تجویز کا مقصد غائب ہو جائے گا۔“

مسٹر شا کریگ نے فرمایا: ”ملکی معاملات میں مصلحت چاہے
 کتنی ہی قابل تعریف ہو۔ لیکن اخلاقی معاملات میں وہ سراسر قابل
 اعتراض ہے۔ اس سے اخلاقی مکروہات پر صرف پردہ پڑ جاتا ہے۔ ان
 کا ازالہ نہیں ہوتا۔“

پنڈت پدم سنگھ خاموش بیٹھ ہوئے اراکین کی موافق اور

مخالف رائیں غور سے سُن رہے تھے۔ سید شفقت علی کے طرز استدلال نے اُن کے دل پر ایک خاص اثر کیا تھا۔ کنور صاحب کے پُر حقیقت الفاظ نے اس اثر کو اور بھی قوی کر دیا تھا۔ انہیں فی الواقع یہ سراسر ظلم معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان عورتوں کو بیرحمی سے شہر کے باہر نکال دیا جائے۔ دیگر اصحاب نے اس ترمیم پر جو اعتراضات کئے وہ انکی نظروں میں بالکل نہ چپے۔ وہ دیر تک شش و پنج میں رہنے کے بعد بولے۔ ”چونکہ اس تجویز سے ہمارا منشا اس طبقہ کو تکلیف دینا نہیں۔ بلکہ ان کی اصلاح کرنا ہے۔ اس لئے مجھے اس ترمیم کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے۔“

صدر جلسہ نے ترمیم پر ممبروں کی رائے لی۔ آٹھ رائیں مخالف تھیں۔ اور آٹھ موافق۔ سید بل بھدر داس نے اس کے موافق رائے دی۔ ڈاکٹر ثیاہ چرن نے کسی طرف سے زبان نہیں کھولی۔ ترمیم پاس ہو گئی۔

تب اصل تجویز کے پہلے حصہ پر رائیں طلب کیں۔ ۹ موافق تھیں اور آٹھ مخالف۔ یہ حصہ منظور ہو گیا۔

پروفیسر دیمیش دت۔ مسٹر رستم بھائی اور پنڈت پر بھاکر راؤ نے اس ترمیم کے منظور ہونے میں اپنی شکست سمجھی۔ اور پدم سنگھ کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا۔ گویا انہوں نے دغا کی ہے۔

منشی ابوالوفا اور ان کے احباب ایسے خوش تھے۔ گویا ان کی

فتح ہوئی۔ ان کی یہ مسرت پر بھا کر راؤ اور ان کے حامیوں کے دل
میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔

تجویز کے دوسرے حصے پر رائے لی گئی۔ پر بھا کر راؤ اور ان کے
حامیوں نے اب کے اس کی مخالفت کی۔ وہ پدم سنگھ کو انحراف
کی سزا دینی چاہتے تھے۔ یہ حصہ نامنظور ہو گیا۔ منشی ابوالوفا اور
ان کے احباب بغلیں بجانے لگے۔

اب تجویز کے تیسرے حصے کی باری آئی۔ کنور صاحب نے
اس کی تائید کی۔ حکیم شہرت خان۔ ستید شفقت علی۔ شریف حسن
اور شا کریم نے بھی اس سے موافقت ظاہر کی۔ لیکن پر بھا کر راؤ
اور ان کے احباب نے اس کی بھی مخالفت کی۔ ترمیم کے پاس
ہو جانے کے بعد انہیں اب اس معاملہ میں اور بھی کوششیں
بے سود معلوم ہوتی تھیں۔ یہ تینوں اصحاب ان لوگوں میں
تھے جو ”سب“ یا ”کچھ نہیں“ کے اصول پر چلتے ہیں۔ تجویز کا یہ حصہ
بھی نامنظور ہو گیا۔

کچھ رات گئے جلسہ برخواست ہوا۔ جنہیں ہار کا خوف تھا۔ وہ
ہوئے نکلے جنہیں جیت کا یقین تھا۔ ان کے چہروں پر اُرداسی
چھائی ہوئی تھی۔

چلتے وقت کنور صاحب نے رستم بھائی سے کہا: ”یہ آپ لوگوں نے
کیا کر دیا؟“

رستم بھائی نے طنز آمیز لہجہ میں کہا: جو آپ نے کیا وہی ہم نے بھی کیا۔
آپ نے گھرے میں سوراخ کر دیا۔ ہم نے اسے ٹپک دیا۔ نتیجہ دونوں کا
ایک ہے؟

سب لوگ چلے گئے۔ اندھیرا گرا ہو گیا۔ چوکیدار اور مالی بھی بھاگ
بزد کر کے چل دئے۔ لیکن پدم سنگھ وہیں کھاس پر مغموں اور متفکر بیٹھے
ہوئے تھے۔

باب (۲۲) —————

پدم سنگھ کا دل کسی طرح یہ تسلیم نہ کرتا تھا۔ کہ اس ترمیم کے قبول کرنے
میں مجھ سے کوئی غلطی ہوئی۔ انہیں مطلق گمان نہ تھا۔ کہ میرے احباب
ایک فروعی بات پر مجھ سے ایسی مخالفت کریں گے۔ انہیں اپنی تجویز کے
دو حصوں کے رد ہو جانے کا ملال نہ تھا۔ ملال یہ تھا۔ کہ اس کا الزام انہیں
کے سر منڈھا جانا تھا۔ حالاں کہ انہیں یہ سراسر اپنے معادین کی تنگ
دلی اور نا عاقبت اندیشی معلوم ہوتی تھی۔ اس ترمیم کو وہ ابھی تک ضمنی
ہی سمجھتے تھے۔ اس کے ناجائز استعمال کے متعلق جو اندیشے ظاہر کئے
گئے۔ ان پر انہیں مطلق اعتماد نہ تھا۔ ان پر اب یہ روشن ہوتا جاتا تھا۔
کہ موجودہ طرز معاشرت کے ہوتے ہوئے اس تجویز سے جو امیدیں کی
گئی تھیں۔ اُن کے پورے ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ کبھی کبھی
پچھتاتے تھے۔ کہ میں نے ناحق یہ درد سر مول لیا۔ انہیں تعجب ہوتا

تھا۔ کہ میں کیونکہ اس خارستان میں الجھا۔ اگر اس تجویز کی بے اثری کی ساری
 ذمہ داری اس ترمیم کے سر جا پڑتی۔ تو وہ اپنے تئیں ایک بار عظیم سے
 سبکدوش سمجھتے۔ پر یہ ہونے والی نہیں۔ اب ساری بدنامی مجھی پر آئے گی
 مخالفین میرا ہی مضحکہ اڑائیں گے۔ میرے ہی طرز عمل پر نکتہ چینیاں
 کریں گے۔ اور یہ ساری رسوائی مجھے تنہا برداشت کرنی پڑے گی۔
 کوئی میرا دوست نہیں بھٹل دس سے اُمید تھی۔ کہ وہ میرے ساتھ
 انصاف کریں گے۔ میرے روٹھے ہوئے دوستوں کو منالائیں گے۔
 لیکن بھٹل داس نے الٹا مجھی کو خطا وار ٹھہرایا۔ پدم سنگھ کے حامیوں
 میں صرف کنورا زده سنگھ ہی ایک ایسے آدمی تھے۔ جو اُن کے دل پر غم
 کو تسلی دیتے رہتے تھے۔
 پورے مہینہ بھر پدم سنگھ کچھری نہ جاسکے۔ بس تنہا افسردگی کی
 حالت میں بیٹھے ہوئے اسی خلجان میں پڑے رہتے تھے۔ ان کے
 خیالات میں اب ایک خاص رواداری پیدا ہو گئی تھی۔ دوستوں۔
 کی مخالفت سے انہیں یہ سبق ملتا تھا۔ کہ جب ایسے بیدار مغز ایسے
 صائب الرائے اشخاص ایک ذرا سی بات پر اپنے مسلمہ اصولوں سے
 منحرف ہو سکتے ہیں۔ تو اس قوم کا بڑا پر ماتما ہی پار لگائے۔ مانا کہ
 میں نے اس ترمیم کے قبول کرنے میں غلطی کی۔ جہالت کی حماقت کی۔
 لیکن میری حماقت نے انہیں کیوں کجروی پر بائل کیا؟
 پدم سنگھ کو اس کو فت باطن کی حالت میں پہلی بار تجربہ ہوا۔ کہ

عورت میں تشقی اور غمگساری کی کتنی طاقت ہے! اس وقت اگر دنیا میں کوئی انسان تھا۔ جو ان کی حالت کو کامل طور پر سمجھتا ہو۔ تو وہ سمجھ رہا ہوتا۔ وہ اس ترمیم کو اس سے کہیں زیادہ ضروری سمجھتی تھی۔ جتنا وہ خود سمجھتے تھے۔ وہ ان کے مخالف دوستوں پر اس سے کہیں زیادہ حرف زنی کرتی تھی۔ جتنی وہ خود کرتے تھے۔ اس کی باتوں سے پدم سنگھ کو بڑی تقویت ہوتی تھی۔ اگرچہ وہ سمجھتے تھے۔ کہ سمجھ رہا میں ایسی دقیق باتوں کے سمجھنے اور تولنے کا مادہ نہیں ہے۔ اور وہ جو کچھ کہتی ہے وہ میری ہی آواز بازگشت ہے۔ تاہم اس علم سے ان کی تقویت میں کوئی کمی نہ ہوتی تھی۔

لیکن جینہ پورا بھی نہ ہونے پایا تھا۔ کہ پنڈت پر بھا کر اڈے اپنے اخبار میں اس معاملہ کے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ نکالنا شروع کر دیا۔ ان میں پدم سنگھ پر ایسی پرمعنی چوٹیں ہوتی تھیں۔ کہ وہ پڑھ کر تلملا جاتے تھے۔ ایک مضمون میں حضرت نے پدم سنگھ کے گزشتہ سوانح اور اس ترمیم میں خاص تعلق ثابت کیا۔ ایک دوسرے مضمون میں ان کے طرز عمل پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا: یہ زمانہ حال کے خادمان قوم کی حالت ہے۔ جو قوم کو چاہے بھول جائیں پر اپنے تئیں نہیں بھولتے۔ جو قومی خدمت کی آڑ میں اپنا شکار کیا کرتے ہیں۔ قوم کے نوجوان غار میں گریں تو گریں۔ کاشی کے حاجی صاحب کی نظر شفقت رہنی چاہئے پدم سنگھ کو ان جھوٹے اہتمام اور کنایوں پر جتنا غصہ

آتا تھا۔ اتنا ہی تعجب بھی ہوتا تھا کہ ورت اس تک جاسکتی ہے۔
اس کا تجربہ انہیں اب ہوا۔ یہ حضرت شرافت اور تہذیب کے علم بردار
بنتے ہیں۔ لیکن ان کا ظرف اتنا تنگ ہے! او طرفہ یہ کہ کسی میں اتنی جرأت
نہیں۔ کہ ان مضامین کی تردید کرے؟

شام کا وقت تھا۔ پدم سنگھ میز کے سامنے بیٹھے ہوئے اس
مضمون کا جواب لکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پر کچھ سوچتا نہ تھا کہ
کیا لکھیں۔ کہ اتنے میں سجدہ رانے آکر کہا: گرمی میں یہاں کیوں بیٹھے
ہو۔ چلو باہر بیٹھو؟

پدم سنگھ۔ پر بھا کر اوڑنے آج مجھے خوب گالیاں دی ہیں! نہیں
کا جواب لکھ رہا ہوں؟

سجدہ رانے۔ یہ تمہارے پیچھے کیوں اس طرح پڑا ہوا ہے؟ یہ کہہ کر
سجدہ رانے اخبار اٹھالیا۔ اور پانچ منٹ میں اس مضمون کو شروع
سے آخر تک پڑھ ڈالا۔

پدم سنگھ نے پوچھا: کیسا مضمون ہے؟
سجدہ رانے۔ یہ کوئی مضمون تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو کھلم کھلا گالی ہے۔
میرا خیال تھا کہ گالیوں کی لڑائی عورتوں ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن
دیکھتی ہوں۔ تو مرد ہم سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ عالم فاضل بھی
ہوں گے؟

پدم سنگھ۔ ان کے علم کی قہار پانی مشکل ہے۔ دنیا کا سارا عالم ان

کے قلم میں ہے۔ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر وہ رائے زنی نہ کر سکتے ہوں؟

سمجھدرا! اور اس پر یہ حال!

پدم سنگھ۔ میں اس کا جواب لکھ رہا ہوں! ایسی خبر لوں۔ کہ وہ بھی یاد کریں۔ کہ کسی سے پالا پڑا تھا؟

سمجھدرا! مگر گالیوں کا جواب کیا ہوگا؟

پدم سنگھ۔ گالیاں؟

سمجھدرا! انہیں گالیوں کا جواب خموشی ہے۔ گالیوں کا جواب گالی تو جاہل بھی دیتے ہیں۔ پھر ان میں اور تم میں فرق ہی کیا رہا؟ پدم سنگھ نے سمجھدرا کو نگاہ عقیدت سے دیکھا۔ اُس کی بات ان کے دل میں بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی ہمیں ان لوگوں سے بھی نصیحتیں ملتی ہیں جنہیں ہم اپنے غرور میں کم ہیں سمجھتے ہیں۔ بولے ”تو چپ سا دھ لوں؟“

سمجھدرا! میری تو یہی صلاح ہے اُسے جو جی میں آئے بکنے دو۔ کبھی نہ کبھی

وہ ضرور شرمندہ ہوگا۔ بس وہی ان گالیوں کی سزا ہوگی؟

پدم سنگھ۔ وہ شرمندہ کبھی نہ ہوگا۔ یہ لوگ شرم کا مرض نہیں پالتے۔ ابھی میں ان کے پاس جاؤں۔ تو میری بڑی خاطر کریں گے۔ ہنس ہنس کر باتیں کریں گے۔ لیکن شام ہوتے ہی پھر ان پر گالیوں کا انشہ سوار ہو جائے گا؟

سجھدرا تو کیا ان کا کام دوسروں کی مذمت کرنا ہے؟
 مذم سنگھ نہیں کام تو یہ نہیں ہے لیکن یہ لوگ اپنے خریداروں
 کی تفریح کے لئے اس قسم کا ایک نہ ایک شگوفہ چھوڑتے رہتے ہیں۔ ایسے
 سو قیامہ مضامین سے خریداروں کی تعداد میں خوب اضافہ ہوتا ہے۔
 پبلک کو ایسے جھگڑوں میں خاص مزہ آتا ہے۔ اور اڈیٹر صاحبان اپنے
 اعلیٰ فرائض کو بھول کر پبلک کی اس نزاع پسند میلان سے فائدہ اٹھاتے
 ہیں پیشوائی کے اعلیٰ رتبہ سے گھر کر مذاق کی بد مذاقیوں کی پرستش کرنے
 لگتے ہیں۔ بعض اصحاب تو یہاں تک کہتے ہیں تامل نہیں کرتے۔ کہ
 خریداروں کو خوش رکھنا ہمارا فرض ہے۔ ہم ان کا کھاتے ہیں۔ تو انہیں
 کا گائیں گے۔

سجھدرا تب تو یہ لوگ محض پیسے کے غلام ہیں۔ ان پر غصہ کے
 بجائے رحم کرنا چاہیے۔

پدم سنگھ میز پر سے اٹھ آئے۔ جواب لکھنے کا خیال ترک کر دیا۔ وہ
 سجھدرا کو اس قدر فرس نہ سمجھتے تھے۔ انہیں آج تجربہ ہوا۔ کہ اپنی اعلیٰ
 تعلیم کے باوجود میں قیاضی طبع ہیں اسے نہیں پہنچتا۔ یہ ناخواندہ ہو کر
 بھی مجھ سے کہیں زیادہ بیدار مغز ہے۔ انہیں آج معلوم ہوا کہ عورت
 بے اولاد ہو کر بھی شوہر کے لئے اطمینان اور راحت دل کا ایک چشمہ
 ہے۔ سجھدرا نے آج ان کے دل میں ایک نئے جذبہ الفت کو جگایا۔
 ایک حرا سہنی جس نے برسوں کی جی ہوئی کدورت کو صاف کر دیا۔ انہوں

نے اُسے خلوص اور احسان مندی کی نظروں سے دیکھا۔ سجدہ راہِ دہر سمجھ گئی
اور اس کا دل مسرت سے سرشار ہو گیا۔

سجدہ راہِ دہر (کلام ۲) باب ۱۰

سداں جب سمن کو دیکھ کر لوٹا۔ تو اس کی حالت اُس غریب آدمی
کی سی تھی۔ جہر کی برسوں کی جمع کی ہوئی بساطِ چوروں نے اُڑا لی ہو۔
وہ سوچتا تھا۔ سمن مجھ سے بولی کیوں نہیں دے دے؟ میں نے میری موت
تاکا کیوں نہیں؟ کیا وہ مجھے اتنا قابلِ نفرت سمجھتی ہے؟ انہیں غالباً
وہ اپنی کچھلی باتوں پر شرمندہ ہے۔ اور مجھے بھول جا نا چاہتی ہے۔
مکمل ہے۔ اُسے میری شادی کی خبر مل گئی ہو۔ اور وہ مجھے بے انصاف
بے رحم سمجھ رہی ہو۔ اُسے ایک بار پھر سمن سے ملاقات کر کے کی ضرورت
خواہش ہوئی۔ دوسرے دن وہ بدھو آشرم کے گھاٹ کی طرف چلا۔
لیکن آدھے راستے سے لوٹ آیا۔ اُسے خوف ہوا۔ کہ کہیں شاناکا ڈر
آگیا۔ تو میں کیا جواب دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے سوانحی گجاستند کی
تنبیہ کا بھی خیال آگیا۔

سداں اب کبھی کبھی شاناکا کے متعلق اپنے فرائض پر غور کیا کرتا۔
حمینوں تک تمدنی مسائل پر تقریریں سننے کا اس پر اثر پڑنا لازمی تھا۔
وہ دل میں یہ تسلیم کرنے لگا تھا۔ کہ ہم لوگوں نے شاناکا کے ساتھ ضرور
بے انصافی کی ہے۔ مگر ابھی تک اس میں وہ قوتِ عمل نہ پیدا ہوئی تھی۔

جو بدنامی کو حقیر سمجھتی ہے۔ اور ضمیر کی آواز کے سامنے کسی کی پروا نہیں کرتی؛

ان دنوں اسے کتب بینی اور مطالعہ سے خاص ذوق ہو گیا تھا۔ دال منڈی اور چوک کی سیر سے نفور۔ اس کے منچلے پن نے یہ نئی صورت اختیار کی تھی۔ آریہ سماج کے جلسوں میں اُس نے ایسی کئی تقریریں سنی تھیں جس میں تہذیب نفس کی اہمیت ظاہر کی گئی تھی۔ اس کا یہ خیال مٹنے لگا تھا۔ کہ مجھے جو کچھ ہونا چاہئے تھا۔ وہ ہو چکا۔ وہاں اسے بتلایا گیا تھا کہ حصول علم تہذیب نفس کی دلیل نہیں۔ تہذیب کے مقابلہ میں علم کی وقعت بہت کم ہے۔ اُسی دن سے سدن اخلاقی تصانیف کا گردیدہ ہو گیا۔ اور روز بروز اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی تھی۔ اسے اب تجربہ ہونے لگا تھا۔ کہ میں کتابی علم کے بغیر بھی دنیا میں کچھ کام کر سکتا ہوں۔ ان تصانیف میں خواہشات کو زیر کرنے اور نفس کو قابو میں رکھنے کے لئے جو ہدایتیں کی گئی تھیں۔ انہیں وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بھولتا تھا۔

وہ میونسپل بورڈ کے اس جلسہ میں موجود تھا جس میں اخراج کی تجویز پیش تھی۔ اس ترمیم کو وہ نہایت مُصر خیال کرتا تھا۔ اور اپنے چچا کی غلطی کو تسلیم کرتا تھا۔ لیکن جب پر بھا کر راؤ نے پدم سنگھ پر اعتراضات کی بوجھار شروع کی۔ تو وہ بے اختیار ان کی حمایت پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے دو تین مضامین لکھے۔ اور ڈاک کی معرفت پر بھا کر راؤ کے

پاس بھیجے کئی دن تک ان کے شائع ہونے کی امید کرتا رہا۔ اُسے
 یقین تھا۔ کہ ان مضامین کے چھپنے ہی ایک شور برپا ہو جائے گا۔
 دنیا میں شاید کوئی انقلاب آجائے گا۔ جونہی ڈاک پر اخبار لاتا وہ اپنے
 مضامین کی تلاش میں لگا ہوا دوڑاتا۔ لیکن ان کے بجائے اُسے
 وہی دلازار اور مذمت آمیز مضامین نظر آتے۔ انہیں پڑھ کر اُس
 کے دل میں آگ سی جلنے لگتی تھی۔ لیکن آخری مضمون کو پڑھ کر اسے
 یارائے ضبط نہ رہا۔ اس نے ارادہ کیا۔ کہ اب چاہے جو کچھ ہو۔ ڈیڑھ
 صاحب کی خبر لینی چاہئے۔ اگر ان میں شرافت ہوتی۔ تو وہ میرے
 مضامین کو ضرور چھاپتے۔ زبان غلط ہی سہی۔ لیکن مضامین دلیلوں
 سے خالی نہ تھے۔ انہیں چھپا رکھنے سے صاف ثابت ہوتا ہے۔ کہ
 وہ حضرات واجب و نا واجب کا فیصلہ نہیں کرنا چاہتے صرف
 عوام کو خوش رکھنے کے لئے کذب و افترا سے کام لے رہے ہیں۔ اس
 نے اپنے خیالات کسی سے ظاہر نہیں کئے۔

شام کے وقت ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر "جگت" کے دفتر میں جا
 پہنچا۔ دفتر بند ہو چکا تھا۔ لیکن پٹت پر بھاگ کر راؤ اپنے گوشہ ادا رت میں
 بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے۔ سُن بے دھڑک اندر جا کر ان کے
 روبرو کھڑا ہو گیا۔ پر بھاگ کر راؤ نے سر اٹھایا۔ تو ایک قوی ہیکل جوان
 کو ڈنڈا لئے کھڑے دیکھا۔ غصہ سے بولے "آپ کون ہیں؟"
 سُن میرا مکان یہیں ہے۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا

چاہتا ہوں۔ کہ آپ اتنے دلوں سے پنڈت پدم سنگھ کو گالیاں کیوں دے رہے ہیں؟
 پر بھا کر راؤ۔ اچھا۔ آپ ہی نے دو تین مضامین میرے پاس بھیجے تھے؟

سدرن۔ جی ہاں میں نے ہی بھیجے تھے؟
 پر بھا کر راؤ۔ تو ان کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آئیے
 تشریف رکھئے۔ میں تو آپ سے ملنا چاہتا تھا لیکن آپ کا پتہ نہ معلوم
 تھا۔ آپ کے مضامین نہایت محققانہ اور مدلل ہیں۔ میں انہیں کبھی کا
 چھاپ دیتا لیکن گمنام مضامین شائع کرنا اصول کے خلاف ہے۔ اس لئے
 مجبور تھا۔ اسم شریف؟

سدرن نے اپنا نام بتلایا۔ اس کا غصہ فرو ہو رہا تھا؟
 پر بھا کر۔ آپ شراجی کے بڑے معتمد ہیں؟
 سدرن۔ میں ان کا بھتیجا ہوں؟
 پر بھا کر۔ اچھا! تب تو آپ گھر ہی کے آدمی ہیں۔ کئے شراجی کا مزاج
 تو اچھا ہے۔ وہ ادھر عرصہ سے نہیں آئے؟

سدرن۔ ابھی تو بخیریت ہیں۔ لیکن آپ کے مضامین کا یہی سلسلہ
 جاری رہا۔ تو خبر نہیں۔ ان کی کیا حالت ہو۔ آپ ان کے خیر خواہ اور معاون
 ہو کر اتنے بدظن کیونکر ہو گئے؟

پر بھا کر۔ بدظن ہو گیا ایہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ میں ان سے ذرہ بھر بھی

بظن نہیں ہوں۔ آپ ہم ایڈیٹروں کے فرائض سے غالباً واقف نہیں ہیں۔ ہم عوام کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اپنے دلی جذبات کو پوشیدہ رکھنا ہمارے طرز عمل کے خلاف ہے۔ ہم نہ کسی کے دوست ہیں۔ اور نہ کسی کے دشمن۔ ہم قومی معاملات میں کسی کی غلطیوں کو معاف نہیں کر سکتے۔ اسی لئے کہ ایسا کرنے سے ان غلطیوں کا اثر اور بھی مضرت ناک ہو جاتا ہے، پدم سنگھ میرے خاص دوست ہیں۔ اور میں دل سے ان کی عزت کرتا ہوں۔ مجھے ان سے صرف اصولی اختلاف تھا۔ لیکن پریلو ہی مجھے ایسے ثبوت ملتے آئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس نرمیم کے قبول کرنے میں ان کی کوئی اور غرض بھی مخفی تھی۔ آپ سے کہنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ کہ کئی ماہ ہوئے انہوں نے سمن بائی نام کی ایک بازاری عورت کو بدھوا آشرم میں خفیہ طور پر داخل کر دیا۔ اور تقریباً ایک ماہ سے اس کی چھوٹی بہن کو بھی اسی آشرم میں ٹھہرا رکھا ہے۔ میرا دل اب بھی چاہتا ہے۔ کہ یہ خبر غلط ہو۔ لیکن میں بہت جلد کسی اور نیت سے نہیں۔ تو محض اس کی تردید کرانے کے لئے اس خبر کو شائع کر دوں گا۔

سدرن۔ یہ باتیں آپ سے کس نے کہیں؟

پہلے بھاکر رائے۔ یہ میں نہیں بتا سکتا۔ لیکن آپ شریاجی سے کہہ دیجئے گا۔ کہ اگر یہ بیجا اتہام ہوں۔ تو مجھے آگاہ کر دیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے۔ کہ اس تجویز کے بورڈ میں آنے سے پہلے شریاجی سوزانہ حاجی نام سے سے ملنے جاتے تھے۔ ایسی حالت میں آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ کہ میں

ان کی نیت کو کہاں تک صاف سمجھ سکتا ہوں؟
 سدن کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ پر بھا کر لو کی بالوں نے اسے رام کر لیا۔ وہ
 دل میں ان کا معتقد ہو گیا۔ اور کچھ ادھر ادھر کی باتیں کر کے لوٹ آیا، اُسے
 اب سب سے بڑی فکر تھی۔ کہ کیا شانتا سچ جج آشرم میں لائی گئی ہے؟
 رات کو کھانا کھاتے وقت اس نے بہت چاہا۔ کہ شرما جی سے
 اس امر کے متعلق کچھ گفتگو کروں لیکن ہمت نہ پڑی۔ وہ ساری رات
 مضطرب اور پریشان رہا۔ شانتا آشرم میں کیوں آئی ہے؟ چچا صاحب نے
 اُسے یہاں کیوں بلایا ہے؟ کیا اُمانا نے اسے اپنے گھر میں رکھنے سے انکار
 کیا۔ اسی قسم کے سوالات اس کے دل میں پیدا ہوتے رہے۔ علی الصبح وہ
 بدھوا آشرم کے گھاٹ کی طرف چلا۔ کہ اگر سمن سے ملاقات ہو جائے۔ تو
 اس سے ساری حقیقت دریافت کروں۔ اُسے گھاٹ پر بیٹھے تھوڑی ہی
 دیر ہوئی تھی۔ کہ سمن آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے پیچھے ایک اور
 عورت سر جھکائے چلے آتی تھی۔ اس کے چہرہ پر کھونا کھٹ پڑا ہوا
 تھا۔

سدن کو دیکھتے ہی سمن ٹھٹک گئی۔ وہ ادھر کئی دنوں سے سدن
 سے ملنا چاہتی تھی۔ اگرچہ پہلے اس نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ سدن
 سے کبھی نہ بولوں گی۔ پر اب شانتا کی خاطر اس عہد کو قائم رکھنا محال تھا۔
 اس نے شرما سے ہونے سدن سے کہا: سدن سنگھ آج بڑے نصیبوں
 سے تمہارے درشن ہوئے تم نے تو ادھر آنا ہی چھوڑ دیا۔ خیریت سے

تو ہو؟

سُدن جھپٹتا ہوا بولا: "ہاں سب خیریت ہے۔"
 سمن۔ دُبلے بہت نظر آتے ہو۔ بیمار لگتے کیا؟
 سُدن۔ نہیں بہت اچھی طرح ہوں۔ مجھے موت کہاں؟
 ہم اکثر اپنی خفت مٹانے کے لئے مصنوعی جذبات کی آڑ لیا کرتے
 ہیں۔ تاکہ ہمارے حال پر دوسروں کو ترس آئے۔

سمن۔ چپ رہو۔ کیسا اشگون زبان سے نکالتے ہو۔ بھلا میں
 مرنے کو مناتی تو ایک بات تھی جس کے کارن یہ سب ہو رہا ہے۔ سُدن
 میں سچ کہتی ہوں۔ اس رام لپلا کی کبکئی میں ہی ہوں۔ خود بھی اپنے ساتھ
 لے ڈوبی، کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔ مجھے آج تم سے بہت باتیں کہنی
 ہیں۔ معاف کرنا۔ اب میں تمہیں بھٹیا کہوں گی، اب میرا تم سے بھائی
 بن کا ناتا ہے۔ میں تمہاری بڑی سالی ہوں۔ اگر کوئی کڑی بات، منہ
 سے نکل جائے۔ تو بُرا مت ماننا، میرا حال تو تمہیں معلوم ہی ہو گا۔

تمہارے چچا صاحب نے اس عذاب سے مجھے رہائی دی۔ اور اب
 میں آشرم میں پڑی اپنے بُرے دنوں کو روتی ہوں۔ اور سدا ردِ وں گی۔
 ادھر ایک ماہ سے میری بد نصیب بہن بھی یہاں آگئی ہے۔ امانت کے
 گھر اس کا نباہ نہ ہو سکا۔ شرابی کو پر پاتا ہمیشہ خوش رکھیں۔ وہ خود امولا
 گئے۔ اور اُسے ساتھ لے آئے، لیکن یہاں لا کر انہوں نے بھی اسے بھلا
 دیا۔ میں تم سے پوچھتی ہوں۔ بھلا یہ کہاں کا دستور ہے۔ کہ ایک بھائی

چوری کرے۔ اور دوسرا بھائی پکڑا جائے۔ سزا پائے؛ اب تم سے کوئی
 بات چھپی نہیں ہے۔ اپنے کھوئے نصیب سے۔ دلوں کے پھر سے۔
 اپنے پہلے جہنم کے پالپوں سے مجھ ابھاگنی لئے دھرم کا راستہ چھوڑ دیا۔
 اس کی سزا مجھے ملنی چاہئے تھی۔ اور وہ ملی۔ لیکن اس غریب نے کیا
 خطا کی تھی جس کے لئے تم لوگوں نے اسے ترک کر دیا؟ اس کا جواب تمہیں
 دینا پڑے گا۔ دیکھو۔ بزرگوں کی اطمینان لینا۔ یہ کم ہمت آدمیوں کی
 عادت ہے۔ سچے دل سے بتلاؤ۔ یہ ظلم تھا یا نہیں؟ اور تم نے کیونکر
 اس ظلم کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے دیا؟ کیا تمہیں ایک بیکس
 لڑکی کی زندگی کو ہمیشہ کے لئے خراب کرتے ہوئے ذرا بھی افسوس
 نہ ہوا؟

اگر شانتا وہاں نہ ہوتی۔ تو شاید سدن اس وقت دل کی باتیں زبان
 سے نکالنے کی جرأت کر جاتا۔ وہ اس ظلم کو قبول کر لیتا۔ لیکن شانتا کے
 روبرو وہ لیک ایک اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہ ہو سکا۔
 اس کے ساتھ ہی خاندانی وقار کا سہارا لیتے ہوئے بھی اسے شرم آتی
 تھی۔ وہ منہ سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکالنا چاہتا تھا جس سے شانتا کو
 ملال ہو۔ اس کے ساتھ ہی کوئی ایسی بات بھی نہ کر سکتا تھا۔ جو جھوٹی
 امیدیں پیدا کرے۔ اس کی اڑتی ہوئی نگاہ نے جو شانتا پر پڑی تھی۔
 اُسے دُبدھے میں ڈال دیا تھا۔ اُس کی حالت اُس لڑکے کی سی تھی۔ جو
 کسی حمان کی لائی ہوئی شیرینی کو لچائی نظروں سے دیکھتا ہے۔ مگر ماں کے

خوف سے نکال کر کھانہ نہیں سکتا + بولا "بائی جی۔ آپ نے پہلے ہی میرا منہ بند کر دیا ہے۔ اس لئے کیسے کہوں۔ کہ جو کچھ کیا وہ میرے بزرگوں نے کیا میں ہاں کے سر الزام رکھ کر اپنا گلہ چھڑانا نہیں چاہتا۔ اس وقت بدنامی سے میں بھی ڈرتا تھا۔ اتنا تو آپ بھی مانیں گی۔ کہ دنیا میں وہ کہ دنیا کی چال چلنی پڑتی ہے۔ میں یہ مانتا ہوں۔ کہ جبر ہو اسے۔ لیکن یہ جبر ہم نے نہیں کیا۔ وہ اس سلجھنے کے لیے ہے جس میں ہم لوگ رہتے ہیں۔"

سمسن۔ بھتیجا تم بڑھے لکھے آدمی ہو۔ میں تم سے باتوں میں نہیں پیش پا سکتی۔ جو تمہیں مناسب معلوم ہو۔ وہ کرو + ظلم ظلم ہی ہے۔ چاہے کوئی ایک آدمی کرے۔ یا ساری ذات کرے + دوسروں کے خوف سے کسی پرستم ظلم نہیں کرنا چاہئے۔ شانتا یہاں کھڑی ہے۔ اس لئے میں اس کا راز دل نہیں کھولنا چاہتی۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی۔ کہ دوسری جگہ نہیں چاہئے دولت۔ حسن۔ اور عزت مل جائے۔ پر یہ پیسہ نہ ملے گی + اگر تمہارا ہی جیسا اس کا دل بھی ہوتا۔ تو یہ آج اپنی نئی سسرال میں آرام سے بیٹھی ہوتی۔ لیکن صرف تمہاری تحبت نے اُسے یہاں کھینچا۔ تم اُسے جوچی چاہے کہو۔ وہ عمر بھر تمہارے نام پر بیٹھی رہے گی۔

سرن نے دیکھا۔ کہ شانتا کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں اس کے پیروں پر گر رہے ہیں۔ اُس کا قلب تشنہ درد سے بیتاب ہو گیا نہایت بیگمانہ انداز سے بولا "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کیا کروں۔ ایشور جانتا ہے۔ کہ مجھے کتنا صدمہ ہے!

سمن۔ تم مرد ہو۔ سب کچھ کر سکتے ہو؟
 سدن۔ مجھ سے کچھ کہئے کرنے کو تیار ہوں؟
 سمن۔ وعدہ کرتے ہو؟
 سدن۔ میرے دل کی جو حالت ہو رہی ہے۔ وہ دل ہی جانتا ہے
 زبان سے کیا کہوں؟

سمن۔ مردوں کی باتوں پر یقین نہیں آتا۔
 یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ سدن نے شرمندہ ہو کر کہا: اگر اپنے قابو کی بات
 ہوتی۔ تو اپنا دل نکال کر آپ کو دکھا دیتا؟
 سمن۔ اچھا تو آپ اسی گنگا کے کنارے شانٹا کا ہاتھ پکڑ کر کہئے۔
 کہ تم میری ہو۔ اور میں تمہارا شوہر ہوں۔ میں ہمیشہ تمہاری حفاظت اور
 پرورش کرونگا۔

سدن کی اخلاقی جرأت نے جواب دے دیا۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا۔
 گویا اپنا منہ چھپانے کے لئے کوئی جگہ ڈھونڈ رہا ہے، اسے ایسا معلوم ہوا
 کہ گنگا مجھے لنگنے کے لئے بڑھی چلی آتی ہیں۔ اس نے ڈوبتے ہوئے آدمی کی
 طرح آسمان کی طرف دیکھا۔ اور دل میں اپنی بے غیرتی کو محسوس کرتا ہوا
 رُک رُک کر بولا: سمن مجھے اس کے لئے سوچنے کا موقع دو؟

سمن نے سلامت سے کہا: ہاں خوب سوچ لو۔ کوئی ایسی جلدی
 نہیں ہے میں تمہیں دھم سنگھ میں نہیں ڈالنا چاہتی؟
 یہ کہہ کر وہ شانٹا سے بولی: دیکھ تیرا شوہر تیرے سامنے کھڑا ہے مجھ

سے جو کچھ کہتے سنتے بنا۔ وہ میں نے کہا سنا لیکن وہ نہیں پسچتا۔ وہ
 اب سدا کے لئے تیرے ہاتھ سے جاتا ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہے۔ اور
 اس میں کچھ طاقت ہے۔ تو اسے روک لے۔ اور اس سے یہ عہد کرا لے۔
 یہ کہہ کر سمن گنگا کی طرف چلی۔ شانتا بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے
 پیچھے چلی گئی۔ اس کی محبت کو غرور نے زیر کر دیا جس کے نام پر وہ
 تازیست مصیبتیں جھیلنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جس کے قدموں پر وہ
 دل میں اپنے نشیں نثار کر چکی تھی۔ اسی سے وہ اس وقت تن بیٹھی۔ اس
 نے اس کی حالت کو نہ دیکھا۔ اس کی مشکلات پر غور نہ کیا۔ یہ نہ سوچا۔
 کہ ابھی وہ اپنا مالک نہیں۔ دوسروں کا محتاج ہے۔ اس وقت اگر وہ
 سدن کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی۔ تو یقیناً اس کی مرادیں بر
 آتیں۔ سدن اتنا سنگدل نہ تھا۔ لیکن اس نے التجا کی بہ نسبت غرور
 کہ ناز زیادہ مناسب سمجھا۔

سدن ایک لمحہ وہاں کھڑا رہا۔ اور تب بادل مجروح گھر کی طرف چلا۔

حیدر (۲۴) حیدر

سدن دل میں ایسا شرمندہ تھا۔ گویا اس سے کوئی بڑا بھاری
 گناہ ہو گیا ہو۔ وہ بار بار اپنے الفاظ کو یاد کرتا اور اسی نتیجہ پر پہنچتا۔ کہ میں بڑا
 بے رحم ہوں۔ درد محبت نے اسے وارفتہ بنا دیا تھا۔
 وہ سوچتا تھا۔ مجھے دنیا کا اتنا خوف کیوں ہے؟ دنیا مجھے کیا دیتی

ہے؟ کیا محض جھوٹی بدنامی کے خوف سے میں اس نعمت سے دستبردار
 ہو جاؤں۔ جو معلوم نہیں میرے پہلے جنم کے کتنے نیک کاموں کا ثمرہ
 ہے۔ اس دولت کو ترک کر دوں۔ جو مجھے ساری دنیا کی نعمتوں سے مستثنیٰ
 بنا سکتی ہے۔ اگر راہ راست پر چلنے کے لئے میرے عزیز اور لیگانے مجھے
 چھوڑ دیں۔ تو کیا پرواہ؟ بدنامی کا خوف اس لئے ہے۔ کہ وہ ہمیں
 بُرے کاموں سے بچاتا ہے۔ اگر وہ راہ فرض میں جا رہی ہو۔ تو اس سے
 ڈرنا بزدلی ہے۔ اگر ہم کسی بے گناہ پر جھوٹا مقدمہ چلائیں۔ تو دنیا ہمیں
 بدنام نہیں کرتی۔ وہ اس کام میں ہماری مدد کرتی ہے۔ ہم کو گواہ اور
 وکیل دیتی ہے۔ ہم کسی کاروبار میں ضم کر جائیں کسی کی جائیداد ہمارا بیٹھیں
 تو دنیا ہم کو کوئی شرا نہیں دیتی۔ یا دیتی بھی ہے۔ تو بہت تہذیب لیکن
 ایک ایسے نام کے لئے جس میں گناہ کا شائبہ بھی نہیں۔ وہ ہم کو بدنام
 کرتی ہے۔ ہمارے ماتھے پر بدنامی کا داغ لگا دیتی ہے۔ ہم کو زندہ درگور
 کر دیتی ہے۔ دنیا اور زبان خلق کے خوف سے میں اسے ترک کر دوں۔
 اسے منجھڑا میں ڈوبنے دوں؟ نہیں دنیا جو چاہے کہے۔ مجھ سے یہ
 ظلم نہ ہو گا۔

میں بانٹا ہوں۔ کہ ماں باپ کا حکم ماننا میرا فرض ہے۔ انہوں
 نے مجھے پیدا کیا ہے۔ میری پرورش کی ہے۔ باپ کی گود میں کھیلا ہوں
 ماں کا خون جگر پی کر پلا ہوں۔ میں ان کے اشارے پر زہر کا پیالہ پی
 سکتا ہوں۔ تلوار کی دھار چل سکتا ہوں۔ شعلوں میں کود سکتا ہوں۔

لیکن ان کی ضد یا اصرار پر میرا ہاتھ ایک بے گناہ عورت پر نہ لٹھے گا۔ نہ کہ اس عورت پر جس کے نباہ کا میں نے عہد کیا ہے۔ والدین مجھ سے غرور ناراض ہو جائیں گے۔ ممکن ہے مجھے نرک کر دیں۔ مجھے مردہ سمجھ لیں لیکن کچھ دلوں کے غصہ و غم کے بعد انہیں تسکین ہو جائیگی۔ وہ مجھے بھول جائیں گے۔ زمانہ اُن کے زخم کو بھر دے گا۔

آہ میں کتنا سنگدل ہوں۔ وہ نازنین جو کسی رنو اس کا سنگار بن سکتی ہے۔ وہ حسینہ جو تنویر صبح کی طبع سرور انگیز اور شفق کی طرح شگفتہ ہو میرے روبرو ایک بیکس فریادی کی طرح سر جھکائے کھڑی رہے۔ اور میں ذرا بھی نہ پسچوں! وہ ایسا موقع تھا۔ کہیں اس کے پیروں پر سر رکھ دیتا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کتنا بد دیوئی میری خطا مرعاف کرو! گنگا سے گنگا جل لاتا۔ اور اس کے پیروں پر چڑھاتا۔ پر میں پتھر کی مورت کی طرح کھڑا اپنے خاندانی اعزاز کا بے سراگ الپتار رہا۔ واسے نصیب! میری ان یادہ گوئیوں سے ان کی طبع نازک کو کتنا صدمہ ہوا ہوگا۔ اس کا ثبوت اس کی بے نیازی ہے۔ اس نے مجھے خشک۔ بے ہر متکبر۔ دغا باز سمجھا ہوگا۔ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ واقعی میں اسی قابل ہوں!

یہ تاسف انگیز خیالات کئی دن تک سدن کے دل کو پامال کرتے رہے۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ مجھے اپنا جھونپڑا الگ بنانا چاہئے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہئے۔ اس کے بغیر نباہ ہونا مشکل ہے۔ والدین

کے گھر کا دروازہ میرے لئے بند ہے شاید کھٹکھٹانے سے بھی نہ کھلے
چچا صاحب مجھے شوق سے لیں گے۔ لیکن ان کے یہاں رہ کر گھر
میں بیرکائیج بونا اچھا نہیں۔ بس میرے لئے اس کے سوا اور کوئی بندہ
نہیں ہے۔ کہ اپنی پچھڑی الگ پکاؤں۔

وہ روز ارادہ کرتا۔ کہ چل کر عذر تقصیر کر آؤں۔ لیکن چلنے کے
وقت ہمت جواب دے دیتی۔ دل میں سوال اٹھتا۔ کس برے تیرے؟
گھر کہاں ہے؟

یہ کاوش غم محبت کی خلش سے کم نہ تھی۔ وہ ہر دم اسی فکر میں ڈوبا
رہتا کہ کیونکر اس عقدہ کو حل کر دوں۔ لیکن عقل کچھ کام نہ کرتی۔ اس نے
سارے شہر کی خاک چھان ڈالی کبھی دفتروں کی طرف جاتا۔ کبھی ٹسے
بڑے کارخانوں کے چکر لگاتا اور دو چار گھنٹے گھوم کر لوٹ آتا۔ اس
روزانہ دوادوش کے باوجود منزل مقصود کا سوا کبھی نہ نظر آتا تھا۔
اب تک اس کی زندگی بے فکری اور لا اُبالی میں گزری تھی۔ مزاج
میں ایک قسم کی متکبرانہ بے نیازی تھی۔ عرض حال کے لئے اس کے
لبوں نے کھلنا نہ سیکھا تھا۔ التجا اور منت سے اس کی طبیعت بیگانہ
تھی۔ وہ نہ جانتا تھا۔ کہ دنیا کی بارگاہ میں بہت سر جھکانے کی ضرورت
ہوتی ہے۔ یہاں اسی کی دعا قبول ہوتی ہے۔ جو پتھر کے بے رحم آستانوں
پر ہاتھ رگڑنا جانتا ہے۔ جو اپنی ساری دعاؤں کو صرف دربان کر سکتا
ہے۔ جو جفاکش ہے۔ جاں نثار ہے۔ ماسر ہے۔ منکر ہے۔ علیم ہے۔

جس نے کسی سنیاسی کی طرح غصہ کو جیت لیا ہے۔ جو گوشمالیوں کو احسان سمجھتا ہے۔ ذلت کو دودھ کی طرح پی جاتا ہے۔ اور جس نے غیرت کو پیروں تلے کچل ڈالا ہے۔ اس دربار میں وہی سرخرو اور کارگزار ہے۔ جو بے زبان ہے۔ بے دلیل ہے۔ بے عذر ہے۔ اسے معلوم نہ تھا۔ کہ وہی اوصاف جو فرشتوں سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ اس دنیا میں بے وقعت ہیں + وہ ایماندار تھا۔ راست گو تھا۔ بے لوث تھا۔ آزاد تھا۔ جو بات کتنا منہ پر لگی لپٹی رکھنا نہ جانتا تھا۔ پراسے خبر نہ تھی۔ کہ ان اوصاف کی اخلاقی وقعت چاہے جو کچھ ہو۔ دنیا کی نگاہ میں سند اور سفارش کی وقعت ان سے کہیں زیادہ ہے + سدن کو اب بہت افسوس ہوتا۔ کہ میں نے ناحق اپنی عمر تلف کی + کوئی ایسا مہر نہ سیکھا جس سے کسب معاش کر سکتا۔ اس طرح کوچہ گردی کرتے کرتے ایک ہمینہ گزر گیا۔ اور کار براری کی صورت نہ پیدا ہوئی۔

اس مایوسی نے رفتہ رفتہ اس میں بے زاری کا جذبہ پیدا کیا۔ اُسے اپنے والدین پر۔ اپنے چچا پر۔ دنیا پر۔ اور اپنے آپ پر غصہ آتا + اُسے ارباب ثروت و اختیار سے ایک بغض للہ سا ہو گیا۔ ابھی چند روز قبل وہ خود فٹن پر سیر کرنے نکلتا تھا۔ لیکن اب کسی کو فٹن پر آتے دیکھ کر اُس کا خون اُبلنے لگتا۔ وہ کسی فیشن ایبل آدمی کو پیدل چلتے دیکھتا۔ تو خواہ مخواہ اس سے شانہ ملا کر چلتا۔ اور منتظر رہتا۔ کہ یہ

ذرا بھی زبان ہلائے۔ تو اس کی خبر لوں، بسا اوقات وہ کوچبانوں
کی چیخ پکار کی بھی پردانہ کرتا چھپر چھپر کر لڑنا چاہتا۔ یہ لوگ بن
کھن کر ہوا خوری کرنے جاتے ہیں۔ میں ان کا غلام ہوں۔ کہ انہیں
راستہ دیتا رہوں!

گھر پر معقول جائیداد ہونے کے باعث سدن کو فکر معاش نے
کبھی نہ ستایا تھا۔ والدین نے بھی اسی لئے اس کی تعلیم ضروری نہ سمجھی
تھی۔ پر اب دفعۃً جو یہ مسئلہ اس کے سامنے آیا۔ تو اسے معلوم ہوا کہ
میں اسے حل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا، اگرچہ اس نے انگریزی
نہ پڑھی تھی۔ پر ادھر اس نے اردو۔ ہندی کی کافی استعداد حاصل
کر لی تھی۔ وہ مذہب طبقہ کو قومی زبانوں سے اُلس نہ رکھنے کے باعث
ملک اور قوم کا دشمن سمجھتا تھا۔ جب سے اس کے مضامین 'جگت'
میں شائع ہوئے تھے۔ وہ انگریزی خوان فرقہ کو متکبرانہ نظروں سے
دیکھنے لگا تھا۔ یہ سب کے سب غرض کے غلام ہیں۔ انہوں نے
محض غریبوں کو ٹھکے کے لئے محض اپنا پیٹ پالنے کے لئے انگریزی
پڑھی ہے۔ کوئی وکیل بنا پھرتا ہے۔ کوئی ہیٹ کالر لگائے گھومتا
ہے۔ سب کے سب قوم کا خون چوسنے والے ہیں۔ اس پر قوم کے پیشوا
بننے کا دعویٰ سب فیشن کے غلام ہیں جن کی تعلیم نے انہیں انگریزوں
کا منہ چڑھانا سکھا دیا ہے۔ جن میں درد نہیں۔ دھرم نہیں۔ اپنی
قومی زبان سے محبت نہیں۔ اخلاقی ہمت نہیں۔ خود داری نہیں۔

قومی آن نہیں۔ یہ بھی کوئی آدمی ہیں، ایسے ہی خیالات اُس کے
 دل میں آیا کرتے تھے۔ لیکن اب جو وہ فکرِ معاش سے دوچار ہوا۔ تو
 اُسے معلوم ہوا۔ کہ میں اس فرقہ سے بیجا طور پر بدظن تھا۔ یہ بیچار
 رحم کے قابل ہیں۔ میں ہندی بھاشا کا پنڈت نہ سہی۔ پر بہتیروں سے
 اچھی بھاشا جانتا ہوں۔ میرے خصائل پاکیزہ نہ ہوں۔ پر بہتیروں
 سے اچھے ہیں میرے خیالات بلند نہ ہوں۔ پر ایسے نیچے بھی نہیں۔
 لیکن میرے لئے سب دروازے بند ہیں۔ میں یا تو کہیں چیرا سی
 ہو سکتا ہوں۔ یا بہت ہو گا۔ تو کانٹیل ہو جاؤں گا۔ بس یہی
 میری ہستی ہے۔ ہمارے ساتھ یہ کتنی زیادتی ہے! ہم کیسے ہی
 باسیرت ہوں۔ کتنے ہی فہیم ہوں۔ کتنے ہی بیدار مغز ہوں۔ پر
 انگریزی زبان سے نا آشنا ہوں۔ تو ان کمالات کی کوئی وقعت
 نہیں! ہم سے زیادہ بد نصیب اور کون ہو گا۔ جو اس ظلم کو خموشی
 کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔ نہیں۔ بلکہ اس پر غور کرتے ہیں۔
 اس کا بس گاتے ہیں۔ اور اپنی موجودہ حالت پر پھولے نہ سہا کر اُسے
 اپنا وسیلہ نجات سمجھتے ہیں! نہیں مجھے ملازمت کا خیال دل سے
 نکال ڈالنا چاہئے۔

سدرہ کی حالت اس آدمی کی سی تھی جو رات کو تنگل میں بھٹکتا
 ہوا۔ اندھیری رات پر جھنجھلاتا ہے۔

اس فکر اور نارسائی کی حالت میں ٹہلتا ہوا۔ وہ ایک دل نبی

کے کنارے اس مقام پر جا نکلا۔ جہاں بہت سی کشتیاں لگی ہوئی تھیں۔ ندی میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں۔ ادھر ادھر اٹھلائی تھپرتی تھیں۔ بعض بعض کشتیوں میں سے سریلی تالوں کی صدائیں آ رہی تھیں۔ کئی ناؤں پر سے ملاح بورے اُتار رہے تھے۔ سدن ایک ناؤ پر جا بیٹھا۔ کنارہ دریا کی شاعرانہ لطافت اور شام کی خیال انگیز تنہائی نے اس پر محویت کا عالم طاری کر دیا۔ وہ سوچنے لگا۔ کیسی لطف کی زندگی ہے۔ کاش میں بھی ساری دنیا سے الگ۔ ایسے ہی ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا ندی کی لہروں پر چلتا اور خوشی کے راگ گاتا۔ یہیں ندی کے کنارے میری ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہوتی۔ شاننا دروازے پر کھڑی میری راہ دیکھا کرتی۔ اور کبھی کبھی ہم دونوں ناؤ پر بیٹھ کر دریا کی سیر کرتے۔ اس کی رنگین طبیعت نے اس سا دلہا و قانع زندگی کی ایسی دلکش تصویر کھینچی۔ کہ وہ دفنِ شوق سے بیتاب ہو گیا۔ وہاں کی ایک ایک چیز سرور اور شہر میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اٹھا۔ اور ایک ملاح سے پوچھا: کیوں جی چودھری۔ یہاں کوئی ناؤ لگاؤ بھی ہے؟“

ملاح بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ سدن کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ اور اُسے کئی ناویں دکھائیں۔ سدن نے ایک نئی کشتی پسند کی۔ مول تول مونس لگا کتنے ہی اور ملاح جمع ہو گئے۔ آخر تین سو روپیہ میں معاملہ طے ہو گیا۔ یہ بھی طے ہو گیا۔ کہ جس کی ناؤ ہے۔ وہی اسے چلانے کے لئے

نوکر ہو گا :

سدن گھر کی طرف چلا۔ تو ایسا خوش تھا۔ گویا اُسے زندگی میں اب اور کوئی آرزو نہیں ہے۔ گویا اس نے کسی جنگ میں فتح پائی ہے۔ ساری رات اس کی آنکھوں میں نیند نہیں آئی۔ وہی کشتیاں جو بادبان کھولے افق کی طرف سے چلی آرہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتی رہیں۔ وہی دلفریب نظارے اُسے دکھائی دیتے رہے۔ خیال نے کنار دریا پر ایک خوبصورت جھونپڑا تعمیر کیا۔ ہری بھری لتاؤں سے سجا ہوا تب شاننا کی دلاویز تصویر اس میں جلوہ افروز ہوئی۔ جھونپڑا ایک عالی شان محل بنا۔ اس میں ایک پُر فضا باغ سجا۔ اور سدن اس کے کجوں میں شاننا کے ساتھ محو خرام ہو گیا۔ ایک طرف ندی کا سہانا راگ تھا۔ دوسری طرف چڑیلوں کی خوشنوائیاں تھیں جس سے ہمیں محبت ہوتی ہے۔ اُسے ہم ہمیشہ ایک ہی انداز میں دیکھتے ہیں۔ اُسی انداز میں ہم اُسے یاد کرتے ہیں۔ وہی وضع۔ وہی عالم ہمارے لوح دل پر منقوش ہو جاتا ہے۔ سدن شاننا کو اُسی عالم میں دیکھتا تھا۔ جب وہ ایک سادی ساڑی پہنے۔ سر جھکائے۔ گنگا کے کنارے کھڑی تھی۔ یہ تصویر اس کی آنکھوں سے نہ اُترتی تھی :

سدن کو اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس پیشہ میں سراسر فائدہ ہی فائدہ ہے۔ نقصان کا امکان بھی اس کے ذہن میں نہ آتا تھا۔ سب سے طرفہ بات یہ تھی۔ کہ ابھی تک اُس نے یہ نہ سوچا تھا۔ کہ اتنے

روپے کہاں سے آئیں گے؟

صبح ہوتے ہی اُسے روپوں کی فکر دامنگیر ہوئی۔ کس سے مانگوں؟ کون دے گا؟ مانگوں کس بہانہ سے؟ چچا صاحب سے کموں؟ نہیں آج کل وہ خود ہی زیر بار ہیں۔ عہدوں سے کچھری نہیں جاتے اور دادا سے مانگنا تو پتھر سے تیل نکالنا ہے۔ کیا کروں؟ اگر اس وقت نہ گیا۔ تو چودھری اپنے دل میں کیا کہے گا۔ وہ چھت پر ادھر ادھر ٹپکنے لگا۔ منصوبوں کا جو رفیع محل اُس نے ذرا دیر قبل کھڑا کیا تھا۔ پامال ہونے لگا۔ شباب کی اُمید پیال کی آگ ہے جس کے جلنے اور بجھنے میں دیر نہیں لگتی۔ یا کسی دار کا وقار جو شام کو بنتا اور صبح کو بگڑ جاتا ہے؟

دفعۃً سدن کو ایک خیال آگیا۔ وہ زور سے کھل کھلا کر ہنسا۔

جیسے کوئی اپنے دشمن کو زمین پر گر کر بے ہنسی کی ہنسی ہنستا ہے، وہ اب اس بھی کیسا احمق ہوں۔ میرے صندوق میں میری موہن مال رکھی ہوئی ہے۔ تین سو سے کچھ زیادہ ہی کی ہوگی۔ کیوں نہ اُسے بیچ ڈالوں۔ جب کوئی ملنے لگے گا۔ تو دیکھا جائے گا۔ کون مانگتا ہے۔ اور کسی نے پوچھا بھی تو صاف کسوں گا۔ کہ بیچ کر کھا گیا۔ جو کچھ کرنا ہوگا۔ کر لیں گے۔ اور اگر اس وقت تک ہاتھ میں روپے آگئے۔ تو نکال کر پھینک دوں گا۔ اس نے صندوق سے مال نکالی۔ اور سوچنے لگا۔ کہ اسے کیونکر بیچوں۔ بازار میں کوئی زیور بیچنا اپنی عزت بچنے سے کم ذلت کی بات نہیں ہے۔ اسی فکر میں اداس بیٹھا تھا کہ حیتن کمار کمرے میں جھاڑو دینے آیا۔ سدن کو متفکر

دیکھ کر بولا "بھیا آج اُداس ہو۔ آنکھیں چٹھھی ہوئی ہیں۔ رات سوئے
نہیں کیا؟"

سداں۔ ہاں۔ آج نیند نہیں آئی۔ سر پر ایک فکر سوار ہے۔
جیتن۔ ایسی کونسی فکر ہے۔ میں بھی سُنوں۔
سداں۔ تم سے کہہ دوں۔ تو ابھی سارے گھر میں دُہائی دیتے
پھرد گئے۔

جیتن۔ بھیا تمہاری ہی غلامی میں عمر بیت گئی۔ ایسا پیٹ کا ہلکا
ہوتا۔ تو ایک دن نباہ نہ ہوتا۔ اس سے نشا کھاتے رہو۔
جس طرح ایک نادار لیکن بامروت آدمی کے منہ سے انکار نکلتا ہے
بہت شش و پنج۔ بہت معذوری و مجبوری۔ بہت ندامت اور کاؤ
کے ساتھ۔ اُسی طرح سداں کے منہ سے نکلا "میرے پاس ایک موہن والا
ہے۔ اُسے کہیں بیچ دو۔ مجھے روپوں کی ضرورت ہے۔"

جیتن۔ تو یہ کون بڑا کام ہے۔ اتنی سی بات کے لئے کیوں پھکر کرتے
ہو۔ لیکن روپے لیکر کیا کرو گے؟ مالکن سے کیوں نہیں مانگ لیتے؟ وہ کبھی
ناہیں نہ دیں گی۔ مالک سے کہو گے تو نہ ملے گا۔ اس گھر میں مالک کچھ نہیں
ہیں۔ جو ہیں مالکن ہیں۔

سداں۔ میں گھر میں کسی سے نہیں مانگنا چاہتا۔
جیتن نے مالا لے کر دیکھی۔ اُسے ہاتھوں سے تولا اور شام تک اُسے
بیچ لانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ مگر وہ بازار نہ گیا۔ بلکہ وہ سیدھا اپنی کوٹھڑی

کی طرف چلا۔ دونوں کیواڑ بند کر لئے۔ اور اپنی کھاٹ کے نیچے کی زمین
کھودنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ایک مٹی کی ہانڈی نکل آئی۔ یہی اس کی عمر بھر
کی کمائی تھی۔ ساری زندگی کی کفایت شعاری۔ بخل۔ قطع و برید۔ بددیانتی
دلّالی۔ گول مال اسی ہانڈی کے اندر ان روپوں کی صورت میں بند تھا۔
شاید اسی وجہ سے روپے کے چہرے بھی داغدار اور سیاہ ہو گئے تھے۔
لیکن مدتِ العمر کے گناہوں کا کتنا مختصر نتیجہ تھا! گناہ کتنے سستے
بکتے ہیں۔

جیتن نے روپے کن کر بیس بیس کی ڈھیریاں لگائیں۔ کل سترہ
ڈھیریاں تھیں۔ تب اس نے ترازو پر بالے کو روپوں سے تولیہ پندرہ
روپیہ سے کچھ زیادہ وزن تھا۔ سونے کا نرخ بازار میں چڑھا ہوا تھا۔
پراس نے ایک تولہ کی قیمت پچیس ہی روپے قائم کی۔ پھر پچیس پچیس
روپیوں کی ڈھیریاں بنائیں۔ تیرہ گڈیاں ہوئیں۔ اور پندرہ روپے
بچ رہے۔ اس کے کل روپے مالے کی قیمت سے ۳۵ روپے کم تھے۔ اس
نے دل میں کہا۔ اب یہ سودا ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔ کمدوں گا۔ مالا
تیرہ ہی روپے بھر تھی۔ ۱۵ روپے اور بچ جائیں گے۔ چلو مالا رانی! تم اس ڈربے
میں آرام سے بیٹھو۔

ہانڈی پھر زمین کے نیچے چلی گئی۔ ثمرہ گناہ اور بھی مختصر ہو گیا۔
جیتن اس وقت مارے خوشی کے اچھلا پڑتا تھا۔ اس نے بات کی بات
میں پچاس روپوں پر ہاتھ مارا تھا۔ ایسا موقع اسے زندگی میں کبھی نہ ملا تھا۔

اس نے سوچا۔ آج ضرور کسی بھلے آدمی کا منہ دیکھ کر اٹھا تھا۔ بگڑی ہوئی آنکھوں کی طرح بگڑے ہوئے ایمان میں بھی روشنی کا گزر نہیں ہوتا۔
دس بجے جیتن نے ۳۲۵ روپے لا کر سدن کے ہاتھ میں رکھے۔ سدن کو گویا پڑا ہوا دھن ملا۔

روپے دے کر جیتن نے بے غرضانہ انداز سے منہ پھیرا۔ سدن نے پانچ روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دئے اور بولا۔ ”یہ لو تمہارا کو پیٹنا۔“
جیتن نے ایسا منہ بنایا۔ جیسے کوئی بھگت شراب کا پیالہ دیکھ کر بچتا ہے اور بولا۔ ”بھئی تمہارا دیا تو کھاتا ہی ہوں۔ یہ کہاں بچیں گے؟“
سدن۔ نہیں نہیں۔ میں خوشی سے دیتا ہوں۔ لے لو۔ کوئی ہرج نہیں ہے۔

جیتن۔ نہیں بھئی یہ نہ ہوگا۔ ایسا کرتا تو اب تک چار پیسے کا آدمی ہو جاتا۔ نارائن تمہیں بنائے رکھے۔
یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ سدن کو یقین ہو گیا۔ کہ یہ بڑا ایماندار اور نیک نیت آدمی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ سلوک کر دے گا۔

شام کو سدن کی ناؤ گنگا کی لہروں پر اس طرح چل رہی تھی۔ جیسے آسمان پر بادل چلتے ہیں۔ لیکن اس کے چہرہ پر مسرت کی شکستگی کے بجائے فکر فردا کی جھلک نمایاں تھی۔ جیسے کوئی طالب علم کامیابی کا تمغہ حاصل کرنے کے بعد فکر میں ڈوب جاتا ہے۔ اُسے تجربہ ہوتا ہے۔ کہ اب تک جو باندھ مجھے دنیا کے سیلاب سے بچائے ہوئے تھا۔ وہ لوطٹ گیا ہے۔ اور میں اٹھا۔

ندی میں کھڑا ہوں، سدن سوچ رہا تھا۔ میں نے ناؤ تو ندی میں ڈال دی لیکن یہ پار بھی لگے گی۔ اُسے اب معلوم ہو رہا تھا۔ کہ پانی گرا ہے۔ ہوا تیز ہے۔ اور زندگی کا سفر اتنا خوش گوار نہیں ہے۔ جتنا میں سمجھتا تھا۔ لہریں اگر میٹھے سُروں میں گاتی ہیں۔ تو خوفناک آواز سے گر جتی بھی ہیں، ہوا اگر لہروں کو تھپکیاں دیتی ہے۔ تو کبھی کبھی انہیں اچھال بھی دیتی ہے؟

حبیب (۲۵) حبیب

پر بھا کر راؤ کا غصہ کچھ تو سدن کے مضامین سے فرو ہو گیا تھا۔ اور جب پدم سنگھ نے سدن کے اصرار سے سمن کی پوری سرگزشت انہیں لکھ بھیجی۔ تو وہ مطمئن ہو گئے؟

اخراج کی تجویز کو منظور ہوئے تین ماہ گزر گئے۔ لیکن اس کی ترمیم کے متعلق تیغ علی اور دیگر اصحاب کو جو اندیشے تھے۔ وہ باطل ثابت ہوئے، نہ دال منڈی کے مکالوں پر دکانیں ہی آراستہ ہوئیں۔ اور نہ ارباب نشاط نے رشتہ عقد ہی سے کوئی خاص دلچسپی ظاہر کی۔ ہاں کئی بالاعانے خالی البتہ ہو گئے۔ اُن کے بلکینوں نے اخراج کے خوف سے دوسری جگہ رہنے کا انتظام کر لیا۔ کسی قانون کی خلاف ورزی کے لئے اس سے زیادہ نظام بندیوں کی ضرورت ہوتی ہے جتنی کہ اس کے اجراء کے لئے۔ پر بھا کر راؤ کی طمانیت خاطر کا یہ دوسرا سبب تھا۔

پدم سنگھ نے اس تجویز کو تحریک نفرت سے ہاتھ میں لیا تھا۔ لیکن

اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ان کی نفرت بہت کچھ انسانیت اور ہمدردی کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ انہیں جذبات نے انہیں ترمیم سے متفق ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ سوچتے یہ بیچارے، نفسانی خواہشات کا شکار ہو رہے ہیں۔ نشہ ہوس نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ ایسی حالت میں ان کے ساتھ رحم اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اگر ان پر ستم روا رکھا گیا۔ تو ان کی قوت اصلاح اور بھی زائل ہو جائے گی۔ اور جن روجوں کو نصیحت سے محبت سے تعلیم سے تشریف سے بچا سکتے ہیں۔ وہ بھی ہمیشہ کے لئے ہمارے قابو سے نکل جائیں گے، ہم جو خود مکروہات کے غلام ہیں۔ انہیں سزا دینے کا کوئی حجاز نہیں رکھتے۔ اُن کے فعل ہی انہیں کیا کم ذلیل و خوار کر رہے ہیں۔ کہ ہم اُن پر ستم کر کے اُن کی زندگی کو اور بھی خراب و خستہ کریں۔

خیالات فعل کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ پدم سنگھ نے جھجک اور پس پیش کو ترک کر کے دائرہ عمل میں قدم رکھا۔ وہی شخص جو سمن کے سامنے سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اب دن دوپہر دال منڈی کے بالا خانوں پر بیٹھا نظر آنے لگا۔ اُسے اب زبان خلق کا خوف نہ تھا۔ تضحیک اور تحقیر کا اندیشہ نہ تھا۔ اُس کا ضمیر جاگ اُٹھا تھا۔ اس کے دل میں سچی خدمت کا جوش پیدا ہو گیا تھا۔ کچا پھل پتھر مارنے سے بھی نہیں گرتا۔ لیکن پاک کر وہ خود بخود زمین کی طرف ہو جاتا ہے۔

بھٹل داس اس معاملہ میں پدم سنگھ سے متفق نہ ہو سکے انہیں

ایسی ادواح خبیثہ کی اصلاح پر اعتماد نہ تھا۔ سید شفیقت علی بھی جو اس ترمیم کے موجب تھے۔ پدم سنگھ سے کئی کاٹ گئے۔ اور کنور صاحب کو تو اپنے سرو دستار۔ سیرو ہار ہی سے فرصت نہ تھی۔ صرف سوامی گجانبند نے پدم سنگھ کی مدد کی۔ اور کامل طریق پر۔ اس نفس پاک نے اپنے تئیں خدمت پر قربان کر دیا تھا۔

باب (۲۷) :-

ایک مہینہ گزر گیا۔ سدن نے اپنے اس نئے مسئلہ کا ذکر گھر میں کسی سے نہ کیا۔ وہ روز سویرے اٹھتا اور گنگا اٹھان کرنے کے بہانہ سے چلا جاتا وہاں سے دس بجے گھر آتا۔ کھانا کھا کر پھر چل دیتا۔ اور تب کا گیا گیا گھڑی رات لگے لوٹتا۔ اب اس کی ناؤ گھاٹ پر کی سب ناؤں سے زیادہ سچی ہوئی خوش نما تھی۔ اس پر دس ایک مونڈھے رکھے رہتے تھے۔ اور ایک فرش بچھا رہتا تھا۔ اس لئے شہر کے اکثر تفریح پسند لوگ اس پر سیر کیا کرتے تھے۔ سدن کرایہ اور مزدوری کی بابت کچھ بات چیت نہ کرتا۔ یہ سب اس کا ملازم ملاجھینگر کیا کرتا تھا۔ وہ کبھی تو کنارے ایک تخت پر بیٹھا رہتا۔ یا کسی کشتی پر جا بیٹھتا۔ وہ اپنے تئیں اکثر سمجھاتا۔ کہ کام کرنے میں کیا شرم؟ میں نے کوئی بُرا کام تو نہیں کیا ہے۔ کسی کا غلام تو نہیں ہوں۔ کوئی مجھے آنکھیں تو نہیں دکھا سکتا۔ ایمان درست رہنا چاہئے۔ لیکن جو نہی وہ کسی شریف آدمی کو اپنی کشتی کی جانب آتے دیکھتا۔ خود بخود اس

کے قدم پھیرے ہٹ جاتے۔ اور شرم سے آنکھیں جھجک جاتیں۔ وہ ایک زمیندار کا لڑکا تھا۔ اور ایک وکیل کا بھتیجا۔ اس درجہ سے اتر کر اب ملائح کا پیشہ کرنے میں اُسے فطرتاً ایک ذلت محسوس ہوتی تھی۔ اور اُسے استدلال کا کوئی پہلو دور نہ کر سکتا تھا۔ اس بیہودہ شرم سے اس کا بہت نقصان ہو جاتا تھا جس کام کے لئے وہ آسانی سے ایک روپیہ وصول کر سکتا تھا۔ اسی کے لئے اسے اس سے نصف میں راضی ہونا پڑتا تھا۔ اونچی دکان پکوان پھیکے ہونے پر بھی بازار میں ممتاز ہوتی ہے۔ یہاں تو پکوان اچھے تھے۔ صرف ایک سچیلے دکاندار کی ضرورت تھی۔ وضع و قطع ہر ایک پیشہ میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ آپ کسی سفید پوش حجام کو معمولی سے زیادہ اجرت دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں کسی خوش وضع یکہ بال کو خواہ مخواہ اجرت سے کچھ زیادہ ہی دے آتے ہیں۔ سدن اس نکتہ کو سمجھنا تھا۔ پر طبیعت سے مجبور تھا۔ تاہم اوسطاً اسے ڈیڑھ دو روپے روز مل جاتے تھے۔ اور اب وہ زمانہ قریب آتا جاتا تھا جب ندی کنارے اس کا جھونپڑا بنے گا۔ اور آباد ہوگا۔ وہ اب اپنے بل بوتے پر بکھرے ہوئے کے قابل ہوتا جاتا تھا۔ اس خیال سے اس کی غیر تمیز طبیعت مخمور ہو جاتی تھی۔ وہ اکثر رات کی رات انہیں آرزو دل کا خواب دیکھنے میں کاٹ دیتا تھا۔

اسی اثناء میں میونسپل بورڈ نے ارباب نشاط کے لئے شہر سے ذرا ہٹ کر مکانات تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ لالہ بھگت رام کو اس کام کا ٹھیکہ ملا۔ انہیں

اس پار کوئی ایسی زمین نہ مل سکی۔ جہاں وہ اینٹ کے پڑاؤ سے لگاتے اور
چھونے کے بھٹے بناتے۔ اس لئے انہوں نے ندی پار زمین لی تھی اور سب
سامان وہیں تیار کرتے تھے۔ اس پار سے ان چیزوں کو لانے کے لئے انہیں
ایک ناؤ کی ضرورت ہوئی۔ وہ ناؤ طے کرنے کے لئے ندی کنارے آئے۔
سدن سے ملاقات ہو گئی۔ سدن نے اپنی ناؤ دکھائی بھگت رام نے پسند کی۔
جھینگہ سے مزدوری طے ہوئی۔ دو دھپوے روز لانے کا وعدہ ہوا بھگت رام
نے بیعہ نہ دیا۔ اور چلے گئے۔

روپیہ کی چاٹ بڑی ہوتی ہے۔ سدن اب وہ اڑاؤ۔ لٹاؤ۔ فضول
خرچہ لوجوان نہیں تھا اس کے سر پر اب فکروں کا بوجھ ہے۔ فرض کا فرض
ہے۔ وہ اس بار سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ اُس کی نگاہ ایک ایک
پیسے پر رہتی ہے۔ اسے اب روپے کمانے اور بنوانے کی دھن ہے۔
اس دن وہ کھڑی رات رہے اُٹھ کر ندی کنارے پر چلا آیا۔ اور جھینگہ
کو جگا کر ناؤ کھلوادی۔ دن نکلتے نکلتے اس پار جا پہنچا۔ وہاں کسی کے وقت
اُس نے خود ڈانڈا لے لیا۔ اور بیٹھتے ہوئے دو چار ہاتھ چلائے۔ مگر جب
کشتی کی چال میں نمایاں فرق دیکھا۔ تو اس نے زور زور سے ہاتھ چلانے
شروع کئے۔ شہزور آدمی تھا۔ کشتی کی رفتار دینی ہو گئی۔ جھینگہ پہلے تو
مسکراتا رہا۔ لیکن اب حیرت میں آگیا۔ آج سے وہ سدن کا دباؤ کچھ زیادہ
ماننے لگا۔ اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ یہ بالو صاحب نرے مٹی کے لونڈے نہیں
ہیں۔ کام پڑنے پر یہ اکیلے ہی کشتی کو پار لے جاسکتے ہیں۔ اور اب مجھ

ڑانے کی گنجائش نہیں ہے۔

اُس دن دو کھیوے ہوئے۔ دوسرے دن ایک ہی ہوا۔ کیونکہ سدن کو آنے میں دیر ہو گئی تیسرے دن اُس نے نو بجے رات کو تیسرا کھیو الورا کیا۔ لیکن پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسا تھک گیا تھا۔ کہ گھڑ تک آنا پھاڑ ہو گیا۔ اسی طرح متواتر دو ماہ تک اس نے کام کیا۔ اور اُسے خاصا نفع ہوا۔ اُس نے دو ملازمت اور رکھ لئے۔

سدن اب ملازمتوں کا سرغنہ تھا۔ اُس کا جھونپڑا تیار ہو گیا تھا لہذا ایک تخت تھا۔ دوپٹنگ۔ دو لمپ۔ کچھ معمولی برتن۔ ایک کمرہ بیٹھنے کا تھا۔ ایک کھانا پکانے کا۔ ایک سونے کا۔ دروازہ پرائیٹوں کا ایک چبوترہ تھا۔ اس کے ارد گرد گیلے رکھے ہوئے تھے۔ دو ناندوں میں سینیں لگی ہوئی تھیں جس کی لیتائیں جھونپڑے کے اوپر چڑھتی آتی تھیں یہ چبوترہ اب ملازمتوں کا ادا تھا۔ وہ اکثر یہیں بیٹھے تبا کو پیا کرتے تھے سدن نے اُن کے ساتھ ایک بڑا سلوک کیا تھا۔ حکام سے خط و کتابت کر کے اُس نے انہیں آئے دن کی بیگار سے نجات دلوا دی تھی۔ اس دلیرانہ طرز عمل نے اس کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اُس کے پاس کچھ روپے جمع ہو گئے تھے۔ اور وہ ملازمتوں کو ضرورت پر بلا سود کے قرض دے دیا کرتا تھا۔ اُسے اب ایک بالٹکل کی فکر تھی۔ شوقین اصحاب کی تفریح کے لئے وہ ایک بکرا بھی لینا چاہتا تھا۔ اور ہارمونیم کے لئے تو اس نے فرمائش بھی لکھ دی تھی۔ وہ اس دیوی کے استقبال کی تیاریاں کر رہا تھا جو اس کا شانے کو رشک فردوس

بنائے گی :

سدن کی حانت بے شک ایسی ہو گئی تھی۔ کہ وہ خانہ داری کا بار اٹھا سکے۔ لیکن چچا کی مرضی کے بغیر وہ شانتا کو لانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ وہ گھر پر شر ناجی کے ساتھ کھانے بیٹھتا۔ تو دل میں مصمم ارادہ کر لیتا۔ کہ آج اس معاملہ کو طے کر لوں گا۔ لیکن عین موقع پر ناطقہ دغا دے جاتا۔ بات منہ سے نہ نکل سکتی۔ اگرچہ اُس نے پدم سنگھ سے خود اپنی کشتی رانی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ لیکن انہیں لالہ بھگت رام سے سب حالات معلوم ہو گئے تھے۔ یہ سدن کی اس حرفت پسندی پر دل میں بہت خوش تھے۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ دو کشتیاں اور لے لی جائیں اور کاروبار بڑھا دیا جائے۔ لیکن چونکہ سدن خود کچھ نہیں کتا تھا۔ تو وہ بھی اس معاملہ میں خاموش رہنا مناسب سمجھتے تھے۔ وہ پہلے ہی سے اُس کی خاطر کرتے تھے۔ اب کچھ عزت بھی کرنے لگے اور سبھدرا کے برتاؤ میں تو اب واضح فرق ہو گیا تھا۔ وہ اب اسے لڑکے کی طرح چاہنے لگی تھی :

ایک روز رات کو سدن اپنے جھونپڑے میں بیٹھا ہوا ہندی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آج نہ جانے کیوں ناؤ کے آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ سامنے لیمپ جل رہا تھا۔ سدن کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا۔ پر اُس کا جی پڑھنے میں نہ لگتا تھا۔ ناؤ کے نہ آنے سے اُسے کسی سانحہ کا اندیشہ ہونا تھا۔ اس نے اخبار رکھ دیا۔ اور باہر نکل آیا۔ ریت پر چاندنی کا سنہرا فرش بچھا ہوا تھا۔ اور چاند کی شعاعیں سطح ساکت پر ایسی معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے کسی

دادی تاریک میں، عتھے شفاف پانی کا چشمہ بتدریج چوڑا ہوتا ہوا نکلتا ہے
چوڑے پر کئی ملاح بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے دفعۃً سدن نے دو
عورتوں کو شہر کی جانب سے آتے دیکھا۔ اُن میں سے ایک نے ملاخوں
سے پوچھا: ”ہم کو اس پار جانا ہے۔ کوئی ناؤ لے چلے گا؟“

سدن نے آواز پہچانی۔ یہ سمن تھی۔ سدن کے سینہ میں ایک گدگی
سی ہوئی۔ آنکھوں میں ایک سرور سا آیا۔ وہ لپک کر چوڑے کے پاس
آیا۔ اور سمن سے بولا: ”بائی جی تم یہاں کہاں؟“

سمن نے غور سے سدن کی طرف دیکھا۔ گویا اسے پہچانتی ہی نہیں۔
اس کے ساتھ والی عورت نے گھونگاھٹ بڑھالیا۔ اور لالٹین کی روشنی
سے کئی قدم ہٹ کر اندھیرے میں چلی گئی۔ سمن نے تعجب سے کہا: ”کون
سدن؟“

ملاخوں نے اٹھ کر گھیر لیا۔ لیکن سدن نے کہا: ”تم لوگ جاؤ۔ یہ ہمارے
گھر کی عورتیں ہیں۔ آج یہیں رہیں گی۔“ اس کے بعد وہ سمن سے بولا: ”بائی
جی۔ خیریت تو ہے کیا ماجرا ہے؟“

سمن۔ سب خیریت ہے۔ بھاگ میں جو لکھا ہے۔ وہی بھوگ رہی
ہوں۔ آج کا اخبار تم نے ابھی نہ پڑھا ہو گا۔ پر بھاگ راڈ نے نہ جانے کیا چھاپ
دیا۔ کہ آشرم میں بلچل مچ گئی ہم وہ نول وناں ایک دن بھی اور رہ جاتے تو
آشرم بالکل خالی ہو جاتا۔ وناں سے نکل بھاگنا ہی مصاحت تھی۔ اب اتنی
اعنائیت کرو۔ کہ ہمیں اس پار لے جانے کے لئے ایک ناؤ ٹھیک کر دو وہاں

یکہ کر کے مغسرائے چلے جائیں گے۔ امولا کے لئے کوئی نہ کوئی گاڑی مل ہی جائے گی۔ یہاں سے رات کو کوئی نہیں جاتی :

سداں۔ اب تو تم اپنے گھر ہی پہنچ گئیں۔ امولا کیوں جاؤ گی؟ تم لوگوں کو تکلیف تو بہت ہوئی۔ پر اس وقت تمہارے آنے سے مجھے جتنی خوشی ہوئی۔ وہ بیان نہیں کر سکتا میں خود کئی دن سے ارادہ کر رہا تھا۔ کہ تمہارے پاس آؤں۔ لیکن کام سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ میں تین چار مہینہ سے ملائی کا پیشہ کرنے لگا ہوں۔ یہ تمہارا جھوٹا ہے۔ چلو اندر چلو۔ سمن اندر گئی۔ لیکن شانتا وہیں اندھیرے میں چپ چاپ سر جھکا کھڑی رہی۔ جب سے اس نے سداں سنگھ کی زبان سے اس کا دلشکن فیصلہ سنا تھا۔ اُس دُکھیا نے رو رو کر دن کاٹے تھے۔ اُسے بار بار اپنے غرور پر افسوس ہوتا وہ سوچتی اُس وقت اگر میں اُن سے سنت کرتی۔ تو انہیں مجھے پر ضرور رحم آجاتا۔ سداں کی صورت اس کی آنکھوں میں پھرتی۔ اور اس کی باتیں کانوں میں گونجتی تھیں۔ باتیں دلشکن تھیں۔ لیکن شانتا کو ان میں بے مددی اور محبت کی بو آتی تھی۔ اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا۔ کہ یہ سب میری بھوٹی تقدیر کا پھل ہے۔ سداں کا بالکل قصور نہیں۔ وہ سچ مجھ مجبور ہیں۔ اپنے ماں باپ کی بات مانتی ان کا فرض ہے۔ یہ میرا کمینہ پن ہے۔ کہ انہیں فرض کے راستہ سے ہٹانا چاہتی ہوں۔ ہائے میں نے اپنے سوا می سے غرور کیا۔ اپنی مسئلہ غرض کی دھن میں ان کی بے عزتی کی۔ جوں جوں دن گزرتے تھے۔ شانتا کی روحانی کلفت بڑھتی جاتی تھی۔ اس غم فکر اور

صدۂ فراق سے وہ نازنین اس طرح سوکھ گئی تھی۔ جیسے جھپٹے میں ندی سوکھ جاتی ہے :

سمن جھونپڑے میں چلی گئی۔ تو سدن آہستہ آہستہ شانتا کے سامنے آیا۔ اور کانپتے ہوئے بولا : "شانتا" یہ کہتے کہتے اُس کا گلا پھنس گیا :
 شانتا سرورِ الفت سے سرشار ہو گئی۔ اس نے دل میں کہا۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ معلوم نہیں زندہ رہوں۔ نہ رہوں۔ ان کے درشن پھر ہوں یا نہ ہوں۔ ایک بار ان کے قدموں پر سر رکھ کر رونے کی آرزو کیوں دل میں رہ جائے۔ اس سے بہتر اور کون سا موقع ملے گا؟ یہ ایک بار مجھے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر میرے آنسو پونچھ دیں گے۔ تو مجھے تسکین ہو جائے گی میرا جہم سہل ہو جائے گا میں جب تک جیوں گی۔ اسی خوبی قسمت کو یاد کر کے دل کو خوش کروں گی۔ مجھے تو یہ امید بھی نہ تھی۔ کہ کبھی تمہارے درشن پاؤں گی۔ لیکن جب ایشور نے وہ دن دکھایا۔ تو دل کی حسرت کیوں باقی رہے۔ زندگی کے صحراء خشک میں یہ ہر اُبھرا درخت مل گیا ہے تو کیوں نہ اس کے سایہ میں دم لے کر اپنے دل سوزاں کو ٹھنڈا کر لوں :

یہ سوچ کر شانتا روتی ہوئی سدن کے پیروں پر گر پڑی۔ لیکن لوطا ہوا دل ان جذبات کا بار نہ سنبھال سکا۔ مڑجھایا ہوا اُچھول ہوا کا جھونکا لگتے ہی ریزہ ریزہ ہو گیا۔ سدن جھجکا۔ کہ اُسے اٹھا کر سینے سے لگائے چٹائے لیکن شانتا کی حالت دیکھ کر بے اختیار اس کے جگر سے ایک صداء درد نکل آئی جب اس نے پہلے دیا کے کنارے دیکھا تھا۔ تو وہ حسن کی

ایک نوشگفتہ کو پل کھتی۔ پر آج وہ ایک برگ خزاں رسیدہ کھتی خشک
اور زرد

سدن کا دل دریا میں چمکتی ہوئی چاند کی کرنوں کی طرح کھتر کھتر رہا
تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس تن بے جاں کو اٹھا لیا بخلوں
درد میں اسے ایشور کی یاد آئی۔ روتے ہوئے بولا ایشور مجھ سے بڑا گناہ ہوا
ہے۔ میں نے ایک نرم اور نازک دل کو بڑی بیدردی سے مسلا ہے۔ لیکن
اس کی یہ سزا بہت سخت ہے تم حیم ہو۔ مجھ پر رحم کرو۔

شانتا کو سینہ سے لگائے ہوئے سدن جھونپڑے میں گیا۔ اور اسے
پلنگ پر لٹا کر بیکسانہ انداز سے بولا بسمن دیکھو۔ یہ کیسی ہوئی جا رہی ہیں۔
میں ڈاکٹر کے پاس دوڑا جاتا ہوں۔

بسمن نے قریب آکر بسمن کو دیکھا پیشانی پر پسینہ کے قطرے نمودار
تھے۔ آنکھیں پتھر لگی تھیں۔ نبض کا بہتہ نہیں۔ چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی
کھتی۔ اُس نے فوراً پٹکھا اٹھا لیا۔ اور جھلنے لگی۔ وہ غصہ جو مہینوں سے
اس کی حالت دیکھ دیکھ کر اس کے دل میں جمع ہو رہا تھا۔ پھوٹ نکلا۔
سدن کی طرف ملائمت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولی یہ تمہارے ظلم کا
پھل ہے۔ یہ تمہاری کرنی ہے۔ تمہارے ہی بیرجم ہاتھوں نے اس پھول
کو اتنی بے دردی سے مسلا ہے۔ تمہارے ہی پیروں نے اس پودے
کو اتنی بے رحمی سے کچلا ہے۔ لو اب تمہارا کھٹا چھوٹا جاتا ہے۔ سدن جس
ان سے تم نے زہریلے تیروں سے اسے مارا۔ اُس دن سے اس غریب

نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کے ہونٹوں پر کبھی ہنسی نہیں آئی۔ اس کی آنکھیں
 کبھی خشک نہیں ہوئیں۔ بہت گلا دبانے سے دو چار لقمے کھا لیا کرتی تھی۔
 اور تم نے یہ سنا اُسے صرف اس نئے دی۔ کہ وہ میری بہن ہے۔ حالانکہ میرے
 ہی پیروں پر تم نے برسوں ناک رگڑی ہے۔ میرے تلوے تم نے برسوں
 سلوائے ہیں۔ میری ناپاک محبت میں تم برسوں متوالے رہتے ہو۔ اس
 وقت بھی تو تم اپنے ماں باپ کے سعادتمند بیٹے تھے۔ یا کوئی اور تھے؟
 اس وقت بھی تو تم اسی اونچے خاندان کے چراغ تھے۔ یا کوئی اور تھے؟
 تب تمہاری ناپاک حرکتوں سے خاندان کی ناک نہ کٹتی تھی؟ آج تم
 آکاش کے دیوتا بنے پھرتے ہو! اندھیرے میں جھوٹا کھانے سے
 پرہیز نہیں۔ اُجالے میں دعوت سے بھی انکار یہ نری دکاری ہے۔ نری
 دغا بازی۔ جیسا تم نے اس اناٹھ کے ساتھ کیا ہے۔ اس کا پھل ہمتیں
 ایشور کے یہاں سے ملے گا۔ اس کو تو بھگتنا تھی بھکت چکی۔ آج نہ مری
 کل مرجائے گی۔ لیکن تم اسے یاد کر کے روڈ گے۔ کوئی دوسری عورت ہوتی
 تو تمہاری باتیں سن کر پھر تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ لیکن یہ
 غریب سدا تمہارے نام پر مرتی رہی۔ لاؤ تھوڑا سا ٹھنڈا پانی؟“
 سدا مجرم کی طرح سر جھکائے منتا رہا۔ اس ملامت سے اس کا دل
 کچھ ہلکا ہوا۔ سمن نے اگر غصہ میں گالیاں دی ہوتیں۔ تو شاید اُسے اور
 بھی تسکین ہوتی۔ وہ اپنے تن میں اس طعن و تشنیع کا سراسر سزاوار
 پاتا تھا۔ جب ہم سے کوئی ایسا فعل ہو جاتا ہے جس پر ہم خود ناام ہوں۔

تو کسی غیر کی لعن طعن ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن یہ حالت صرف معمولی خطاؤں میں ہوتی ہے۔ ہماری قوت تحمل درجہ گناہ کے اعتبار سے بڑھتی جاتی ہے۔
 سدن نے ٹھنڈے پانی کا گلاس لا کر سمن کو دیا۔ اور خود پنکھا جھلنے لگا۔ سمن نے شانتا کے منہ پر پانی کے کئی چھینٹے دئے۔ اس پر بھی جب شانتا نے آنکھیں نہ کھولیں۔ تو سدن ڈرتے ڈرتے بولا "جا کر ڈاکٹر بلا لاؤں نا؟"
 سمن۔ نہیں گھبراؤ مت۔ ٹھنڈک پہنچتے ہی ہوش آجائے گا۔ ڈاکٹر کے پاس اس مرض کی دوا نہیں ہے۔

سدن کو گونہ تسلی ہوئی۔ بولا "سمن چاہے تم سمجھو۔ کہ میں بات بنا رہا ہوں۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ کہ اُسی منحوس گھڑی سے میری روح کو ایک لمحہ بھی اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ میرا دل بار بار مجھے نفرت کرتا تھا۔ کئی بار ارادہ کیا۔ کہ چل کر اپنی خطائیں معاف کراؤں۔ لیکن یہی خیال آتا تھا کہ کس بوتے پر جاؤں؟ گھر والوں سے ہمدردی کی اُمید نہ تھی۔ اور مجھے تو تم جانتی ہو۔ ہمیشہ کو تل بنا رہا۔ بس اسی فکر میں ڈوب رہتا تھا۔ کہ کسی طرح چار پیسے پیدا کروں۔ اور اپنی جھونپڑی الگ بناؤں۔ مہینوں نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرا۔ کہیں ٹھکانہ نہ ملا۔ آخر تقدیر گنگا کنارے لائی۔ جی میں آیا ایک کشتی لے کر اپنے تئیں مسجدھار میں ڈال دوں۔ یا تو پار ہی ہو جاؤں گا۔ یا ڈوب ہی مروں گا۔ لیکن ناؤ چل نکلی۔ یہ جھونپڑا بنا لیا ہے۔ اور ارادہ ہے۔ کہ کچھ روپے ہاتھ آجائیں۔ تو اُس پار کسی موضع میں ایک مکان بنوا لوں کیونکہ ان کی طبیعت کچھ سنبھلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

سمن کا غصہ کچھ دھیمّا ہوا۔ بولی: "ہاں اب کوئی اندیشہ نہیں ہے۔
صرف غشی تھی؟"

سدن ایسا خوش ہوا۔ کہ اگر وہاں ایشور کی مورت ہوتی۔ تو وہ اس کے
پیروں پر سر ٹپک دیتا۔ بولا: "سمن تم نے مجھے جلا لیا۔ اگر کوئی اور بات ہو
جاتی۔ تو اسی لاش کے ساتھ میری بھی لاش لکھتی؟"

سمن۔ چپ رہو۔ کیسی بات منہ سے نکالتے ہو۔ پر ماتما چاہیں گے۔
تو بنا دو اسی کے اچھی ہو جائے گی۔ اور تم دونوں بہت دنوں تک سکھ
سے رہو گے۔ تمہیں اس کی دوا ہو۔ تمہاری محبت ہی اس کی جان ہے
تمہیں پا کر اب اسے کوئی اور آرزو نہیں ہے۔ لیکن اگر تم نے بھول کر بھی
کبھی اس سے من موٹا کیا۔ تو اس کی پھر یہی حالت ہو جائے گی۔ اور
تمہیں ہاتھ ملنا پڑے گا۔

اتنے میں شانتا نے کروٹ بدلی۔ اور پانی مالگا۔ سمن نے پانی کا گلاس
اس کے منہ سے لگا دیا۔ اس نے دو تین گھونٹ پانی پیا۔ اور پھر چا پائی
پر لیٹ گئی۔ وہ پُر استعجاب لگا ہوں سے ادھر ادھر تاک رہی تھی۔
گویا اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں ہے۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اور سمن
کی طرف دیکھتی ہوئی بولی: "کیوں یہ میرا گھر ہے نا؟ ہاں ہاں یہی ہے۔
اور وہ کہاں ہیں؟ میرے مالک۔ میری زندگی کے ادھار؟ انہیں بلاؤ۔
اگر مجھے درشن دیں۔ بہت جلا یا ہے۔ اُس آگ کو بجھائیں۔ میں اُن سے
کچھ پوچھوں گی۔ کیا انہیں آتے؟ اچھا تو لو میں ہی آتی ہوں۔ آج اُن سے

میری تکرار ہوگی۔ نہیں میں اُن سے تکرار نہ کر دوں گی۔ صرف یہی کہوں گی۔
 کہ اب مجھے چھوڑ کر کہیں مت جانا چاہے گلے کا ہار بنا کر رکھو۔ چاہے
 پیروں کی پیٹری بنا کر رکھو۔ پر اپنے ساتھ رکھو۔ یہ بروگ اب نہیں سہا
 جاتا۔ میں جانتی ہوں۔ تم مجھے دل سے چاہتے ہو۔ اچھا نہ سہی۔ تم مجھے
 نہیں چاہتے۔ میں تو تمہیں چاہتی ہوں۔ اچھا یہ بھی نہ سہی۔ میں بھی تمہیں
 نہیں چاہتی۔ میرا بیاہ تو تمہارے ساتھ ہوا ہے۔ نہیں۔ نہیں پُروا۔ اچھا
 کچھ نہ سہی۔ میں تم سے حجت نہیں کرتی۔ لیکن میں تمہارے ساتھ رہوں
 گی۔ اور اگر تم نے پھر اپنی آنکھ پھیری تو اچھا نہ ہوگا۔ ہاں اچھا نہ ہوگا۔
 میں سنسار میں رونے کے لئے نہیں آئی ہوں۔ یہی نہ ہوگا۔ کہ چار آدمی
 تم پر نہیں گئے۔ میری خاطر سے سہ لینا۔ کیا ماں باپ چھوڑ دیں گے؟
 کیسی بات کہتے ہو۔ ماں باپ لڑکے کو نہیں چھوڑتے۔ تم دیکھ لینا۔ میں
 انہیں کھینچ لاؤں گی۔ کیا انہیں مجھ پر رحم نہ آئے گا۔۔۔۔۔۔ یہ
 کہتے کہتے شانتا کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔

سمن۔ اب سو رہی ہے۔ سونے دو۔ ایک نین سوے گی۔ تو طبیعت
 ٹھکانے آجائے گی۔ رات زیادہ آگئی ہے۔ اب تم بھی گھر جاؤ۔ شراجی
 گھبرا رہے ہوں گے۔

سدن۔ آج نہ جاؤں گا۔

سمن۔ نہیں نہیں وہ لوگ گھبرا ئیں گے۔ شانتا اب بالکل اچھی
 ہے۔ دیکھو کیسے مزے سے سوتی ہے۔ اتنے دنوں میں آج ہی میں نے اُسے

یوں سوتے دیکھا ہے:
 سدن نے نہیں مانا۔ وہیں برآمدے میں آکر تخت پر لیٹ رہا۔ اور
 سوچنے لگا:

﴿ب﴾ (۲۷) ﴿ب﴾

بالو بٹھل داس منصف مزاج آدمی تھے جس طرف انصاف کھینچ لے
 جاتا۔ ادھر ہی چلے جاتے تھے۔ اس میں انہیں ذرا بھی تامل نہ ہوتا تھا۔
 جب انہوں نے یدم سنگھ کو جادہ حق سے ہٹتے دیکھا۔ تو ان کا ساتھ چھوڑ
 دیا۔ اور کئی ماہ تک ان کے گھر نہ آئے۔ لیکن جب پرہیزگار آئے آشرم
 پر چلے گئے شروع کئے۔ اور سمن کے متعلق چند پوشیدہ باتیں ظاہر کر دیں۔
 تو بٹھل داس کا ان سے بھی لگاڑ ہو گیا۔ اب سارے شہر میں ان کا کوئی ہمد
 نہ تھا۔ اب انہیں تجربہ ہو گیا تھا۔ کہ ایک ایسے دارالخیر کے منتظم ہو کر جس کا
 وجود دوسروں کی ہمدردی اور اعانت پر قائم ہو۔ میرا کسی فریق سے مخصوص
 ہونا حد درجہ نازیبا ہے۔ شام کا وقت تھا۔ وہ بیٹھے ہوئے سوچ رہے تھے۔
 کہ ان حکموں کا کیا جواب دوں۔ باتیں بہت کچھ سچی ہیں۔ سمن نے الواقع
 بازاری عورت تھی۔ میں نے یہ جانتے ہوئے بھی اسے آشرم میں داخل کیا۔
 انتظامیہ کمیٹی سے اس کے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کی منظوری نہیں
 حاصل کی۔ دراصل میں نے آشرم کو اپنی ذاتی چیز خیال کیا۔ میرا مقصد
 چاہے کتنا ہی قابل تعریف ہو۔ پر اسے مخفی رکھنا ہرگز مناسب نہ تھا:

بھٹل داس ابھی کچھ فیصلہ نہ کرنے پائے تھے۔ کہ آشرم کی معتمدہ نے
 آکر کہا: "بالو جی آنندی۔ راجکمار ی اور گوری گھر جانے کو تیار بیٹھی ہوئی
 ہیں۔ میں نے بہت سمجھایا۔ پر وہ کسی طرح نہیں مانتیں؟"

بھٹل داس نے جھنجھلا کر کہا: "کہہ دے چلی جائیں۔ مجھے اس کا خوف
 نہیں ہے۔ ان کے لئے میں سمن اور شانتا کو نہیں نکال سکتا؟"

معتمدہ چلی گئی۔ اور بھٹل داس پھر خیال میں ڈوبے: "یہ عورتیں اپنے
 شے کیا سمجھتی ہیں؟ کیا سمن اس درجہ گری ہوئی ہے۔ کہ یہ سب اس کے
 ساتھ رہ بھی نہیں سکتیں۔ اُن کا اعتراض ہے۔ کہ آشرم بدنام ہو گیا ہے۔
 اور یہاں رہنے میں ہماری بدنامی ہے۔ ہاں ضرور بدنامی ہے۔ جاؤ۔ میں
 تمہیں نہیں روکتا؟"

اس وقت ڈاکہ چھٹیاں لے کر آیا بھٹل داس کے نام پانچ خطوط
 تھے۔ ایک میں لکھا تھا۔ میں اپنی لڑکی ویدیا دتی کو آشرم میں رکھنا مناسب
 نہیں خیال کرتا۔ میں اسے لینے آ رہا ہوں۔ دوسرے صاحب نے دھمکا
 تھا۔ کہ اگر طوائفوں کو آشرم سے نکالا نہ جائے گا۔ تو میں چندہ دینا بند
 کر دوں گا۔ تیسرے خط کا بھی یہی منشا تھا۔ باقی دونوں چٹھیاں بھٹل
 داس نے نہ کھولیں۔ ان دھمکیوں سے وہ خائف نہیں ہوئے۔ بلکہ اور
 بھی جھجھلا گئے۔ یہ لوگ سمجھتے ہوں گے۔ کہ میں ان کی گیدڑ بھبکیوں سے
 کانپنے لگوں گا۔ یہ نہیں سمجھتے۔ کہ بھٹل داس کسی کی پروا نہیں کرتا۔ آشرم
 چاہے لٹ جائے۔ لیکن شانتا اور سمن کو میں ہرگز علیحدہ نہ کروں گا۔

بھٹل داس کے غور نے ان کے احساس حق کو زائل کر دیا۔ سینہ زوری
اور ثبات دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ فرق صرف ان کے عمل میں
ہے۔

سمن دیکھ رہی تھی۔ کہ میرے ہی باعث یہ بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔
اُسے افسوس ہو رہا تھا۔ کہ میں یہاں کیوں آئی۔ اس نے دل و جان سے
بدھواؤں کی خدمت کی تھی۔ اُس کا یہ نتیجہ نکلا۔ وہ جانتی تھی۔ کہ بھٹل داس
کبھی مجھے یہاں سے نہ جانے دیں گے۔ اس لئے اس نے ارادہ کیا۔ کہ
کیوں نہ میں خود چپکے سے چلی جاؤں۔ تین عورتیں چلی گئی تھیں۔ تین چار
مستورات جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ اور کئی عورتوں نے اپنے
اپنے گھر خطہ ط بھیجے تھے۔ صرف وہی عورتیں خاموش بیٹھی ہوئی تھیں
جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ پردہ بھی سمن سے آنکھیں چراتی پھرتی تھیں
سمن یہ بے عزتی نہ برداشت کر سکی۔ اُس نے شانتا سے مشورہ کیا۔ شانتا
بڑی شمش و پنچ میں پڑی۔ پدم سنگھ کی اجازت کے بغیر وہ آشرم سے
نکلنا غیر مناسب سمجھتی تھی۔ لیکن جب سمن سے قطعی طور سے کہہ دیا۔ کہ
تم رہتی ہو تو رہو۔ لیکن میرا یہاں رہنا ممکن نہیں۔ تو شانتا بھی مجبور
ہو گئی۔ اس جنگل میں بھٹکنے ہوئے آدمی کی طرح جو کسی دوسرے آدمی
کو دیکھ کر محض اس لئے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ کہ ایک سے دو ہو
جائیں گے۔ شانتا اپنی بہن کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی۔
سمن نے پوچھا: اور پدم سنگھ فاراض ہوں؟

شانتا۔ انہیں ایک خط لکھ کر پوری سرگزشت سنا دوں گی۔

سمن۔ اور جو سدن سنگھ بگڑے؟

شانتا۔ جو سزا دیں گے۔ وہ بھگت لوں گی۔

سمن۔ خوب سوچ لو ایسا نہ ہو پھر پھپھتا نا پڑے۔

شانتا۔ رہنا تو مجھے یہیں چاہیئے۔ پر تمہارے بغیر مجھ سے رہا نہ

جائے گا۔ ہاں یہ تو بتلاؤ کہاں چلو گی؟

سمن۔ تمہیں امولا پنچا دوں گی۔

شانتا۔ اور تم؟

سمن۔ میرا الشور مالک ہے۔ کہیں تیرے جاترا کرنے چلی جاؤں

گی۔

دونوں بہنوں میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ پھر دونوں مل کر
روئیں۔ جونہی آٹھ بجے اور بھٹل داس کھانا کھانے کے لئے اپنے گھر گئے۔
دونوں بہنیں سب کی نگاہ بچا کر چل کھڑی ہوئیں۔

رات بھر کسی کو خبر نہ ہوئی۔ سویرے چوکیار نے آکر بھٹل داس کو یہ
خبر سنائی۔ وہ گھبرائے اور لپکے ہوئے سمن کے کمرہ میں جا پہنچے۔ سب
چیزیں پڑی ہوئی تھیں صرف دونوں بہنوں کا پتہ نہ تھا۔ بچا رے
بڑی تشویش میں پڑے۔ پدم سنگھ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ انہیں اس
وقت سمن پر غصہ آیا۔ یہ سب اسی کی حرکت ہے۔ وہ شانتا کو بھی بھگا کر
لے گئی ہے۔ دفعۃً انہیں سمن کی چارپائی پر ایک خط پڑا ہوا ملا۔ اُسے

اٹھا لیا۔ اور پڑھنے لگے۔ سمن نے چلتے وقت یہ خط لکھ کر رکھ دیا تھا۔ اُسے
پڑھ کر بھٹل داس کو یک گونہ اطمینان ہوا۔ لیکن سمن کے باعث مجھے آج
نیچا دیکھنا پڑا۔ انہوں نے فل میں فیصلہ کیا تھا۔ کہ میں دھمکی دینے
والوں کو نیچا دکھاؤں گا۔ یہ موقع اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب لوگ
یہی سمجھیں گے۔ کہ میں ڈر گیا، اس خیال سے بھٹل داس آشفۃ خاطر
ہوئے۔

آخر وہ کرہ سے نکلے۔ اور سیدھے پدم سنگھ کے پاس پہنچے۔

شہراجی نے یہ خبر سنی تو ستائے میں آگئے۔ بولے۔ ”اب کیا ہو؟“

بھٹل داس۔ وہ امولا پہنچ گئی ہوں گی۔

پدم سنگھ۔ ہاں ممکن ہے۔

بھٹل۔ سمن اتنی دور کا سفر آسانی سے کر سکتی ہے۔

پدم سنگھ۔ ہاں۔ بہت آسانی سے۔

بھٹل۔ سمن تو امولا گئی نہ ہوگی؟

پدم۔ کون جانے دونوں بہنیں ڈوب مری ہوں۔

بھٹل۔ ایک تار بھیج کر پوچھ کیوں نہ لیا جائے؟

پدم۔ کون منہ لے کر پوچھوں۔ جب مجھ سے شانتا کی خبر گیری تک

نہ ہو سکی۔ تو اس کے متعلق کچھ پوچھنا نہایت شرمناک ہے۔ مجھے آپ کے

اوپر کامل اعتماد تھا۔ اگر جانتا۔ کہ آپ اتنی لاپرواہی کریں گے۔ تو اسے اپنے ہی

گھر رکھتا۔

بھٹل۔ آپ تو ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ گویا میں نے عہد انہیں آشرم سے نکال دیا۔

شرابا۔ آپ ان کی تشفی کرتے رہتے۔ تو وہ کبھی بھی نہ جانتیں، آپ نے مجھے بھی اس وقت اطلاع دی ہے۔ جب موقعہ ملا تو سے نکل گیا۔
بھٹل۔ آپ ساری ذمہ داری میرے ہی سر ڈالنا چاہتے ہیں؟
شرابا۔ اور کس کے سر ڈالوں۔ آشرم کے منتظم آپ ہی ہیں یا کوئی

بھٹل۔ شانتا کو آشرم میں رہتے تین ماہ گزر گئے۔ آپ بھول کر بھی آشرم کی طرف گئے؟ اگر آپ کبھی کبھی وہاں جا کر اس کی خیر و عافیت پوچھتے رہتے۔ تو اسے اطمینان رہتا۔ جب آپ نے کبھی اس کی بات تک نہ پوچھی۔ تو وہ کس اُمید پر وہاں پڑی رہتی۔ میں اپنی ذمہ داری کو تسلیم کرتا ہوں۔ پر آپ بھی الزام سے نہیں بچ سکتے۔

پدم سنگھ آج کل بھٹل داس سے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ انہیں کے ایما اور تحریک سے بازار حسن کی اصلاح پر آمادہ ہوئے تھے۔ پر جب آخر کام کرنے کا موقعہ آیا۔ تو وہ صاف نکل گئے۔ اور بھٹل داس بھی ارباب نشاط سے ان کی ہمدردی دیکھ کر انہیں شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دونوں اصحاب اپنے اپنے دل میں غبار بھرے ہوئے ایک دوسرے کو متہم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پدم سنگھ انہیں خوب جھجھوڑنا چاہتے تھے۔ پر یہ دندان شکن جواب پا کر انہیں خاموش ہونا پڑا۔ بولے: ہاں اتنی خطا ضرور

میری ہے؟

بھٹل داس۔ نہیں آپ کو خطا ثابت کرنا مقصود نہیں ہے۔
خطا سب میری ہے۔ آپ نے میرے سپرد کر دیا۔ تو آپ کا ان کی طرف سے
مطمئن ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔

پدم سنگھ۔ نہیں فی الواقع یہ میری ہزدلی اور سہل کاری کا نتیجہ
ہے۔ آپ انہیں جبراً تھوڑے ہی رکھ سکتے تھے۔

پدم سنگھ نے اپنی خطا تسلیم کر کے بازی پلٹ دی تھی۔ ہم آپ جھک
کر دوسرے کو جھکا سکتے ہیں۔ پرتن کو جھکا ناممکن ہے۔

بھٹل۔ شاید سدن کو کچھ معلوم ہو۔ ذرا انہیں بلائیے۔

پدم۔ وہ تو رات ہی سے غائب ہے۔ ندی کنارے ایک جھونپڑا
بنوا لیا ہے۔ اور ایک ناؤ چلاتا ہے۔ شاید رات وہیں رہ گیا ہے۔

بھٹل۔ کیا عجب ہے۔ دونوں بہنیں وہیں پہنچ گئی ہوں۔ کہئے
تو جا کر دیکھوں؟

پدم۔ اجی نہیں۔ آپ کس خیال میں ہیں۔ وہ اتنا روشن خیال نہیں
ہے۔ ان کے سایہ سے بھاگتا ہے۔

دفعۃً سدن کمرہ میں داخل ہوا۔ پدم سنگھ نے پوچھا: ”تم رات کہاں
رہ گئے؟ ساری رات تمہارے انتظار میں گزری؟“

سدن نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا: میں خود ہی شرمندہ ہوں۔
لیکن ایک ایسی ضرورت آپڑی۔ کہ مجھے مجبوراً رُکنا پڑا۔ اتنا موقع ہی نہ ملا۔

کہ اگر کہہ جاتا میں نے آپ سے شرم گئے مارے کبھی ذکر نہیں کیا۔ لیکن ادھر
کئی ماہ سے میں نے ایک ناؤ چلائی شروع کی ہے۔ وہیں ندی کنارے
ایک جھونپڑا بنوا لیا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اس کام کو حجم کر کے۔ آپ
سے اُس جھونپڑے میں رہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

پدم سنگھ۔ اس کا چرچا تو ایک بار لالہ بھگت رام نے مجھ سے
کیا تھا۔ لیکن بلال ہی ہے۔ کہ اب تک تم نے مطلق ذکر نہ کیا۔ ورنہ شاید
میں بھی تمہاری کچھ مدد کر سکتا۔ خیر۔ میں اُسے بڑا نہیں سمجھتا۔ بلکہ تمہیں
اس حالت میں دیکھ کر میں بہت خوش ہوں۔ لیکن میں اسے کبھی نہ مانوں گا۔
کہ تم اپنا گھر کہتے ہوئے اپنی ہانڈی الگ چڑھاؤ۔ کیا ایک کشتی اور رکھ لی جائے
تو کچھ زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے؟

سدن۔ جی ہاں۔ میں خود اسی فکر میں ہوں۔ لیکن اس کے لئے میرا
گھاٹ پر رہنا ضروری ہے۔

پدم سنگھ۔ بھئی یہ بڑی شرط ہے۔ شہر میں رہ کر تم مجھ سے الگ رہو۔ یہ
مجھے گوارا نہیں۔ اس میں چاہے تمہیں کچھ نقصان بھی ہو۔ لیکن میں نہ
مانوں گا۔

سدن۔ آپ میری یہ عرض قبول کیجئے۔ میں بہت مجبور ہو کر آپ
سے یہ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

پدم سنگھ۔ آخر وہ کیا بات ہے جو تمہیں اس قدر مجبور کر رہی ہے۔
تم مجھے غیر کیوں سمجھتے ہو؟ جو تردد ہو وہ صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟

سدن۔ میں اب اس گھر میں رہ کر آپ کو بدنام نہیں کرنا چاہتا۔
 میں نے اب اس فرض کو پورا کر لیا ہے۔ جسے کچھ دنوں تک اپنی
 حماقت اور کچھ دنوں تک اپنی کاہلی اور بزدلی سے ٹالتا آتا تھا۔ مجھ سے یہ
 نہیں ہو سکتا۔ کہ ایک خون ناحق میں والد صاحب کی اعانت کروں۔ اور
 نہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ آپ پر اپنے فعل کی ذمہ داری رکھ کر اُن میں اور آپ
 میں اتفاق پیدا کر دوں۔ میں آپ کا لڑکا ہوں۔ جب مجھے کوئی ضرورت
 ہوگی۔ آپ کو ستاؤں گا۔ کوئی تکلیف ہوگی۔ آپ کا دامن پکڑوں گا۔
 لیکن رہوں گا انگ۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ آپ میری تجویز کو پسند
 کریں گے۔

بٹھل داس تہ پر پہنچ گئے۔ پوچھا: کھل سمن اور شانتا سے تم ساری ملاقات
 تو نہیں ہوئی؟

سدن کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔ جیسے کسی نازنین کے چہرہ سے
 نقاب اُٹھ جائے۔ دبی زبان سے پوچھا: جی ہاں؟
 پدم سنگھ دریائے تفکر میں غوطے کھانے لگے۔ نہ ہاں کہہ سکتے تھے
 نہ نہیں کہتے بنتا تھا۔ اب تک وہ اس معاملہ میں اپنے تئیں بالکل پاک
 سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس ظلم کا سارا الزام اپنے بھائی کے سر ڈال دیا تھا۔
 اب سدن کو تو وہ کاٹھ کا پتلا سمجھتے تھے۔ لیکن اب اس نرغہ میں پڑ کر وہ
 ادھر ادھر بھاگ نکلنے کی راہ دیکھتے پھرتے تھے۔ دُنیا کا خوف تو انہیں
 نہیں تھا۔ خوف یہ تھا۔ کہ کہیں بھائی صاحب یہ نہ سمجھ لیں۔ کہ یہ سب

میرے ہی اشارہ سے ہوا ہے۔ اور میں نے ہی سدن کو گمراہ کیا ہے۔ یہ خیال ان کے دل میں جاگزیں ہو گیا۔ تو وہ ساری عمر مجھے معاف نہ کریں گے؟

پدم سنگھ کئی منٹ تک اسی الجھن میں پڑے رہے۔ آخر بولے :-
 "سدن یہ معاملہ ایسا نازک ہے۔ کہ میں اپنی ذمہ داری پر کچھ نہیں کر سکتا۔
 بھائی صاحب کی منشا جانے بغیر ہاں یا نہیں۔ کیونکہ کہوں۔ تم میرے
 اصولوں کو جانتے ہو۔ میں تمہاری اخلاقی جرأت کی تعریف کرتا ہوں
 کہ پر مانتا ہے تمہیں حق پر آمادہ کیا۔ لیکن میں بھائی صاحب کی مرضی کو
 کو مقدم سمجھتا ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ تم ان دونوں کے رہنے کا انتظام
 کر دو۔ بس یہیں تک۔ اس کے آگے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ بھائی صاحب
 کی جو مرضی ہو۔ وہ کرو؟

سدن نے کسی قدر بے صبری سے کہا : کیا آپ کو معلوم نہیں ہے۔
 کہ وہ کیا جواب دیں گے؟

پدم۔ ہاں معلوم کیوں نہیں؟
 سدن۔ تو اُن سے پوچھنا بے سود ہے۔ ماں باپ کے حکم سے
 میں اپنی جان دے سکتا ہوں۔ جو ان کی دی ہوئی ہے۔ لیکن کسی بے گناہ کی
 گردن پر تلوار نہیں چلا سکتا؟

پدم۔ تمہیں اس میں کیا عذر ہے۔ کہ دونوں بہنیں الگ مکان
 میں ٹھہرا دی جائیں؟

سداں نے تیز سو کر کہا یہ تو میں تب کروں جب مجھے چھپانا ہو۔ میں
کوئی گناہ کرنے نہیں جا رہا ہوں جو اُسے چھپاؤں۔ اپنی زندگی کا نہایت ہم
فرض ادا کرنے جا رہا ہوں۔ میں اس کام کو کار خیر سمجھ کر نہیں کرتا۔ بلکہ اپنا
روحانی اور انسانی فرض سمجھ کر۔ اب تک شادی کے جو مراسم ادا نہیں
ہوئے ہیں۔ وہ کل ندی کے کنارے ادا کئے جائیں گے۔ اگر آپ تشریف
لائیں گے۔ تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ ورنہ ایشور کے دربار میں
بغیر گواہوں کے بھی معاہدے ہو جاتے ہیں؟

یہ کہتا ہوا سداں اُٹھا۔ اور گھر میں چلا گیا۔ سمجھدار نے کہا واہ خوب
غائب ہوئے ہو۔ ساری رات جی لگا رہا۔ کہاں رہ گئے تھے؟
سداں نے رات کی ساری سرگزشت مفصل بیان کی مچھی سے بات
کرنے میں اُسے وہ جھجک نہ ہوئی۔ جو شرما جی کے روبرو ہوئی تھی۔ سمجھدار
نے اس کی ہمت کی تعریف کی۔ اور بولی یہ ماں باپ کے ڈر سے کوئی اپنی
بیابہتا کو تھوڑے ہی چھوڑ دیتا ہے۔ دنیا ہنسے گی۔ تو ہنس کرے۔ کیا اُس
کے خوف سے اپنے گھر کے آدمی کی جان لے لی جائے گی؟ تمہاری اماں سے
ڈرتی ہوں۔ نہیں تو اُسے اپنے گھر رکھتی؟

سداں۔ مجھے اماں یاد ادا کی پروا نہیں ہے؟
سمجھدار۔ بہت پروا تو کی۔ اتنے دنوں تک بچاری کو گھٹا گھٹا کر مار
ڈالا۔ کوئی دوسرا لڑکا ہوتا۔ تو پہلے ہی دن باں باپ کو پھٹکا مرنے دیتا۔ تمہیں
ہو۔ کہ اتنا برواشت کرتے ہو؟

سجھدرا! اگر یہی باتیں تم نے سہمہ ردی سے کی ہوتیں تو ہم تمہاری کتنی
عزت کرتے۔ مگر تم اس وقت حسد اور کینہ کے بس میں ہو۔ تم سدن کو ابھار
کر اپنی جھٹانی کو زک دینا چاہتی ہو۔ تم ایک ماں کے معصوم دل پر وار کر کے
اس کے تڑپنے کا لطف اٹھانا چاہتی ہو؟

سدن چلا گیا۔ تو بھٹل داس نے پدم سنگھ سے کہا: یہ تو آپ کے
دل کی بات ہوئی۔ اس میں آپ کو اتنا پس و پیش کیوں ہے؟

پدم سنگھ نے جواب نہیں دیا۔

بھٹل داس۔ یہ تحریک آپ کی طرف سے ہونی چاہئے تھی۔ لیکن
اب آپ کو اس کے قبول کرنے میں اس قدر تاثر ہے؟

پدم سنگھ نے اس کا بھی کچھ جواب نہ دیا۔

بھٹل داس۔ اگر وہ اپنی بیوی کے ساتھ الگ رہتا چاہتا ہے۔
تو اس میں کیا ہرج ہے؟ آپ نہ اپنے ساتھ رکھیں گے۔ نہ الگ رہنے
دیں گے۔ اس کے کیا معنی؟

پدم سنگھ نے طنز یہ لہجہ میں کہا: بھائی صاحب جب اپنے اپنے اوپر
پڑتی ہے۔ تب انسان جانتا ہے۔ جیسے مجھے آپ راہ دکھا رہے ہیں۔ اسی
طرح میں بھی دوسروں کو راہ دکھاتا رہا ہوں۔ آپ ہی ابھی طواغفوں کی
اصلاح پر دھواں دہا رہے ہیں۔ لیکن کام کرنے کا موقعہ آیا۔
تو صاف نکل گئے۔ اسی طرح دوسروں کو بھی سمجھئے۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔
پر اپنے بھائی کو ناراض نہیں کر سکتا۔ مجھے کوئی اصول اتنا عزیز نہیں ہے۔

جو میں ان کی مرضی پر قربان نہ کر سکوں؟

بھٹل واس۔ میں نے آپ سے یہ بھی دعویٰ نہیں کیا کہ خاندانی طوائفوں کو دیویاں بنا دوں گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان عورتوں میں جو گھر والوں کے ظلم یا بد معاشوں کے بہکانے سے خراب ہو جاتی ہیں۔ اور خاندانی طوائفوں میں کوئی فرق نہیں ہے؟ میرے خیال میں ان دونوں میں اتنا ہی فرق ہے۔ جتنا ممکن اور محال میں ہے؟

پدم سنگھ کم سے کم آپ کو میری مدد تو کرنی چاہئے تھی۔ آپ اگر ایک گھنٹہ کے لئے میرے ساتھ دال منڈی چلیں۔ تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ جسے آپ محال سمجھتے ہیں۔ وہ بالکل ممکن ہے۔ اچھے اور بُرے آدمی ہر جگہ ہوتے ہیں۔ طوائفیں بھی اس کلبہ سے خارج نہیں آپ کو یہ دیکھ کر تعجب ہو گا۔ کہ ان میں کتنی مذہبی ارادت۔ اس بلکروہ زندگی سے کتنی نفرت اور اپنے اصلاح کی کتنی تمنا ہے۔ مجھے خود اس پر تعجب ہوتا ہے۔ انہیں صرف ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ جسے پکڑ کر وہ غار سے باہر نکل آئیں۔ پہلے تو وہ میری صورت سے گریز کرتی تھیں۔ لیکن جب میں نے انہیں سمجھایا۔ کہ میں نے یہ تجویز خاص تمہاری بہبودی کے لئے کی ہے۔ تاکہ تم فاسقوں اور ہوس پروردوں کی دسترس سے باہر رہ سکو۔ تو انہیں مجھ پر کچھ کچھ اعتماد ہونے لگا۔ نام تو نہ بتاؤں گا لیکن مالدار طوائفیں مجھے مالی امداد دینے پر آمادہ ہیں۔ کبھی ایسی ہیں۔ جو اپنی لڑکیوں کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن ابھی ان عورتوں کی تعداد

بہت زیادہ ہے۔ جو نشہ میں ہیں۔ اور اس عیش کو چھوڑنا نہیں چاہتیں۔
 اور میری ہنسی اڑاتی ہیں کہتی ہیں۔ ابھی چین کرنے دیجئے۔ بڑھاپے میں
 توبہ کر لیں گے۔ لیکن مجھے اُمید ہے۔ کہ سوامی گجانبند کی تلقین کا کچھ نہ کچھ
 اثر ضرور ہوگا۔ افسوس یہی ہے۔ کہ میرا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں ہے۔
 ہاں مضحکہ اڑانے والے ڈھیروں ہیں۔ اس وقت ایک ایسے یتیم خانہ
 کی ضرورت ہے۔ جہاں طوائفوں کی لڑکیاں رکھی جاسکیں۔ اور ان کی تعلیم
 کا معقول انتظام ہو سکے۔ لیکن میری کون سنتا ہے؟

بھٹل داس بڑے غور سے یہ باتیں سنتے رہے۔ پدم سنگھ نے جو کچھ کہا
 تھا۔ وہ اُن کا ذاتی تجربہ تھا۔ اور ذاتی تجربات ہمیشہ یقین انگیز ہوتے ہیں۔
 بھٹل داس کو محسوس ہوا۔ کہ میں جس کام کو محال سمجھتا تھا۔ وہ فی الواقع
 محال نہیں ہے۔ بولے۔ ”انردھ سنگھ سے آپ نے اس کی بابت کچھ کہا
 یا نہیں؟“

پدم سنگھ۔ دہاں لچھے دار باتوں اور مزے دار چٹکیوں کے سوا اور
 کیا رکھا ہے؟

بھٹل داس پھر خیال میں غرق ہو گئے؟

— (۲۸) —

سدان کا عقد شانتا کے ساتھ ہو گیا۔ جھونپڑا خوب سجایا گیا تھا۔
 وہی منڈپ کا کام دے رہا تھا۔ لیکن زیادہ بھڑکھاڑ نہ تھی نہ بالو بھٹل داس

لال بھگت نام اور چند دیگر اصحاب شریک ہو گئے تھے:

پدم سنگھ اُسی دن مکان چلے گئے پنڈت مدن سنگھ سے ساری کیفیت بیان کی۔ وہ یہ سنتے ہی آگ ہو گئے۔ بولے میں اس چھوکرے کا سر کاٹ لوں گا۔ وہ اپنے کو سمجھتا کیا ہے؟ بھامانے کہا میں آج ہی جاتی ہوں۔ اُسے سمجھا کر لوالا ڈُل کی۔ ابھی نادان لڑکا ہے۔ اُس کٹنی سمن کی باتوں میں آگیا ہے۔ میرا کتنا ضرور مان جائے گا؟

لیکن مدن سنگھ نے بھاما کو ڈانٹا اور دھمکا کر کہا: اگر تم نے اُدھر جانے کا نام لیا۔ تو اپنا اور تمہارا گلا ایک ساتھ گھونٹ دوں گا۔ وہ آگ میں کودتا ہے۔ کودنے دو۔ ایسا دو دھپیتا بچہ نہیں ہے۔ یہ سب اُس کی ضد ہے۔ بچا تو بھیک منگو کر نہ چھوڑوں تو کہنا سوچتے ہوں گے۔ داد امر جائیں گے۔ تو چین سے زندگی کا لوں گا۔ منہ دھور رکھیں۔ یہ کوئی موردِ جانی نہیں ہے۔ یہ میری اپنی کمائی ہے۔ سب کی سب کرشن کے نام پر وقف کر دوں گا۔ ایک کانی کوئی کوڑی تو ملے گی نہیں؟

گاڈوں میں چاروں طرف سرگوشیاں ہونے لگیں۔ لالہ بیچنا تھے لکھن کا مل ہو گیا۔ کہ دنیا سے دھرم اُٹھ گیا۔ جب لوگوں کو ایسے ایسے نیچے کام کرنے کی جرات ہونے لگی۔ تو دھرم کہاں رہا نہ ہوئی نوابی۔ نہیں تو آج بچہ کی دھجیاں اُڑ جائیں۔ اب دیکھیں کون منہ لے کر گاڈوں میں آتے ہیں؟

پدم سنگھ رات کو بہت دیر تک بھائی کے ساتھ بیٹھ رہے۔ لیکن

جوں ہی سدن کا کچھ ذکر چھیڑتے۔ مدن سنگھ ان کی طرف ایسی غضب ناک
 نظروں سے دیکھتے کہ ان کو بولنے کی ہمت نہ پڑتی + آخر جب وہ سونے
 چلے تو پدم سنگھ نے مایوسانہ ہمت کے ساتھ کہا: ”بھیا سدن آپ سے
 الگ رہے تب بھی وہ آپ کا لڑکا ہی کہلائے گا۔ وہ جو کچھ نیک یاد کرے گا
 اس میں سارا خاندان شریک سمجھا جائے گا۔ جو لوگ اصلی حالات سے
 واقف ہیں۔ وہ چاہے ہم لوگوں کو معذور سمجھیں۔ لیکن عوام ہمارے اور
 سدن کے درمیان کوئی تفریق نہیں کر سکتے۔ تو اس سے کیا فائدہ کہ سانب
 بھی نہ مرے اور لاٹھی بھی لٹوٹ جائے۔ ایک طرف دو بُرائیاں ہیں بدنامی
 بھی ہوتی ہے۔ اور لڑکا بھی ہاتھ سے جاتا ہے۔ دوسری طرف ایک ہی
 بُرائی ہے۔ بدنامی ہوگی۔ لیکن لڑکا اپنے ہاتھ میں رہے گا۔ اس لئے مجھے تو
 یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم لوگ چل کر سون کو سمجھائیں۔ اور اگر وہ کسی
 طرح راضی نہ ہو۔ تو۔۔۔۔۔“

مدن سنگھ نے بات چھین کر کہا: ”تو اس چڑیل سے اس کا بیاہٹھا
 دیں۔ کیوں ہی نہ کہنا چاہتے ہو۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ ایک بار نہیں۔
 ہزار بار نہیں۔“

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔ اور ذرا دیر کے بعد پدم سنگھ کو نفریں کرتے
 ہوئے بولے: ”تعجب یہ ہے۔ کہ سب کچھ تمہارے سامنے ہوا۔ اور تمہیں
 ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ اس نے ناؤلی۔ جھوٹا بنایا۔ دونوں چڑیلوں سے
 ساتھ گانٹھ لی۔ اور تم آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے۔ میں نے تو اسے تمہارے

بھروسے پر وہاں بھیجا تھا۔ یہ کیا جانتا تھا کہ تم کان میں تیل ڈالے بیٹھے رہتے ہو۔ اگر تم نے ذرا بھی ہوشیاری سے کام لیا ہوتا۔ تو یہ نوبت نہ آتی، اب جب ساری گولیاں پٹ گئیں۔ سارا کھیل بگڑ گیا۔ تو چلے ہو وہاں سے مجھے صلح دینے میں صاف صاف کتا ہوں۔ کہ مجھے تمہاری طرف سے اگر علانیہ حمایت نہیں۔ تو چشم پوشی کا شک ضرور ہے۔ میں نے تم سے بہت بُرے سلوک کئے تھے۔ اس کا تم نے بدلہ لیا۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں کل صبح اٹھ کر یہ نامہ لکھ دو۔ تین پائی جو موروثی جائیداد ہے۔ اُسے چھوڑ کر میں باقی ساری جائیداد کرشن کے نام پر وقف کرتا ہوں۔ یہاں نہ لکھ سکو۔ تو وہاں سے لکھ کر بھیج دینا۔ میں اُسے دیکھ کر دستخط کر دوں گا۔ اور اس کی رجسٹری ہو جائے گی؟

یہ کہہ کر دن سنگھ سونے چلے گئے۔ لیکن پدم سنگھ کے قلب پر ایسا قاتل وار کر گئے۔ کہ وہ ساری رات تڑپتے رہے جس الزام سے بچنے کے لئے انہوں نے اپنے اصولوں کی بھی پروا نہ کی۔ اور اپنے طبقہ میں محبوب ہونا پسند کیا۔ وہ الزام سر پر آ ہی گیا۔ اتنا ہی نہیں۔ بھائی کے دل میں میل پڑ گیا۔ انہیں اب اپنی غلطی نظر آرہی تھی۔ بے شک اگر انہوں نے زیادہ معاملہ فہمی سے کام لیا ہوتا۔ تو یہ نوبت نہ آتی، لیکن یہ خیال کسی قدر تسکین کا باعث تھا۔ کہ جو کچھ ہوا سو ہوا۔ ایک بے گناہ کی زندگی تو ٹھکانے لگ گئی؟

صبح کو جب وہ گھر سے چلنے لگے۔ تو بھاروتی ہوئی آئی۔ اور بولی۔

بھیاں کی ضد تو دیکھ ہی رہے ہو۔ کہ لڑکے کی جان لینے پر آمادہ ہیں۔ لیکن تم ذرا سوچ سمجھ کر کام کرنا بھول چوک تو بڑے بڑوں سے ہو جاتی ہے۔ وہ بے چارہ تو ابھی نادان لڑکا ہے۔ تم اس کی طرف سے من موٹا نہ کرنا۔ اُسے کسی کی ٹیڑھی نگاہ کی برداشت نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں دیس بدیس کی راہ لے۔ تو میں کہیں کی نہ رہوں۔ اُس کی سدھ لیتے رہنا کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ یہاں رہتا تھا۔ تو ایک بھینس کا دودھ پی جاتا تھا۔ دال میں اُسے گھی اچھا نہ لگتا تھا۔ لیکن میں اُس سے چھپا کر لونڈے کے لونڈے ڈال دیتی تھی۔ اب اتنی سیوا جتن کون کرے گا۔ نہ جانے بیچارہ کیسا ہوگا۔ یہاں گھر پر کوئی کھانے والا نہیں۔ وہاں وہ انہیں چیزوں کے لئے ترستا ہوگا۔ کیوں بھیا کیا اپنے ہی ہاتھ سے ناؤ چلاتا ہے؟

پدم سنگھ۔ نہیں دو ملّا ح رکھ لئے ہیں،

نچاما۔ تب بھی دن بھر دوڑ دھوپ کرنی ہی پڑتی ہوگی۔ مجبور لوگ بنا دیکھ بھالے تھوڑے ہی کام کرتے ہیں۔ میرا تو یہاں کچھ بس نہیں ہے۔ اُسے تمہارے سپرد کرتی ہوں۔ اُسے انا تھ سمجھ کر کھوج خبر لیا کرنا۔ میرا روپاں روپاں تمہیں اشیر باد دے گا۔ اب کے کاٹکی اسنان میں میں اُسے ضرور دیکھنے آؤں گی۔ کہہ دینا تمہاری اماں تمہیں بہت یاد کرتی تھیں۔ بہت روتی تھیں۔ یہ سن کر اُسے ڈھارس ہو جائے گی۔ اس کا دل بڑا کچا ہے۔ مجھے یاد کر کے روز روتا ہوگا۔ یہ تھوڑے سے روپے ہیں۔ لیتے جاؤ۔ اس کے پاس بھیجا دینا،

پدم سنگھ۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو وہاں ہوں ہی میرے دیکھتے
 اُسے کسی بات کی تکلیف نہ ہونے پائے گی تم اطمینان رکھو۔
 بھابھا نہیں لیتے جاؤ کیا ہوا۔ اس ہانڈی میں کھی ہے۔ یہ بھی بھجوا
 دینا۔ بازاری کھی گھر کے کھی کو کہاں پہنچتا ہے۔ نہ یہ سگندہ نہ یہ سواد اُسے
 اماوٹ کی چٹنی بہت اچھی لگتی ہے۔ تھوڑی سی اماوٹ بھی رکھے دیتی ہوں۔
 میٹھے میٹھے آم چُن کر رس نکالا تھا۔ سمجھا کر کہہ دینا۔ بیٹا کوئی فکر مت کرو۔
 جب تک تمہاری ماں جیتی ہے تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے گی۔
 میری تو وہی ایک اندھے کی لکڑی ہے۔ اچھا ہے تو۔ اپنا ہی ہے دنیا
 کی لاج سے آنکھوں سے چاہے دور کر دوں۔ لیکن من سے تھوڑے ہی
 دور کر سکتی ہوں۔

باب (۲۵) باب

جیسے ناؤ تخیل سے شعر میں جان پڑتی ہے۔ اور خوش شمارنگ سے
 تصویروں میں اُسی طرح دونوں ہمنوں کے آنے سے جھونپڑے میں جان
 پڑ گئی ہے۔ اب وہ عاشق کا کلبہ احزاں نہیں جس کا مسکن اور ناز کی
 جلوہ گاہ ہے۔ اندھی آنکھوں میں شیلیاں پڑ گئی ہیں۔ ٹھونٹھ میں پھول
 کھل گئے ہیں۔

وہ مرجھائی ہوئی ٹکلی شانتا اب کھل کر ایک خوش نما جہاں نواز
 پھول ہو گئی ہے۔ سوکھی ہوئی ندی اُمنگوں پر ہے۔ جس طرح جیٹھ بیابان

کی دھوپ کی ماری ہوئی گائیں۔ سادوں میں نکھر جاتی ہیں۔ اور چراگاہوں میں کلیلیں کرنے لگتی ہیں۔ اسی طرح وہ بہہ کی ستائی ہوئی حسینہ اب نکھر گئی ہے۔ پریم میں مگن ہے۔

روز صبح کو جھونپڑے سے دو تارے نکلتے ہیں۔ اور جا کر گنگا میں ڈوب جاتے ہیں۔ اُن میں ایک بہت روشن اور تیز رو ہے۔ دوسرا مدھم اور متین۔ صبح کی زرخیز شعاعوں میں ان تاروں کی روشنی ماند نہیں ہوتی۔ وہ اور بھی جگمگا اٹھتے ہیں۔

شاننا گاتی ہے۔ سمن کھانا لپکاتی ہے۔ شاننا اپنا سنگار کرتی ہے۔ سمن کپڑے سیتی ہے۔ ایک حال میں خوش ہے۔ دوسری یاد ماضی سے بیزار۔ شاننا بھروسے آدمی کی طرح کھال پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ سمن کسی مریض کی طرح اپنی پچھلی بے اعتدالیوں پر ہاتھ مل رہی ہے۔

سدن کے طور و طریق میں بھی اب تغیر ہو گیا ہے۔ وہ اب دن چڑھے اٹھتا ہے۔ گھنٹوں نہاتا ہے۔ بال سنوارتا ہے۔ کپڑے بدلتا ہے۔ عطر ملتا ہے۔ نو بجے سے پہلے وہ اپنی نشستگاہ میں نہیں آتا۔ اور آتا بھی ہے۔ تو جم کر بیٹھتا نہیں۔ اس کا دل کہیں اور رہتا ہے۔ پل پل بھر میں اندر جاتا ہے۔ اور اگر کسی سے بات چیت کرنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ تو اُکتانے لگتا ہے۔ شاننا اس کے دل و دماغ میں پس گئی ہے۔

سمن گھر کا بھی سارا کام کاج کرتی ہے۔ اور باسرا بھی۔ وہ گھڑی رات رہے اٹھتی ہے۔ نہانے کے بعد سدن کا ناشتہ لپکاتی ہے۔ پھر ہندی کنا سے

جا کر ناؤ کھاواتی ہے۔ ملاخوں کی نگرانی کرتی ہے۔ اور لوبجے پھر کھانا پکانے بیٹھ جاتی ہے۔ گیارہ بجے یہاں سے فرصت پا کر وہ پھر کوئی نہ کوئی کام کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے، ۹ بجے رات کو جب سب لوگ سونے چلے جاتے ہیں۔ تو وہ پڑھتے بیٹھتی ہے۔ نلسی کی رامائن سے اُسے عشق ہے۔ کبھی بھگت مالا پڑھتی ہے۔ کبھی سوامی دیوی کاندہ کی تقریریں اور کبھی سوامی رام تیرتھ کے مضامین۔ وہ بالکل خواتین کے حالات بہت شوق سے پڑھتی ہے۔ میرا سے اسے بے حد عقیدت ہے۔ وہ زیادہ تر مذہبی کتابیں ہی پڑھتی ہے۔

ملاخوں کی عورتوں میں اس کی بڑی عزت ہے۔ وہ ان کے جھگڑے چکاتی ہے۔ کسی کے بچے کے لئے گرتے ٹوپی سیتی ہے۔ کسی کے لئے انجن یا گھٹی بنا دیتی ہے۔ اُن میں کوئی بیمار پڑتی ہے۔ تو اُس کے گھر جاتی ہے۔ اور دوا درپن کی فکر کرتی ہے۔ وہ اپنی گری ہوئی دیوار کو از سر نو اُٹھا رہی ہے۔ اس جوار میں سب مرد عورت اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اور اُس کا جس گاتے ہیں۔ ہاں اگر قدر نہیں ہے۔ تو اپنے گھر میں محبت ایک محویت ہے۔ ایک جنون۔ جو انسان کو خود غرض بنا دیتا ہے۔ سمن اس طرح جی توڑ کر سارے گھر کا بوجھ سنبھالے ہوئے ہے۔ لیکن سدن کے مُنہ سے کبھی شکریہ یا حوصلہ افزائی کا ایک کلمہ بھی نہیں نکلتا۔ شانتا بھی اس کی کاوش اور تندہی کی کچھ وقعت نہیں کرتی۔ دونوں اس کی طرف سے بے فکر ہیں۔ گویا وہ گھر کی لوٹڈی ہے۔ اور چکی میں جُتے رہنا ہی اس کا کام ہے۔ کبھی کبھی اس

کے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ کبھی دوڑ دھوپ سے بجا چڑھ آتا ہے۔
تب بھی وہ گھر کا کام حسب معمول کرتی رہتی ہے۔ لیکن ان دونوں کی نگاہیں
بصارت سے اس قدر عاری ہو گئی ہیں۔ کہ انہیں اس کی حالت کا احساس
ہی نہیں ہوتا۔ وہ کبھی کبھی تنہائی میں اپنی حالت پر گھنٹوں روتی ہے۔
لیکن کوئی ہمدردی کرنے والا۔ کوئی آنسو پونچھنے والا نہیں۔

سمن خلقتہ خود اپن مغرور عورت تھی۔ وہ جہاں کہیں رہتی تھی۔ رانی
بن کر رہتی تھی۔ اپنے شوہر کے گھر وہ سب تکلیفیں اٹھا کر بھی رانی تھی۔
بازار حسن میں وہ جب تک رہی اس کا سکہ چلتا رہا۔ آشرم میں وہ دوسروں
کی خدمت کر کے سب کی محذومہ بنی ہوئی تھی۔ وہ ممتاز بن کر رہنے کی
خواگر تھی۔ اس لئے یہاں اسے کس مہر سی کی حالت میں رہنا انتہا درجہ شاق
گزرنا تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ محنت کرتی۔ اور خوش رہتی۔ اگر سدن کبھی
کبھی اُس کی تعریف کیا کرتا اس سے مشورہ لیا کرتا۔ اپنے گھر کی مالکن سمجھتا۔ اگر
شانتا کبھی کبھی اس کے پاس بیٹھ کر اس کا دل خوش کرتی۔ اس کے سر میں
تیل ڈالتی۔ اُس کا جوڑہ باندھتی۔ لیکن وہاں تو دونوں محبت کے نشے میں
متوالے ہو رہے تھے۔ نشانہ لگاتے وقت نگاہ صرف ایک مرکز پر رہتی ہے۔

محبت میں انسان کا یہی حال ہوتا ہے۔

لیکن سدن اور شانتا کا یہ تغافل صرف محویت اور جنون کے باعث
سے تھا۔ اس میں شک ہے۔ سدن اُس سے اس طرح محترز رہتا تھا۔ جیسے
ہم جذام کے مریض سے دور رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہمدردی ہونے پر

بھی اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں رکھتے۔ شانتا سمن سے بدگمان
رہتی تھی۔ اس کے حُسن سے خائف تھی۔ یہی خیریت تھی۔ کہ سدن خود ہی
اُس سے دور دور رہتا تھا۔ ورنہ شانتا فکر کے مارے مر رہی جاتی، دیول
چاہتے تھے۔ کہ یہ روئے سیاہ اور یہ مارا ستین آنکھوں سے دور ہو جائے۔
لیکن تنگ ظرنی کے الزام کے خوف سے اُن کو باہم بھی اس مسئلہ پر زبان
کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

سمن کو رفتہ رفتہ یہ حقیقت صاف صاف نظر آتی جاتی تھی۔
ایک بار جیتن کمار شرما جی کے یہاں سے کچھ سوغات لے کر آیا۔ اس کے
قبل بھی وہ کئی بار آیا تھا۔ لیکن اسے دیکھتے ہی سمن چھپ جایا کرتی تھی۔ اب
کے جیتن کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ پھر کیا تھا۔ اس کے پیٹ میں چوہے دوڑنے
لگے۔ وہ پتھر کھا کر پچا سکتا تھا۔ لیکن کسی بات کے بچانے کی طاقت اس میں
نہ تھی۔ ملاخوں کے چودھری کے پاس حقہ تمباکو کے بہانے سے اور زہر
اُگل آیا۔ ارے! یہ تو کسی ہے۔ کھسم نے گھر سے نکال دیا۔ تو ہمارے یہاں
کھانا پکاتی رہی۔ وہاں سے نکالی گئی تو چوک میں جا بیٹھی۔ اب دیکھتا ہوں۔
تو یہاں براج رہی ہے؟ چودھری ستائے میں آگیا۔ عورتوں میں اشارہ بازیاں
ہونے لگیں۔ اُس دن سے کوئی ملاخ سدن کے گھر کا پانی نہ پیتا تھا۔ ان کی
عورتوں نے بھی سمن کے پاس آنا جانا ترک کر دیا۔

اسی طرح ایک بار لالہ بھگت رام اینٹوں کی لدوائی کا حساب کرنے
آئے۔ پیاس معلوم ہوئی۔ تو ملاخ سے پانی لانے کو کہا۔ ملاخ کنوئیں سے

پانی لایا۔ سدن کے گھر میں بیٹھے ہوئے باہر سے پانی منگوا کر پینا سدن کے سینہ میں چھری مارنے سے کم نہ تھا۔

بالآخر دوسرا سال جاتے جاتے یہاں تک لوہہ بہت پہنچی۔ کہ سدن ذرا ذکاوت سی بات پر سمن سے جھنجھلا جاتا۔ اور چاہے کوئی لاگو بات نہ کہے لیکن لہجہ کلام کافی طور پر دشمن ہو جاتا تھا۔

سمن کو معلوم ہو گیا۔ کہ اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہو گا۔ اُس نے سمجھا تھا۔ کہ یہیں بہن بہنوئی کے ساتھ عمر تمام ہو جائے گی۔ گھر کا کام کاج کرونگی۔ ایک ٹکڑا کھاؤں گی۔ اور ایک گوشہ میں پڑی رہوں گی۔ لیکن افسوس! یہ تختہ بھی اس کے پیروں کے نیچے سے سرک گیا۔ اور اب وہ بے رحم لہروں کے پیروں کے تلے تھی۔

لیکن سمن کو اپنی حالت پر افسوس کتنا ہی ہوا ہو۔ اُسے شائستگی سے گلہ نہ تھا۔ کچھ تو دینیات کے مطالعہ اور کچھ اپنی حالت کے صحیح علم نے اُسے غایت درجہ حلیم اور منکسر بنا دیا تھا۔ وہ بہت سوچتی کہاں جاؤں۔ جہاں سب بیگانے ہوں۔ کوئی اپنا شناسا نہ ہو۔ لیکن اسے ایسا کوئی مامن نہ نظر آتا تھا۔ اس کا قلب ضعیف ابھی تک ایک سہارے کا محتاج تھا۔ بلا کسی کے سہارے کے بسر اوقات کرنے کا خیال کر کے اس کا کلیجہ تھڑکتھڑکا پینے لگتا تھا۔ وہ تنہا پیکس۔ طوفان دنیا کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کر سکتی۔ کون میری حفاظت کرے گا؟ کون مجھے سنبھالے گا؟ یہ خوف اُسے دہاں سے پاؤں نہ نکالنے دیتا تھا۔

ایک دن سدن دس بجے کہیں سے گھوم کر آیا۔ اور بولا: کھانا تیار ہونے میں کتنی دیر ہے۔ جلدی کرو۔ مجھے پنڈت اماناٹھ سے ملنے جانا ہے چچا صاحب کے یہاں آئے ہوئے ہیں؟

شانٹا نے پوچھا: یہاں کیسے آئے؟

سدن۔ اب یہ مجھے کیا معلوم۔ ابھی جیتن آکر کہہ گیا ہے کہ وہ آئے ہوئے ہیں۔ اور آج ہی چلے جائیں گے۔ یہاں آنا چاہتے تھے لیکن (سمن کی طرف اشارہ کر کے) کسی وجہ سے نہیں آئے۔

شانٹا نے سمن کی طرف آنکھیں مٹکا کر کہا: تو ذرا بیٹھ جاؤ ابھی یہاں گھنٹوں کی دیر ہے؟

سمن نے جھنجھلا کر کہا: دیر کیا ہے۔ سب کچھ تو تیار ہے۔ آسن بچھا دو۔ پانی رکھ دو۔ میں تھالی پرستی ہوں؟

شانٹا۔ ارے تو ذرا ٹھہر ہی جائیں گے۔ تو کیا ہوگا۔ کوئی ڈاک چھوٹی جاتی ہے۔ کچا پکا کھانے سے کیا فائدہ؟

سدن۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ دن بھر کیا ہوتا رہتا ہے۔ ذرا سا کھانا پکے میں اتنی دیر ہو جاتی ہے؟

سدن جب کھانا کھا کر چلا گیا۔ تو سمن نے شانٹا سے پوچھا: کیوں شانٹی سچ بتا تجھے میرا یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا؟ تیرے دل میں جو کچھ ہے۔ وہ میں جانتی ہوں۔ لیکن جب تک تو اپنی زبان سے دُکھ نہ دیگی۔ میں جانے کا نام نہ لوں گی۔ میرے لئے کہیں ٹھکانہ نہیں ہے؟

شانتا۔ بن کیسی باتیں کرتی ہو، تمہارے رہنے سے گھر سنبھلا ہوا ہے۔
 نہیں تو میرے کئے کیا ہوتا؟

سمن۔ یہ منہ دیکھی باتیں مت کرو میں ایسی نادان نہیں ہوں میں
 تم دونوں کو اپنی طرف سے کچھ کھنچا ہوا پاتی ہوں؟
 شانتا۔ تمہاری آنکھوں کی کیا بات ہے۔ وہ تو دل تک کی باتیں
 دیکھ لیتی ہیں؟

سمن۔ نظریں ملا کر بولو۔ کیا جو کچھ میں کہتی ہوں۔ جھوٹ ہے؟
 شانتا۔ جب تمہیں معلوم ہی ہے۔ تو پوچھتی کیوں ہو؟
 سمن۔ اسی لئے کہ سب کچھ دیکھ کر بھی آنکھوں پر اعتبار نہیں
 ہوتا۔ سنار مجھے چاہے کتنا ہی حقیر سمجھے۔ مجھے اُس سے کوئی شکایت نہیں
 ہے۔ وہ میرے دل کے حالات سے واقف نہیں ہے۔ لیکن تم سب کچھ
 دیکھ کر بھی مجھے حقیر سمجھتی ہو۔ اس کا تعجب ہے۔ میں تمہارے ساتھ
 قریب دو سال سے ہوں۔ اتنے دنوں میں میرے مزاج سے اچھی طرح
 واقف ہو گئی ہو گی۔ کم سے کم ہونا چاہئے تھا؟

شانتا۔ نہیں بن پر ماتا سے کہتی ہوں۔ یہ بات نہیں ہے ہمارے
 اوپر اتنا بڑا الزام مت لگاؤ۔ تم نے میرے ساتھ جو سلوک کئے ہیں۔ وہ
 میں کبھی نہ بھولوں گی۔ لیکن بات یہ ہے کہ ان کی بدنامی ہو رہی ہے۔
 لوگ من مانی باتیں اڑایا کرتے ہیں۔ وہ رسدں کہتے تھے۔ کہ سچدرا یہاں
 آنے کو تیار تھیں۔ لیکن تمہارے یہاں رہنے کا حال سنا تو نہیں آئیں۔

تھا۔ ہم میں کتنے ہی ایسے اصحاب ہیں جن کے دماغ میں کوئی قومی وحدت انجام دینے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اکثر اس خیال کی محرک ہماری حرص نمود ہوتی ہے۔ ہم وہ کام کرنا چاہتے ہیں جس سے ہمارا نام بچہ کی زبان پر ہو۔ کوئی ایسی تصنیف یا مضمون لکھنا چاہتے ہیں جس کی لوگ قدر کریں۔ اور اکثر ہماری کوششوں کا کچھ نہ کچھ صلہ بھی مل جاتا ہے۔ لیکن ہم جمہور کے ولولوں میں ٹھہر نہیں کر سکتے۔ کوئی شخص چاہے وہ کیسی ہی مصیبت میں مبتلا ہو۔ اس آدمی سے اپنا درد دل کہنا نہیں چاہتا۔ جسے وہ اپنا سچا بہادر نہ سمجھتا ہو۔

پدم سنگھ کو اب دالمنڈی میں جانے کے بہت موقعے ملتے تھے۔ اور وہ ارباب نشاط کے طرز زندگی کا جتنا بھی مطالعہ کرتے اتنا ہی انہیں صدمہ ہوتا تھا۔ ایسی نازک اندام پر جہاں حسدینوں کو محض حفظ نفس کے لئے اپنا سب کچھ گنوائے دیکھ کر اُن کا دل درد سے بیتاب ہو جاتا تھا۔ آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ انہیں اب محسوس ہو رہا تھا کہ یہ عورتیں اوصاف باطن سے خالی نہیں۔ جذبات حسنہ سے عاری نہیں۔ نیک و بد کے امتیاز سے بے بہرہ نہیں ہیں۔ لیکن نفس کی مطیع ہو کر اُن کی ساری اخلاقی قوتیں مردہ ہو گئی ہیں۔ ہوس نے ان کی قوا باطن کو مفلوج اور بے حس کر دیا ہے۔ پدم سنگھ اس دام ہوس کو توڑنا چاہتے تھے۔ ان کم گشتہ حوروں کو راستہ پر لانا چاہتے تھے۔ اس بے خبری کو دور کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جہاں اتنا مضبوط تھا۔ اور نیند اتنی گہری۔ کہ پہلے چھ حسدینوں

میں انہیں اس سے زیادہ کامیابی نہ ہو سکی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔
شراب کے نشہ میں انسان کی جو کیفیت ہو جاتی ہے۔ وہی حالت ان
عورتوں کی ہو گئی تھی؛

اُدھر پر بھا کر راؤ اور ان کے رفیقوں نے اخراج کی تجویز کے منسوخ
شدہ حصّوں کو پھر بورڈ میں پیش کیا۔ انہوں نے محض پدم سنگھ سے
بدگمان ہو جانے کے باعث ان دونوں حصّوں کی مخالفت کی تھی۔ پر
اب ان کا جوش اصلاح دیکھ کر وہ انہیں کے بنائے ہوئے اسلحہ سے
ان پر وار کر بیٹھے۔ پدم سنگھ اس دن بورڈ میں نہیں گئے۔ ڈاکٹر
شیاماچرن نیننی تال گئے ہوئے تھے۔ وہ دونوں حصّے بالاتفاق ہو گئے؛
بورڈ کی طرف سے علی پور کے قریب طوائفوں کے لئے مکانات بنوائے
جا رہے تھے۔ لالہ بھگت رام بڑی مستعدی سے کام کر رہے تھے کچھ کچھ
مکانات تھے کچھ پکے۔ کچھ دوسرے مندرے۔ ایک مختصر سا بازار ایک چھوٹا
ساشا خانہ۔ اور ایک مدرسہ بھی زیر تعمیر تھا۔ حاجی ہاشم نے ایک مسجد کی تعمیر
شروع کر دی تھی۔ اور سیٹھ چین لال کی طرف سے ایک مندر بن رہا تھا۔ دینا
ناکھ پٹواری نے ایک باغ کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ اُمید تو تھی کہ وقت
معین پر کام مکمل ہو جائے گا۔ لیکن بہت عجلت کرنے پر بھی تعمیر میں پورا
ایک سال لگ گیا۔ بس اسی کی دیر تھی۔ دوسرے ہی دن طوائفوں کو دال
منڈی چھوڑ کر ان نئے مکانات میں آباد ہو جانے کا نوٹس دے دیا گیا؛
لوگوں کو اندیشہ تھا کہ طوائفوں کی جانب سے سخت مخالفت

ہوگی۔ لیکن انہیں یہ دیکھ کر پرستعجاب مسرت ہوئی۔ کہ طوائفوں نے خوشی
 سے اس حکم کی تعمیل کی۔ ساری دال منڈی ایک ہی دن میں خالی ہو گئی۔
 جہاں شب و روز کی بہار رہتی تھی۔ وہاں شام ہوتے ہوتے سناٹا چھا گیا۔
 محبوب جان ایک مسمول بوڑھی طوائف تھی۔ اُس نے اپنی ساری
 ملکیت یتیم خانہ کے لئے وقف کر دی تھی۔ شام کو سب طوائفیں اس کے
 مکان پر جمع ہوئیں۔ وہاں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ شہزادی نے
 دوران تقریریں کیا: "بہنو آج ہماری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا
 ہے۔ خداوند تعالیٰ ہمارے ارادوں میں برکت دے۔ اور ہمیں نیک
 راستہ پر لائے۔ ہم نے بہت دنوں تک بے شرعی اور ذلت کی زندگی بسر کی۔
 بہت دنوں تک شیطان کی قید میں رہے۔ بہت دنوں تک اپنی روح
 اور ایمان کا خون کیا۔ اور بہت دنوں تک مستی اور عیش پرستی میں غافل
 رہے۔ اس دال منڈی کی زمین ہمارے گناہوں سے سیاہ ہو رہی ہے۔
 آج خداوند کریم نے ہماری حالت پر رحم کر کے ہمیں قید معصیت سے
 نجات دی ہے۔ اس لئے ہمیں اس کا شکر کرنا چاہیے۔ اس میں شک
 نہیں۔ کہ ہماری اکثر بہنوں کو یہاں سے جلا وطن ہونے کا قلق ہوتا ہوگا۔
 اور اس میں بھی شک نہیں۔ کہ انہیں آنے والے دن تک تاریک
 نظر آتے ہوں گے۔ ان بہنوں سے میری یہی التجا ہے۔ کہ خدا نے
 رزق کا دروازہ کسی پر بند نہیں کیا ہے۔ آپ کے پاس وہ ہنر ہے جس
 کے قدر دان ہمیشہ رہیں گے۔ لیکن خدا نخواستہ ہم کو آئندہ تکلیفیں بھی

ہوں۔ تو جائے ملال نہیں ہمیں جتنی بھی مصیبتیں جھیلنی پڑیں گی۔
 اتنا ہی ہمارے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہوگا، میں پھر خدا سے دعا کرتی ہوں
 کہ وہ ہمارے دلوں کو اپنی روشنی سے منور کرے۔ اور ہمیں راہ نیک پر چلنے
 کی توفیق دے۔

رام بھولی مائی بولیں: ہمیں پنڈت پدم سنگھ شرما کا دل سے ممنون
 ہونا چاہئے۔ پر مانتا انہیں سدا سکھی رکھے۔

زہرا جان نے فرمایا: میں اپنی بہنوں سے یہی عرض کرنا چاہتی ہوں۔
 کہ وہ آئندہ سے حلال اور حرام کا خیال رکھیں۔ گانا بجانا ہمارے لئے
 حلال ہے۔ اسی بہن میں کمال حاصل کرو۔ بدکار رئیسوں کی شہوت کا کھلونا
 بننا چھوڑ دو۔ بہت دنوں تک گناہوں کی غلامی کی۔ اب ہمیں اپنے تئیں
 آزاد کرنا چاہئے۔ ہمیں کیا خدا نے اسی لئے پیدا کیا ہے۔ کہ اپنا حسن۔
 اپنی جوانی۔ اپنی روح۔ اپنا ایمان۔ اپنی عزت۔ اپنی حیا۔ حرام کار شہوت
 پرست آدمیوں کی نذر کریں۔ جب کوئی منچلا لڑکا جو ان رئیس ہمارے اوپر
 دیوانہ ہو جاتا ہے۔ تو ہمیں کتنی خوشی ہوتی ہے۔ ہماری ناٹک بھولی نہیں
 سماتی۔ سفر وائی بغلیں بجانے لگتے ہیں۔ اور ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا
 ہے۔ گویا سونے کی چڑیا بچنس گئی۔ لیکن یہ تو یہ ہماری حماقت ہے۔
 ہم نے اسے ایسے دھم میں نہیں بھنسا یا۔ بلکہ خود اس کے دام میں بچنس
 گئے۔ اس لئے ہم دوزخ میں جہنم لیا۔ ہم اپنی عصمت جیسی بے بہا
 جنس کو کھو بیٹھے۔ آئندہ سے ہمارا یہ طریقہ ہونا چاہئے۔ کہ اگر اپنے میں

کسی کو کج روی پر پائل دیکھیں تو اسے برادری سے خارج کر دیں؟
 سدر بائی نے دُرُفشتالی کی: نہرہ بہن نے یہ بہت اچھی تجویز کی ہے
 میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ اگر ہمارے یہاں کسی کی آمدورفت ہونے لگے۔
 تو ہمیں سوچنا چاہئے۔ کہ یہ کیسا آدمی ہے۔ اگر ہمیں اس سے محبت
 ہو۔ اور اُسے بھی ہم سے اُنس ہو۔ تو شادی کر لینی چاہئے۔ لیکن اگر وہ
 محض شہوت پرستی کے ارادہ سے آتا ہو۔ تو اُسے فوراً دُتکار دینا
 چاہئے۔ ہمیں اپنی عزت کو ریلوں پر نہ بچنی چاہئے؟

رام پیاری نے کہا: سواچی گجاند نے ہمیں ایک کتاب دی ہے۔
 جس میں لکھا ہے۔ کہ خوبصورتی ہمارے پہلے جنم کے نیک کاموں کا نتیجہ
 ہوتی ہے۔ لیکن ہم اپنی پہلی کمائی کو بھی اس جنم میں اڑا دیتے ہیں جو ہمیں
 نہرہ جان کی تجویز کو پسند کرتی ہوں۔ وہ ہاتھ اٹھا دیں؟

اس پر بیس بچیس عورتوں نے ہاتھ اٹھائے؟
 رام پیاری نے پھر کہا: جو ہمیں اس تجویز کو پسند نہ کرتی ہوں۔ وہ
 بھی اپنے ہاتھ اٹھا دیں؟

اس پر ایک ہاتھ بھی نہ اٹھا؟
 ضعیفہ محبوب جان نے فرمایا: مجھے کچھ کہتے ہوئے خوف ہوتا۔
 ہے۔ کہ تم لوگ کموگی۔ سوچو ہے کھا کے بلی جج کو چلی۔ پر آج کے ساتویں
 دن میں سچ جج کر نے چلی جاؤں گی۔ میری زندگی تو جیسے کٹی ویسے
 کٹی۔ پر اس وقت آپ کی یہ نیت دیکھ کر مجھے جتنی خوشی ہوتی ہے۔ وہ

میں ظاہر نہیں کر سکتی۔ خدا تمہارے پاک ارادوں کو پورا کرے؟
 چند مستورات آپس میں سرگوشتیاں کدہی تھیں۔ ان کے چہرہ
 سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ یہ باتیں انہیں ناگوار گزر رہی ہیں۔ لیکن انہیں زبان
 کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ سفلی خیالات پاک جذبات کے سامنے
 دب جاتے ہیں؟

مجلس ختم ہوئی۔ سارا مجمع برہنہ پا علی پور کی طرف چلا جیسے زائرین
 متبرک مقامات کی طرف چلتے ہیں؟

دالمنڈی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ نہ طبلوں کی گمک تھی۔ نہ
 سارنگیوں کی الاپ نہ نغمہ دلنواز۔ نہ رنگیں مزاجوں کے جھگڑے۔ اناج
 کے کٹ جانے پر کھیت کی جو حالت ہو جاتی ہے۔ وہی حالت بازار حسن
 کی ہو رہی تھی؟

— باب — (۳۰) — باب —

پنڈت مدن سنگھ کی کئی ماہ تک یہ کیفیت تھی۔ کہ جو کوئی ان کے
 پاس آتا۔ اُسی سے سدن کی بُرائی کرتے۔ ناخلف ہے۔ آوارہ ہے۔
 شہدا ہے۔ لُچا ہے۔ ایک کانی کوڑی تو دوں گا نہیں۔ بھیک مانگتے
 پھریں گے۔ تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ پدم سنگھ کو بہت نامہ لکھنے
 کے لئے کئی بار یاد دلایا۔ بھانا کبھی سدن کا چہ چاکتی تو اس سے بگڑ جاتے
 گھر سے نکل جانے کی دھکی دیتے۔ جوگی ہو جاؤں گا۔ سنیا سی ہو جاؤں گا۔ مگر
 اس چھوکرے کا منہ نہ دیکھوں گا؟

اس کے بعد ان کے مزاج میں ایک انقلاب ہوا۔ انہوں نے سدن کا ذکر کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اگر کوئی اس کی برائی کرتا۔ تو کچھ اُن سے سہہ ہو جاتے کہتے بھائی اب کیوں اُسے کو ستے ہو؟ جیسا اُس نے کیا ہے۔ اُس کی سزا آپ بھگتے گا۔ اچھا ہے یا بُرا ہے میرے پاس سے تو دور ہے۔ اپنے چار پیسے کماتا ہے۔ کھاتا ہے۔ پڑا ہے۔ پڑا رہنے دو۔ لالہ بیچنا تھا ان کے بہت منہ لگے تھے۔ ایک دن وہ خبر لائے۔ کہ اُنانا تھ نے سدن کو کئی ہزار روپے دئے ہیں۔ اب ندی پار ایک مکان بن رہا ہے۔

ایک باغیچہ لگ رہا ہے۔ چونا پیسنے کی ایک کل لے لی ہے۔ خوب روپے کماتا ہے۔ اور اُڑاتا ہے۔ سدن سنگھ نے جھنجھلا کر کہہ دیا۔ تو کیا چاہتے ہو۔ کہ وہ بھیک مانگے؟ دوسروں کی روٹیاں توڑے۔ اُنانا تھ بیچارے اُسے کیا روپے دیں گے۔ خود ٹٹے ٹٹے کو محتاج ہو رہے ہیں۔ سدن نے جو کچھ کیا ہوگا۔ اپنی قوت بازو سے کیا ہوگا۔ وہ لاکھ براہیہ لیکن اپنا سچ نہیں ہے۔ نکما نہیں ہے۔ ابھی جوان ہے۔ شوقین ہے۔ اگر کماتا ہے۔ اور اُڑاتا ہے۔ تو کسی کو کیوں بُرائے۔ تمہارے اس گاؤں میں کتنے ہی لونڈے ایسے ہیں۔ جو ایک پنیسہ نہیں کما لے۔ لیکن گھر سے روپے اُڑالے جاتے ہیں۔ اور گل چھڑے اُڑاتے ہیں۔ سدن اُن سے تو اچھا ہی ہے۔ منشی بیچنا تھ بہت خفیف ہوئے۔

مسئلہ حرکت کے مطابق کچھ عرصہ کے بعد سدن سنگھ کے دل پر ایک عمل معکوس نے غلبہ کیا۔ دل ایک انتہا سے دوسری انتہا پر جا پہنچا۔ اب

سدا کی صورت مردم آنکھوں میں پھرا کرتی۔ اُسی کی باتیں یاد آیا کرتیں
 سب سے اسی کا ذکر کیا کرتے۔ دیکھو تو کیسا ظالم ہے۔ بے ایمان مجھ
 سے روٹھنے چلا ہے۔ گویا میں گھر زین۔ مال اور اسباب سب اپنے
 سر پر لا کر لے جاؤں گا۔ ایک بار یہاں آئے تھے بنتا۔ پیروں میں
 تھندی رچا کے بیٹھا ہے۔ میچیا کہیں کا۔ بیرحم مجھ سے دماغ کرتا ہے۔
 کڑھ کڑھ کر جاؤں گا۔ تو بیٹھا میرے نام کو روئے گا۔ تب بھلے دہاں
 سے دوڑا آئے گا۔ ابھی نہیں آئے بنتا۔ اچھا دیکھیں تم مجھ سے
 بھاگ کر کہاں جاتے ہو۔ وہیں چل کر تمہاری خبر لیتا ہوں۔

کھائی کر اطمینان سے لیٹتے۔ تو بھاما سے سدا کی باتیں کرنے لگتے۔
 "یہ لونڈا کپن میں بھی ضدی تھا۔ جس چیز کے لئے اڑ جاتا تھا۔ اُسے
 لے ہی کر چھوڑتا تھا۔ تمہیں یاد ہو گا۔ ایک بار میری پوجا کی جھولی کے
 لئے کتنا منہا منہ چھایا۔ اور اُسے لے ہی کر چپ ہوا۔ بڑا ہٹیلہ ہے۔
 دیکھو۔ اس کی سخت دلی۔ ایک خط بھی نہیں ڈالتا۔ چپ چاپ کان میں
 تیل ڈالے بیٹھا ہے۔ گویا ہم لوگ مر گئے، بھاما یہ باتیں سنتی اور روتی۔
 سدا سنگھ کے غرور خاندان نے محبت پداری کے آگے سر جھکا دیا
 تھا۔

اس طرح ایک سال سے زیادہ گزر گیا۔ سدا سنگھ بار بار سدا کے
 پاس جانے کا ارادہ کرتے۔ مگر اس ارادہ پر عمل نہ کر سکتے۔ ایک بار اسباب
 بندھوا چکے تھے۔ پر تھوڑی دیر کے بعد اُسے کھلوا دیا۔ ایک بار اسٹیشن

سے لوٹ آئے۔ ان کا دل غرور اور محبت کا کھلونا بنا ہوا تھا۔

اب گڑہستی کے کاموں میں ان کی طبیعت نہ لگتی کھیتوں میں وقت پر پانی نہیں دیا گیا۔ فصل خراب ہو گئی۔ اسامیوں سے لگان کے روپے نہیں وصول کئے گئے۔ وہ بیچارے روپے لے کر آتے۔ لیکن مدن سنگھ کو روپے لے کر رسید دینی مشکل تھی۔ گڑ گڑ میں دھڑ دھڑ پکھل گیا۔ اسے بچنے کی فکر نہ کی۔ بھانا کچھ کہتی تو جھنجھلا پڑتے۔ چوٹھے میں جائے یہ گھر بار جس کے لئے سب کچھ کرتا تھا۔ جب وہی نہیں ہے۔ تو گڑہستی میرے کس کام کی ہے۔ اب انہیں محسوس ہوا۔ کہ میری ساری تمنائیں۔ ساری مال اندیشیاں۔ ساری مذہب پرستی۔ سارا شوق زیست صرف ایک بنیاد پر قائم تھا۔ اور وہ بنیاد سدن تھا۔ ادھر کئی مہینوں سے پدم سنگھ بھی مکان پر نہیں آئے تھے۔ ایک مہم عظیم کے بعد دل پر کسل کا جو غلبہ ہو جاتا ہے۔ وہی کیفیت اس وقت پدم سنگھ پر طاری تھی۔ مدن سنگھ ان کے پاس بھی خطوط نہ بھیجتے تھے۔ ہاں ان کے خطوط آتے۔ تو بڑے شوق سے پڑھتے۔ لیکن سدن کا کوئی ذکر نہ پا کر دل شکستہ ہو جاتے تھے۔

ایک دن مدن سنگھ دروازے پر بیٹھے ہوئے پریم ساگر پڑھ رہے تھے۔ کرشن کی داستان طفلی میں انہیں بچوں کا سا لطف آتا تھا۔ شام ہو گئی تھی۔ حروف نظر نہ آتے تھے۔ لیکن ان کی طبیعت ایسی لگی ہوئی تھی۔ کہ اٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دفعۃً کیتوں کے بھونکنے نے کسی نو آئند

کی خبر دی، مدن سنگھ کی چھاتی دھڑکنے لگی۔ کہیں مدن تو نہیں آ رہا ہے!
کتاب بند کر کے اٹھے۔ تو پدم سنگھ کو آتے دیکھا ”پوچھا رب خیریت
ہے؟“

پدم۔ جی ہاں۔ سب ایشور کی دیا ہے؟
مدن۔ بھلا اُس بے ایمان کی بھی کچھ کھوج خبر ملی ہے؟
پدم۔ جی ہاں۔ اچھی طرح ہیں۔ دسویں پانچویں میرے یہاں آیا
کرتے ہیں میں بھی کبھی خیریت دریافت کر لیتا ہوں۔ کوئی تردد کی بات
نہیں ہے؟

مدن۔ بھلا ظالم کبھی ہم لوگوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یا بالکل مرا سمجھ
لیا۔ کیا یہاں آنے کی قسم کھالی ہے ہم لوگ مرجائیں گے۔ تب آئے گا کیا؟
اگر اس کی یہی منشا ہو۔ تو ہم لوگ کہیں کی راہ لیں۔ اپنا گھر بار لے۔
اپنا انتظام کرے۔ سنتا ہوں وہاں مکان بنوا رہا ہے۔ وہ تو اس مکان
میں رہے گا۔ اور یہاں کون رہے گا؟ یہ کس کے لئے چھوڑے دیتا
ہے؟

پدم۔ جی نہیں۔ مکان وکان تو کہیں نہیں بنواتے۔ یہ آپ سے
کسی نے چھوٹ ہی اڑا دیا۔ ہاں ایک چونے کی کل کھڑی کر لی ہے۔ اور
یہ بھی معلوم ہوا ہے۔ کہ ندی پار قھوڑی سی زمین بھی لینا چاہتے ہیں؟
مدن۔ تو اُس سے کہہ دینا۔ پہلے یہاں آکر گھر میں آگ لگا جائے۔
تب وہاں جگہ زمین جو چاہے خریدے؟

پدم۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ وہ محض آپ لوگوں کی ناخوشی کے خوف سے یہاں نہیں آتا۔ آج اُسے معلوم ہو جائے۔ کہ آپ نے اس کی خطا معاف کر دی۔ تو سر کے بل دوڑ آئے۔ میرے پاس آتا ہے۔ تو گھنٹوں آپ ہی کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ آپ کی مرضی ہو۔ تو وہ کل یہاں حاضر ہو جائے۔

مدن۔ نہیں میں اُسے بلاتا نہیں۔ ہم اس کے کون ہوتے ہیں۔ کہ وہ یہاں آئے گا۔ لیکن یہاں آئے۔ تو کس دینا ذرا اپنی پیٹھ مضبوط کر رکھے اُسے دیکھتے ہی میرے سر پر شیطان سوار ہو جائے گا۔ اور میں ڈنڈا لے کر پل پڑوں گا۔ احمق مجھ سے روٹھنے چلا ہے۔ تب نہیں روٹھا تھا۔ جب میرے پوجا کے وقت پوتھی پر رال ٹپکاتا تھا۔ کھانے کی تھالی کے پاس پیشاب کرتا تھا۔ اس کے مارے میرے کپڑے صاف نہ رہتے پالتے تھے۔ اُجلے کپڑوں کو ترس کے رہ جاتا تھا۔ مجھے صاف کپڑے پہنے دیکھتا تو بدن میں دھول مٹی لپیٹے ہوئے آکر سر پر سوار ہو جاتا۔ تب کیوں نہیں روٹھا تھا۔ آج روٹھنے چلا ہے۔ اب کے ایسی گوشمالی کروں۔ کہ چھٹی کا دو دھبیاد آجائے۔

دونوں بھائی گھر میں گئے۔ بھاما بیٹھی ہوئی گائے کو بھوسہ کھلا رہی تھی۔ پدم سنگھ کو دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔ اور بولی: "بھلا تمہارے درشن تو ہوئے۔ چار قدم پر رہتے ہو۔ لیکن اتنا بھی نہیں ہوتا۔ کہ زمین میں ایک بار تو جا کر دیکھ آئیں۔ کہ گھر والے مرے یا جیتے ہیں۔ کو

کشل سے تو ہو؟

پدم سنکھ۔ ہاں سب آپ کی دعا ہے۔ کہو کھانا کیا پک رہا ہے۔
مجھے اس وقت کھیر۔ حلوا اور ملائی کھلاؤ۔ تو وہ مژدہ سناؤں۔ کہ پھر ک
جاؤ۔ پوتا مبارک ہو؟

بھاما کے افسردہ چہرہ پر مسرت کی سُرخ چھا گئی۔ اور آنکھوں کی
پتلیاں پھول کی طرح کھل گئیں۔ بولی: چلو گھی شکر کے میٹھے میں ڈبا دوں جتنا
کھاتے بنے کھاؤ؟

مدن سنگھ نے منہ بنا کر کہا۔ ارے! یہ تم نے بُری خبر سُنا لی۔ کیا الیشور
کے دربار میں اُلٹا انصاف ہوتا ہے۔ میرا بیٹا چھن جائے۔ اور اُسے بیٹال
جائے۔ اب وہ ایک سے دو ہو گیا۔ میں اُس سے کیونکر جیت سکوں گا۔
ہا۔ نا پڑا۔ وہ مجھے ضرور کھینچ لے جائے گا۔ میرے تو قدم ابھی سے اُکھڑ گئے
سچ جج الیشور کے یہاں بُرائی کرنے پر بھلائی ہوتی ہے۔ ہے اُلٹی بات یا
نہیں؟ اب میں اُلٹی چال چلوں گا۔ آپ ہی منانے جاؤں گا۔ کے دن کا
ہو؟

پدم۔ آج چوتھا دن ہے۔ مجھے فرصت ہی نہیں ملی۔ ورنہ پہلے ہی
دن آتا؟

مدن۔ کوئی مُضائقہ نہیں۔ ہم چھٹی تک پہنچ جائیں گے۔ بس کل سویرے
چلو؟

بھاما پھولی نہ سہاتی تھی جی چاہتا تھا۔ کسے کیا دیدوں۔ کیا لٹا دوں۔

اُننگ ہو رہی تھی۔ کہ گھر میں گانا ہو۔ دروازہ پر شہنائی بجے پڑوسنیں بلائی جائیں۔ نغمہ طرب سے سارا گاؤں گلزار ہو جائے۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ گویا آج دنیا میں ایک غیر معمولی واقعہ ہو گیا۔ گویا ساری دنیا اولاد سے محروم ہے۔ ایک میں ہی بیٹے پوتے والی خوش نصیب ہوں۔

ایک مزدور نے آکر کہا: ”بھابی دروازے پر ایک سادھہ آئے ہیں۔“

بھانائے فوراً اتنی جنس بھیج دی۔ جو چار آدمیوں کی خوراک سے بھی زیادہ تھی۔

کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد بھابھا اپنی دونوں لڑکیوں کو لے کر بیٹھ گئی۔ اور آدھی رات تک گاتی بجاتی رہی۔

باب نمبر (۳۲) : بھابھہ

جس طرح کوئی آدمی طبع میں پڑ کر کوئی زیور چڑا لیتا ہے۔ لیکن بیدار ہونے پر اُسے اس چیز کو دیکھنے سے بھی شرم آتی ہے۔ اسی طرح سدن بھی سمن سے محترز رہتا تھا۔ وہ اُسے ذلیل سمجھتا تھا۔ اور اُس کی توہین کرتا تھا۔

دن بھر کام کرنے کے بعد شام کو اس کی طبیعت اس پیشہ سے بڑا ہو جاتی۔ بالخصوص چولنے کے کام میں اُسے سمجھت محنت کرنی پڑتی۔

تھی۔ وہ سوچتا اس سمن کے باعث میں گھر سے جلا وطن ہو رہا ہوں۔
 اسی نے مجھے راندہ درگاہ بنا رکھا ہے۔ کیسے آرام سے مکان پر رہتا تھا۔
 چین سے کھاتا تھا۔ اور موج کرتا تھا۔ اسی نے میرے سر پر یہ مصیبت ڈال
 دی۔ اس کا لپکا یا ہوا کھانا کھانے میں بھی اب اُسے عار ہوتا تھا۔ وہ چاہتا
 تھا۔ کہ کسی طرح اس سے گلا چھوٹ جائے۔ یہ وہی سدن ہے۔ جو سمن
 پر جان دیتا تھا۔ اس کے دل آویز تبسم پر۔ اس کی نگاہ شوخ پر۔ اس کی
 شیریں ادائیگوں پر نثار ہوتا تھا۔ پر آج سمن اس کی نگاہوں میں اس
 قدر گر گئی ہے!

سدن نے ادھر برسوں سے لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اور جب
 سے چوڑے کی کل نے لی تھی۔ تب سے اسے روزانہ اخبار دیکھنے کی بھی جہلت
 نہ ملتی تھی۔ اب وہ سمجھتا تھا۔ اخبار بینی ان لوگوں کا کام ہے۔ جنہیں اور
 کوئی کام نہیں ہے۔ جو سارے دن پڑے مکھیاں مارا کرتے ہیں۔ لیکن
 اپنے بالوں کو سنوارنے کے لئے ہارمونیم بجانے کے لئے۔ نہ جاتے کیونکر
 وقت مل جاتا تھا؟

کبھی کبھی پھلی باتیں یاد کر کے وہ دل میں کہتا۔ اس وقت میں کیسا
 اندھا ہو گیا تھا۔ اسی سمن پر لٹو ہو رہا تھا۔ اب وہ اپنی ثقاہت پر ناز کرتا
 تھا۔ ندی کے کنارے وہ روزانہ ہزاروں عورتوں کو دیکھا کرتا تھا۔ لیکن
 کبھی اس کے دل میں فاسد خیالات نہ پیدا ہوتے۔ سدن اسے اپنا اخلاقی
 استحکام سمجھتا تھا۔

لیکن جب شانتا کے وضع حمل کا زمانہ قریب آیا۔ اور وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں مضحل اور جمبول پڑی رہنے لگی۔ تو سدن کو معلوم ہوا۔ کہ میں بڑے مغالطہ میں پڑا ہوا تھا۔ جسے میں اخلاقی استحکام سمجھتا تھا۔ وہ فنی الواقع محض میری خواہشات کی سیری کا نتیجہ تھا۔ اب وہ شام کو کام کر کے واپس آتا۔ تو شانتا کا روئے شگفتہ اس کا خیر مقدم نہ کرتا۔ وہ اپنی چار پائی پر اُداس پڑی رہتی کبھی اس کے سر میں درد ہوتا۔ کبھی جسم میں کبھی بخار ہو جاتا۔ کبھی متلی ہوئے لگتی۔ اس کا رخ روشن نہ ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ جسم میں خون ہی نہیں ہے۔ سدن کو اس کی یہ حالت دیکھ کر رنج ہوتا تھا۔ وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا ہوا اس کا دل بہلا پا کرتا تھا۔ لیکن اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُسے یہاں بیٹھنا ناگوار گزر رہا ہے۔ وہ کسی نہ کسی بہانہ سے اٹھ آتا۔ نفس نے پھر سرکشی شروع کی۔ خواہشات میں پھر سبجان ہونے لگا۔ وہ نو خیز ملاحنوں سے مذاق کرتا۔ گنگا کنارے جاتا۔ تو عورتوں کو پُر اشتیاق نظروں سے دیکھتا۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ تقاضاء نفس سے بیتاب ہو کر دال منڈی کی طرف چلا۔ وہ کئی مہینوں سے اصرہ نہیں آیا تھا۔ آٹھ بج گئے تھے۔ وہ ایک وارفتگی کے عالم میں قدم بڑھائے چلا جاتا تھا۔ وہ کبھی دو قدم آگے چلتا۔ تب چُب چاپ کھڑا ہو کر کچھ سوچتا۔ اور پیچھے پھرتا۔ لیکن دو چار قدم چل کر پھر لوٹ پڑتا۔ اس وقت اس کی حالت اس مریض کی سی ہو رہی تھی۔

جو خوان لذت سامنے دیکھ کر اس پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور بد پرہیزی کے انجام
کی مطلق پردائیں کرتا ہے۔

لیکن جب وہ دالمنڈی میں پہنچا۔ تو وہاں وہ پہلے کی سی رونق نہ
دکھائی دی۔ دو چار تبولیوں کی دکانیں تھیں۔ لیکن ان پر رنگین مزاجوں
کا ہجوم تھا۔ جلوائیوں اور نانباٹیوں کی دکانیں بند تھیں۔ بالاخلوں پر
ماہ رویوں کے جلوے نہ نظر آئے۔ نہ طبلے اور سارنگی کی صدا اُٹھ سائی دین
اب سدن کو یاد آیا۔ کہ بازار حسن یہاں سے اُٹھ گیا۔ اس کی طبیعت کچھ
منخفض ہو گئی۔ لیکن ایک ہی لمحہ کے بعد اُسے ایک عجیب سرت کا احساس
ہوا۔ گویا وہ کسی بے رحم سپاہی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو۔ وہ سپاہی اُسے
کشاں کشاں لئے جاتا تھا۔ اس کے پنجہ سے اپنے تئیں چھڑالینے کی اُس
میں قدرت نہ تھی۔ پر تھا نہ میں پہنچ کر سپاہی نے دیکھا۔ کہ تھا نہ بند ہے نہ
تھا نہ دار ہے۔ نہ کوئی کانسٹیبل۔ نہ چوکیدار! سدن کو اب اپنے دل کی
کمزوری پر ندامت ہوئی۔ اپنے استحکام پر اُسے جو غور تھا وہ پاش
پاش ہو گیا۔

وہ لوٹنا چاہتا تھا۔ لیکن جی میں آیا۔ کہ جب یہاں تک آیا ہوں۔
تو خوب سیر ہی کیوں نہ کر لوں۔ آگے بڑھا۔ تو وہ مکان نظر آیا جس میں سمن
رہتی تھی۔ وہاں ایک نغمہ دلنواز کی صدا اُس کے کانوں میں آئی۔ اُس نے
تعجب سے اُوپر دیکھا۔ تو ایک سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔
"سنگیت پاٹ سالا۔ سدن اوپر چڑھ گیا۔ اس کمرہ میں اُس نے حسینوں

سہن کی ناز برداریاں کی تھیں۔ وہ پچھلی صحتیں اس کی نظروں میں پھرنے لگیں۔ وہ ایک بچہ پر بیٹھ گیا۔ اور گانڈے لگا بیس پچیس آدمی بیٹھے ہوئے گانا بجانا سیکھ رہے تھے۔ کوئی تار بجاتا تھا۔ کوئی پکھاوج۔ کوئی سرود ایک بوڑھا استاد باری باری سے ان کی اصلاح کر رہا تھا۔ وہ اس فن میں ماہر تھا۔ سدن کا گانا سننے میں ایسا جی لگا۔ کہ وہ قریب آدھ گھنٹہ تک وہاں بیٹھا رہا۔ اُسے بڑی خواہش ہو رہی تھی۔ کہ میں بھی یہاں گانا سیکھنے آیا کرتا لیکن ایک تو اُس کا مکان دور تھا۔ دوسرے رات کو عورتوں کو تنہا چھوڑ کر یہاں آنا مشکل تھا۔

وہ اٹھنے ہی والا تھا۔ کہ اتنے میں اسی بوڑھے استاد نے تار

پر یہ گیت گانا شروع کیا۔

دیامئی۔ بھارت کو اپناؤ

اس پرنے سدن کے دل میں اعلیٰ جذبات کا ایک چشمہ سا کھول دیا۔ فلاح قوم خدمت ملک اور قومی عروج کے دلوے۔ اس کے دل میں جوش مارنے لگے۔ اس کا ساز قلب ان سُروں سے گونج اٹھا ایک دیوی کی روحانی صورت اس کی نگاہ باطن کے روبرو کھڑی ہو گئی۔ ایک لاغر۔ نحیف جستہ حال غمگین بوڑھا عاجزانہ نظروں سے دیوی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور دونوں ہاتھ اٹھائے دیوی سے الحاح کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

بھارت کو اپناؤ

سدن نے عالم خیال میں اپنے تئیں مفلس کسانوں کی دلجوئی کرتے
 ہوئے دیکھا۔ وہ زمیندار کے کارندے سے منت کر رہا تھا۔ کہ ان
 بیکیوں پر رحم کرو۔ کسان اس کے پیروں پر گرے پڑتے تھے۔ ان کی
 عورتیں اُسے دعائیں دے رہی تھیں۔ وہ خود اس خیالی بارات کا
 دولہا بنا ہوا تھا۔ وہ جب یہاں سے اٹھا تو قومی خدمت کا مصمم
 ارادہ کر چکا تھا۔ مگر تھوڑی ہی دور چلا تھا۔ کہ اُسے سندربائی کے مکان
 کے مقابل ایک ہجوم نظر آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ آج یہاں
 کنور از دھ سنگھ ایک "کسان سبھا" قائم کرنے والے ہیں۔ سبھا کا مقصد
 یہ ہوگا۔ کہ کسانوں کو زمینداروں کے دستِ ظلم سے بچائے۔ سدن
 کے دل میں ابھی ابھی کسانوں سے جو ہمدردی پیدا ہو گئی وہ سرد پڑ گئی۔
 وہ زمیندار تھا۔ اور کسانوں پر رحم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے یہ منظور
 نہ تھا۔ کہ کوئی زمینداروں کو دبا کر انہیں رعایتوں پر مجبور کرے۔ اس
 نے دل میں کہا۔ شاید یہ لوگ زمینداروں کے حقوق کے مخالف
 ہیں۔ ان کے اختیارات کو مٹانا چاہتے ہیں۔ اس لئے اب ہم کو بھی
 ہوشیار ہو جانا چاہئے۔ اور حفاظت کی فکر کرنی چاہئے۔ طبع انسانی
 کو دباؤ سے کتنی نفرت ہے۔ سدن نے یہاں ٹھیرنا بیکار سمجھا۔ نوبچ گئے
 تھے۔ گھر لوٹ آیا۔

●:●:●: (سلسلہ) ●:●:●:

شام کا وقت ہے۔ آسمان پر شفق چھائی ہوئی ہے۔ ہوا کے ہلکے
 ہلکے جھونکے لروں کو گدگدائے ہیں۔ لہریں مسکراتی ہیں۔ اور کبھی کبھی
 کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہیں۔ تب ان کے موتی کے سے دانت چمک اٹھتے
 ہیں۔ سدن کا خوش نما جھونپڑا آج پھولوں اور پتوں سے خوب سجا ہوا
 ہے۔ دروازے پر پلٹاؤں کی بھڑ بھڑ ہے۔ اندر ان کی عورتیں میٹھی
 ہوئی شادیاں گارہی ہیں۔ آنگن میں بھٹی کھڑی ہوئی ہے۔ اور بڑی
 بڑی رنگیں چڑھی ہوئی ہیں۔ آج سدن کے نوزائیدہ بچے کی چھٹی ہے۔
 یہ اسی کا جشن ہے۔

لیکن سدن بہت غمگین نظر آتا ہے۔ وہ سامنے چہرے پر بیٹھا
 ہوا گنگا کی طرف تاک رہا ہے۔ اس کے دل میں انہیں موجوں کی طرح
 خیال کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ نہ! وہ لوگ نہ آئیں گے! آنا ہوتا۔ تو
 آج چھ دن گزر گئے۔ اب تک نہ جاتے۔ اگر میں جانتا۔ کہ وہ نہ آئیں گے
 تو میں چچا صاحب کو بھی اس کی خبر نہ دیتا۔ ان لوگوں نے مجھے سمجھ
 لیا ہے۔ کہ مر گیا۔ وہ مجھ سے کوئی سروکار نہیں رکھتا چاہتے۔ میں جنوں
 یا مروں۔ انہیں پروا نہیں ہے۔ لوگ ایسی تقریروں میں اپنے دشمن
 کے کھر بھی جاتے ہیں۔ میں دشمن سے بھی بدتر ہوں۔ محبت سے نہ
 آتے۔ رسا ہی آتے۔ دکھاوے کے لئے ہی آتے۔ مجھے معلوم ہو جاتا۔

کہ دنیا میں میرا کوئی ہے، اچھا نہ آئیں۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کام سے ہمت پاؤں تو ایک بار میں خود وہاں جاؤں گا۔ اور ہمیشہ کے لئے بنٹارار کر آؤں گا بچہ کیسا خوب صورت ہے! کیسے لال لال ہونٹ ہیں۔ بالکل مجھی کو پڑا ہے۔ ہاں آنکھیں شانتا کی ہیں میری طرف کیسا ٹک ٹک تاکتا تھا۔ دادا کو تو میں نہیں کہتا۔ لیکن اماں اُسے دیکھیں۔ تو ایک بار گود میں ضرور لے لیں۔ دفعۃً سدن کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ اگر میں مرجاؤں تو کیا ہوگا اس لڑکے کی پرورش کون کرے گا؟ کوئی نہیں۔ سنسار میں میرے سوا اس کا اور کوئی نہیں ہے۔ نہیں نہیں دادا کو اس پر ضرور رحم آئے گا۔ وہ اتنے سخت دل نہیں ہیں۔ ذرا دیکھیں سیونگ بنک میں میرے کتنے روپے ہیں۔ ابھی ایک ہزار بھی پورے نہیں! زیادہ نہیں۔ اگر میں پچاس روپے ماہوار بھی جمع کرتا جاؤں۔ تو سال میں چھ سو ہو جائیں گے۔ جو نئی دو ہزار پورے ہوئے میں نے گھر بنوانا شروع کیا، دو کمرے باہر پانچ کمرے اندر۔ دروازے پر محراب دار سائبان۔ پٹاؤ کے اوپر دو کمرے۔ جب ایسا مکان بنے تو البتہ کچھ زندگی کا لطف آئے، کرسی خوب اونچی دوں گا۔ کم سے کم پانچ فٹ۔ اس سے مکان کی شان دو بالا ہو جائے گی۔

سدن اسی خیالی پلاؤ کے مزے لے رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا تھا۔ کہ ناگاہ اُس نے سڑک کی طرف سے ایک گاڑی آتے دیکھی۔ گاڑی کی دونوں بتیاں بجی کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

کون آرہا ہے؟ چچا صاحب کے سوا اور کون ہوگا! میرا اور ہے
ہی کون؟

اتنے میں گاڑی قریب آگئی۔ اس میں سے مدن سنگھ اترے، اس
گاڑی کے پیچھے ایک اور گاڑی تھی۔ سبھرا اور بھاما اس میں سے اتریں۔
سدن کی دونوں بہنیں بھی تھیں۔ جیتن کوچ بکس پر سے اتر کر
لاٹین دکھانے لگا۔ سدن نے انہیں دیکھا تو اُن سے ملنے کے
لئے دوڑا انہیں۔ وہ موقع گزر چکا تھا۔ جب وہ انہیں منانے جاتا۔
اب اُس کے روٹھنے کی باری تھی۔ وہ چہوڑے پر سے اُٹھ کر جھونپڑے
میں چلا گیا۔ گویا کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ اُس نے دل میں کہا۔ یہ لوگ
سمجھتے ہوں گے۔ کہ اُن کے بغیر میں بے حال ہوا جاتا ہوں۔ لیکن جس
طرح انہیں میری پروا نہیں۔ اُسی طرح میں بھی اُن کی پروا نہیں
کرتا۔

سدن جھونپڑے میں جا کر جھانک رہا تھا۔ کہ دیکھیں یہ لوگ
کیا کرتے ہیں۔ جیتن نے آکر دروازے پر آواز دی۔ کئی ملاج اُدھر
اُدھر سے دوڑے۔ سدن بالکل آیا۔ اور دور ہی سے اپنی ماں کو پرنام
کر کے ایک کنارے کھڑا ہو گیا۔

مدن سنگھ بولے؟ تم تو اس طرح کھڑے ہو۔ گویا مجھے پہچانتے ہی
نہیں۔ میرے نہ سہی۔ پر ماں کے قدم چوم کر دعا تو لے لو؟
سدن نے بیگانہ پن سے کہا۔ "میرے چھوٹے سے آپ کا دھرم بگڑ

جائے گا:

مدن سنگھ نے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا: دیکھتے ہو ان کی باتیں۔
میں تم سے کہتا نہ تھا۔ کہ وہ ہم لوگوں کو بھول گیا ہوگا۔ لیکن تم خواہ مخواہ
کھینچ لائے۔ اپنے ماں باپ کو دروازہ پر پکڑے دیکھ کر بھی اسے در نہیں
آتا؟

مدن اس سے زیادہ سرد مہری نہ کر سکا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے
باپ کے پیروں پر گر پڑا۔ مدن سنگھ بھی رونے لگے۔ اس کے بعد وہ ماں
کے پیروں پر گرا۔ اس نے اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔ اور دعائیں دیں۔
شفقت۔ سعادت اور عفو کا کیسا روشن۔ کیسا نشاط انگیز منظر تھا۔
تھا۔ ماں باپ کے دل مسرت سے اُٹھے ہوئے ہیں۔ اور بیٹے کے دل
میں حسن ارادت کی موجیں اُٹھ رہی ہیں۔ اس خلوص جذبات سے دل
کے تاریک گوشے بھی روشن ہو گئے ہیں۔ غرور باطل اور خوف رسوائی حشر
کی طرح نکل بھاگے ہیں۔ اور وہاں اب حق اور انسانیت کا مسکن ہے۔
خوشی کے مارے مدن کے پیر زمین پر نہیں پڑتے۔ اب وہ ملاخول
کو کوئی نہ کوئی کام کرنے کا حکم دے کر دکھا رہا ہے۔ کہ میرا یہاں کتنا رعب
ہے۔ کوئی چار پائی نکالنے جاتا ہے۔ کوئی گنگا جل لانے جا رہا ہے۔ کوئی
بازار دوڑا جاتا ہے۔ مدن سنگھ پھولے نہیں سماتے۔ اور اپنے بھائی کے
کانوں میں کہتے ہیں: ”یہ تو بڑا ہوشیار نکلا۔ میں سمجھتا تھا۔ کہ کسی طرح پڑا ہوا
دن کاٹ رہا ہوگا۔ لیکن یہاں تو بڑے ٹھٹھٹ ہیں؟“

اُدھر بھاما اور سجدرا اندر گئیں۔ بھاما حیرت سے چاروں طرف
دیکھتی تھی کیسی صفائی ہے۔ سب چیزیں قرینہ سے رکھی ہوئی ہیں۔ اس کی
بہن بڑی گن دان معلوم ہوتی ہے۔

دونوں زچہ خانہ میں گئیں۔ شانتانے دونوں کے قدم چومے۔ بھاما
نے بچے کو گود میں لے لیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا۔ گویا یہ کرشن کا اوتار ہے۔
اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔

تھوڑی دیر میں اُس نے آکر مدن سنگھ سے کہا: ”اور جو کچھ ہو پر تم نے
ہو بڑی سندر پائی ہے۔ گلاب کا پھول ہے۔ اور لڑکا تو بھگوان کا اوتار ہی
معلوم ہوتا ہے۔“

مدن سنگھ نے کہا: ”ایسا صاحب اقبال نہ ہوتا تو۔ مدن سنگھ کو کھینچ
کیونکر لاتا؟“

بھاما۔ ہو بڑی سوشیل معلوم ہوتی ہے۔
مدن۔ تبھی تو سدن نے ماں باپ کو تیاگ دیا تھا۔
سب کے سب اپنی اپنی دھن میں گن گتے۔ پر کسی کو خبر نہ تھی کہ ابھالنی
سمن کہاں ہے۔

— (۳۴) —

سمن گنگا کنارے سدھیا کہنے گئی ہوئی تھی۔ لونی تو اسے جھونپڑ
کے دروازے پر گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ اس نے پدم سنگھ کو پہچانا۔ سمجھ

گئی۔ کہ سدن کے باپ آگئے۔ وہ آگے قدم نہ رکھ سکی۔ اس کے پیروں میں
بیڑی سی پڑ گئی۔ اسے معلوم ہو گیا۔ کہ اب میرے لئے وہاں جگہ نہیں
ہے۔ اب یہاں سے میرا تالو ٹپتا ہے۔ وہ صورت تصویر کھڑی سوچنے
لگی۔ کہ کہاں جاؤں؟

ادھر ایک ماہ سے دونوں بہنوں میں خاصی بد مزگی پیدا ہو گئی تھی۔
وہی شانتا جو بدھوا آشرم میں سوزا اور درد اور حلم کی صورت بنی ہوئی
تھی۔ اب ہمیشہ سمن کو جلانے اور رلانے پر آمادہ رہتی تھی۔ اُس وقت
شانتا کو ہمدرد کی ضرورت تھی۔ وہ ایک غمگسار کی طالب تھی۔ درالفت
نے اسے درد شناس۔ رقیق اور فیاض بنا دیا تھا۔ پر اب اپنا پریم رتن پا کر
اس کا دل کسی نوع ورج آدمی کی طرح سخت اور خشک ہو گیا تھا۔ اسے یہ
خوف کھائے جاتا تھا۔ کہ کہیں سدن سمن کے دام الفت میں اسیر نہ ہو
جائے۔ سمن کی پوجا پاٹ ترک اور زہد کی اُس کی نگاہوں میں کچھ وقعت
نہ تھی۔ وہ اسے ریاکاری خیال کرتی تھی۔ سمن سر میں تیل ڈالنے یا صاف
کپڑے پہننے کے لئے ترس جاتی تھی۔ شانتا اسے سمجھتی تھی۔ وہ سمن کے
طور و طریق کو بڑی تیز نگاہوں سے دیکھا کرتی تھی۔ سدن سے سمن کو جو
کچھ کہنا ہوتا۔ وہ شانتا سے کہتی۔ یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی شانتا
کسی نہ کسی حیلہ سے رسوئیں میں آ بیٹھتی تھی۔ وہ وضع حل کے قبل ہی سمن
کو کسی طرح وہاں سے ٹالنا چاہتی تھی کیونکہ زچہ خانہ میں مقید ہو کر وہ سمن
کی قرار واقعی دیکھ بھال نہ کر سکے گی۔ اسے اور سب تکلیف منظور تھی۔

لیکن یہ جلن نہ سی جاتی تھی :-

مگر سمن سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہ دیکھتی تھی۔ سب کچھ سنتے ہوئے بھی کچھ نہ سنتی تھی۔ ندی میں ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح وہ اس سہارے کو چاہے وہ تنکا ہی کیوں نہ ہو۔ نہ چھوڑ سکتی تھی۔ پر اس وقت سدن کے والدین کو وہاں دیکھ کر اُسے یہ سہارا چھوڑنا پڑا۔ ارادہ جو کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ محل نے کر دکھایا۔ اُس نے ندی میں ڈوبنے کا تصفیہ کر لیا :-

وہ پاؤں دبائے ہوئے آہستہ آہستہ جھونپڑے کے پچھو اڑے آئی۔ اور کان لگا کر سننے لگی۔ کہ دیکھوں یہ لوگ میرا کچھ چرچا تو نہیں کر رہے ہیں۔ وہ آدھ کھنڈہ تک اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ بھاما اور سجدرا ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں۔ آخر اس نے بھاما کو یہ کہتے ہوئے سنا : اب اس کی بہن یہاں نہیں رہتی کیا ؟

سجدرا۔ رہتی کیوں نہیں۔ وہ کہاں جانے والی ہے ؟
بھاما۔ دکھائی نہیں دیتی :-

سجدرا۔ کہیں گئی ہوگی۔ گھر کا ساما کام وہی سنبھالے ہوئے ہے :-
بھاما۔ آئے تو اُس سے کہہ دینا۔ وہیں باہر لیٹ رہے۔ سدن اسی کا بیٹا
کھاتا ہوگا ؟

شانتا زچہ خانہ کے اندر سے بولی :- نہیں ابھی تک تو میں ہی بناتی تھی۔
آج کل وہ اپنے ہاتھ سے بنا لیتے ہیں :-
بھاما۔ تب بھی گھڑے برتن تو وہ چھوتی ہی ہوگی۔ یہ گھڑے مٹکے

پھنکوا دو۔ برتن پھر سے دھل جائیں گے؛
 سمجھدرا۔ باہر کہاں سونے کی جگہ ہے؛
 بھاما۔ ہو چاہے نہ ہو۔ لیکن میں اُسے نہ سونے دوں گی۔ ایسی عورت
 کا کیا اعتبار؟

سمجھدرا۔ نہیں ہن۔ وہ اب ایسی نہیں ہے۔ وہ بڑے نیم دھرم
 سے رہتی ہے؛

بھاما۔ چلو۔ وہ بڑے نیم دھرم سے رہنے والی۔ سات گھاٹ کا پانی
 پی کے آج نیم والی بنی ہے۔ وہ اب دیوی ہو جائے۔ تو بھی میں اُس کا اعتبار
 نہ کروں؛

سمن کو اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ رہی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا کسی
 نے لوہا لال کے دل میں چھبھادیا۔ اُسے لٹے پاؤں لوٹی۔ اور اسی تاریکی میں ایک
 طرف کو چل کھڑی ہوئی؛

خوب اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ راستہ بھی صاف نہ نظر آتا تھا۔ پر سمن گنتی
 پڑتی چلی جاتی تھی معلوم نہیں کہاں۔ کدھر۔ وہ اپنے ہوش میں نہ تھی۔ لاٹھی
 کھا کر تیوزائے ہوئے گتے کی طرح وہ بدحواس بھال چلی جاتی تھی۔ سنبھلنا
 چاہتی تھی۔ پر سنبھل نہ سکتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے پیر میں ایک بڑا کانٹا چھبھ
 گیا۔ وہ پیر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ چلنے کی طاقت نہ رہی؛

غشی کے بعد ہوش میں آنے والے آدمی کی طرح اس نے ادھر
 ادھر چونک کر دیکھا۔ چاروں طرف ساٹا تھا۔ خوب گہری تاریکی چھائی

ہوئی تھی۔ صرف گیڈر اپنا بے سارا گال اپ رہے تھے۔ یہاں میں اکیلی ہوں
 یہ سوچ کر سمن کے روئیں کھڑے ہو گئے۔ اکیلا پن کسے کہتے ہیں۔ یہ اُسے
 آج معلوم ہوا۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اکیلی ہوں۔ یہاں اور کوئی
 نہیں ہے۔ اُسے اپنے چاروں طرف انواع و اقسام کی مخلوق فضا میں طپتی
 ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ یہاں تک کہ اُس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں تنہائی
 میں واہمہ انتہا درجہ صورت کش ہو جاتا ہے:

سمن سوچنے لگی۔ میں کیسی بد نصیب ہوں۔ اور تو اور اپنی ہی سگی بہن
 اب میری صورت نہیں دیکھتا چاہتی۔ میں نے اُسے کتنا اپنا ناچا ہا۔
 مگر وہ میری نہ ہوئی۔ میرے ماتھے پر کلنک کا داغ لگ گیا۔ اور وہ اب
 دھونے سے نہیں دھل سکتا۔ میں اس کو یا کسی غیر کو کیوں الزام دوں یہ
 سب میرے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ آہ! اڑی میں کیا درد ہو رہا ہے۔ یہ
 کاٹا کیسے لکھے گا۔ اندر اس کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ کیسا تپک رہا
 ہے۔ نہیں میں کسی کو الزام نہیں دے سکتی۔ کانٹے تو میں نے بوئے ہیں۔
 پھل کون کھائے گا۔ میں کیسی اندھی ہو گئی۔ کہ محض نفس کی لذت کے لئے
 اپنی روح کا خون کر بیٹھی۔ مجھے تکلیف ضرور تھی۔ میں گننے پڑے کو ترستی
 تھی۔ اچھا کھانے کو ترستی تھی۔ پریم کو ترستی تھی، اس وقت مجھے اپنی زندگی
 اجیران معلوم ہوتی تھی۔ مگر وہ حالت بھی تو میرے پچھلے جنم کے کاموں ہی
 کا نتیجہ تھی! اور کیا ایسی عورتیں نہیں ہیں۔ جو اس سے کہیں زیادہ مصیبتیں
 جھیل کر اپنی عصمت کو بچاتی ہیں۔ دمنیتی پر کسی کیسی آفتیں آئیں سیتاچی

کو رام چند نے گھر سے نکال دیا۔ اور وہ برسوں جنگلوں میں طح طح کی مصیبتیں
اٹھاتی رہیں۔ سادتری پر کیسے کیسے سانچے گزرے۔ پردہ ثابت قدم رہیں اتنی
دور کیوں جاؤں۔ میرے ہی پڑوس میں کتنی عورتیں رو رو کر دن کاٹ رہی
تھیں۔ امولا میں وہ بچاری اہیرن کیسی کڑیاں جھیل رہی تھی تو ہر برسوں
پر دیس سے نہ آتا تھا۔ بچاری فاقے کر کے پڑ رہتی تھی۔ ہائے اسی حُسن نے
میری مٹی خراب کی۔ اپنے حُسن کے غرور نے میری یہ حالت کی!

ایشور! تم پھول کے ساتھ کانٹا کیوں رکھ دیتے ہو، حُسن دے کر من کو
چنچل کیوں بنا دیتے ہو۔ میں نے حسین عورتوں کو اکثر چنچل ہی پایا۔ شاید ایشو
اس حکمت سے ہماری آزمائش کرتے ہیں۔ روح کو حُسن کی آگ میں ڈال کر
اسے چمکانا چاہتے ہیں۔ پر افسوس! نفسانیت ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال
دیتی ہے۔ ہم اس آگ میں چمکنے کے بدلے جل جاتے ہیں!

یہ ٹپک کیسے بند ہو۔ جانے کس چیز کا کانٹا تھا۔ جو کوئی آ کے مجھے
پکڑے تو کیا ہو۔ یہاں چلاؤں بھی تو کون۔ سنے گا، ارے! یہ پتیاں
کیوں کھڑکھڑا رہی ہیں، کوئی جانور تو نہیں آتا، ہنیں ضرور کوئی نہ
کوئی آ رہا ہے:

سمن کھڑی ہو گئی۔ اس کا چکر مضبوط تھا۔ وہ خوف پر غالب آ گئی

تھی:

رات بھیک جلی تھی بسنت کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سمن نے
ساڑی سمیٹ لی۔ اور گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔ اُسے وہ دن یاد آیا۔ جب اسی

موسم ہیں۔ اسی وقت وہ اپنے شوہر کے دروازہ پر بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی۔ کہ کہاں جاؤں۔ اس وقت وہ خواہشات کے جھکولے کھا رہی تھی۔ آج اس پر سکونِ باطن غالب تھا۔

لیکایک اس کی آنکھیں جھپک گئیں۔ اس نے دیکھا۔ کہ سوامی گجانب مرگ چھالا اوڑھے میرے سامنے کھڑے میری طرف لگاہ رحم سے دیکھ رہے ہیں۔ سمن اُن کے قدموں پر گر پڑی۔ اور عاجزی سے بولی: "سوامی! مجھے بچائیے۔"

سمن نے دیکھا۔ کہ سوامی نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بولے: "ایشور نے اسی لئے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ بولو کیا چاہتی ہو؟ دولت؟"

سمن۔ نہیں ہمارا ج دولت کی ہوس نہیں ہے۔
سوامی۔ عزت؟

سمن۔ نہیں ہمارا ج۔ اس کی بھی خواہش نہیں ہے۔
سوامی۔ چچا تو سنو۔ ستیہ جگ میں آدمیوں کی ملتی گلیاں سے ہوتی ہے۔ دوا پر میں بھگتی سے۔ تریا میں ستیہ سے۔ پر اس کلجگ میں اس کا صرف ایک راستہ ہے۔ اور وہ سوا ہے۔ اس راستہ پر چلو گی۔ تو تمہاری ملتی ہو جائے گی جو لوگ تم سے بھی بیکس۔ دکھی مصیبتوں کے مارے ہیں۔ اُن کی خبر لو۔ اور اُن کی دعائیں تمہارے آڑے آئیں گی؟

سمن کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اُسے یقین تھا

کہ میں جاگ رہی تھی۔ اتنی جلد سوامی جی کہاں غائب ہو گئے۔ دفعۃً اسے
ایسا معلوم ہوا۔ کہ سوامی جی درختوں کے سایہ میں لالٹین لئے کھڑے
ہیں۔ وہ اٹھ کر لنگڑاتی ہوئی ان کی طرف چلی اس نے اندازہ کیا تھا کہ
سوامی جی مجھ سے ایک سے قدم کے فاصلے پر ہوں گے۔ پر وہ ایک سو کے
بدلے دو سو تین سو چار سو قدم چلی گئی۔ اور وہ درختوں کا کٹج اور ان
کے سایہ میں سوامی جی لالٹین لئے اتنی ہی دور کھڑے تھے!
حسن کو شبہ ہوا۔ کہ میں سو تو نہیں رہی ہوں۔ یہ خواب بہر گز نہیں
ہے۔ اس نے زور سے چلا کر کہا: ہمارا ج میں آتی ہوں۔ آپ ذرا ٹھہر
جائیے۔

اس کے کانوں میں آواز آئی۔ چلی آؤ۔ میں کھڑا ہوں۔
سمن پھر چلی۔ پر دو سو قدم چلنے پر وہ تھک کر بیٹھ گئی۔ درختوں کا کٹج
اور سوامی جی جوں کے توں اس سے ایک سو گز کے فاصلے پر نظر آتے تھے۔
دمشت کے بارے سمن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اس کا سینہ
دھڑکنے لگا۔ اور پیر پھر پھر کانپنے لگے۔ اس نے چلنا چاہا۔ پر منہ سے
آواز نہ لگی۔

سمن بے ہوش سنبھال کر خیال کرنا چاہا۔ کہ یہ کیا راز ہے۔ میں کوئی
بھوتوں کا تماشہ تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔ لیکن کوئی دست غیب اسے
اُسی طرف کھینچے لئے جاتا تھا۔
وہ آگے چلی۔ اب وہ شہر کے قریب آگئی تھی۔ اسے نظر آیا۔ کہ سوامی جی

ایک کٹی میں چلے گئے۔ درختوں کا کنج غائب ہو گیا۔ سمن نے سمجھا یہی سوامی جی کی کٹی ہے۔ اسے اطمینان ہوا۔ اب سوامی جی سے ضرور ملاقات ہوگی۔ انہیں سے یہ حقیقت کھلے گی۔

اُس نے کٹی کے دروازے پر جا کر کہا: سوامی جی۔ میں ہوں سمن؟ یہ کٹی گجاندہی کی تھی۔ پر وہ سو رہے تھے۔ سمن کو کوئی جواب نہ ملا۔ سمن نے کٹی میں جھانکا۔ آگ جل رہی تھی۔ اور گجاندہ کتل اوڑھے پڑے تھے۔ سمن کو حیرت ہوئی۔ کہ یہ تو ابھی چلے آ رہے ہیں۔ اتنی جلد سو کیونکر گئے۔ اور وہ لالٹین کمال چلی گئی۔ زور سے پکارا: "سوامی جی! سوامی جی اٹھ بیٹھے۔ اور تجب سے سمن کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کون سمن؟"

سمن۔ ہاں صراج میں ہی ہوں۔ گجاندہ۔ میں ابھی تمہیں خواب میں دیکھ رہا تھا۔ سمن نے چکر کر کہا: آپ تو ابھی ابھی کٹی میں آئے ہیں؟ گجاندہ نہیں تو۔ مجھے سوئے بہت دیر ہوئی۔ میں تو کٹی سے نکلا ہی نہیں۔ ابھی تمہارا ہی سپنا دیکھ رہا تھا۔

سمن۔ اور میں آپ ہی کے پیچھے پیچھے گنگا کنارے سے چلی آ رہی ہوں۔ آپ لالٹین لئے میرے سامنے چلے آتے تھے۔ گجاندہ نے مسکرا کر کہا: "نہیں دھوکا ہوا؟"

سمن۔ دھوکا ہوتا۔ تو میں بلا دیکھے سنے یہاں کیسے پہنچ جاتی۔

یہ کہہ سمن نے اس وقت کا ماجرا کہہ سنایا:
 گجائنند ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو۔ ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے۔
 سمن۔ کوئی دیوتا تو نہیں تھے۔ جو آپ کی صورت بدل کر مجھے آپ
 کے پاس لائے ہوں؟

گجائنند۔ یہ بھی ممکن ہے۔ تم نے جو کچھ کہا۔ وہی میں ابھی خواب میں
 دیکھ رہا تھا۔ اور تمہیں سیوا دھرم کا اُپدیش کر رہا تھا۔ سمن تم مجھے خوب
 جانتی ہو۔ میرے ہاتھوں تم نے بہت تکلیفیں جھیلی ہیں۔ تم جانتی ہو۔
 میں کتنی کمینہ طبیعت کا آدمی تھا۔ اب اُن بے رحمیوں کو یاد کرتا ہوں
 تو چھاتی پر سانپ سا لوٹنے لگتا ہے۔ تم عزت کے قابل تھیں۔ میں نے
 تمہارے ساتھ ظلم کیا۔ یہی ہماری مصیبتوں کا خاص سبب تھا۔ ایشور
 وہ دن کب لائیں گے۔ کہ یہاں عورتوں کی قدر ہوگی۔ عورت پہلے کچیلے
 پھٹے پُرانے کپڑے پہن کر۔ آدھے پیٹ روکھی روٹی کھا کر۔ جھونپڑے
 میں رہ کر۔ محنت مزدوری کر کے۔ سب طرح کی مصیبتیں جھیل کر آرام
 سے زندگی بسر کر سکتی ہے۔ صرف گھر میں اس کی قدر ہونی چاہئے۔ اُس سے
 پریم ہونی چاہئے۔ عزت اور پریم کے بغیر کوئی عورت محلوں میں بھی سکھ
 سے نہیں رہ سکتی۔ لیکن اُس وقت میری آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔
 تمہارے چلے آنے کے بعد جب سادھو ہاتھاؤں کی صحبت سے
 میری آنکھیں کھلیں۔ تب مجھے اپنی عاقبت کی فکر ہوئی۔ میرے پاس
 دگیان تھا۔ نہ علم تھا۔ اس لئے میں نے اپنے بھائیوں کی خدمت کرنے

کا فیصلہ کیا۔ یہی راستہ میرے لئے سب سے آسان تھا۔ تب سے میں
 اسی راستہ پر چلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس راستہ پر چل کر میرے دل
 کو راست ملی ہے۔ اور میں تمہارے لئے بھی یہی راستہ سب سے بہتر
 سمجھتا ہوں۔ میں نے تمہیں بددعا آشرم میں دیکھا۔ سدن کے گھر میں
 دیکھا۔ تم دل و جان سے خدمت کرنے میں مصروف تھیں۔ تمہارے
 دل میں رحم ہے۔ پریم ہے۔ ہمدردی ہے۔ اور اس راستہ پر چلنے کے بھی
 یہی لوازمات ہیں۔ تمہارے لئے خدمت کا دروازہ کھلا ہے۔ وہ تمہیں
 اپنی طرف بلارہی ہے۔ اس میں قدم رکھو۔ ایشور تمہارا گلیان کریں گے۔
 سمن کو کجاند کے چہرہ پر ایک روحانی جلال کا جلوہ نظر آیا۔ اس نے دل
 میں اُن سے باطنی ارادت پیدا ہوئی۔ بولی: "ہمارا راج میں آپ ہی کو اپنا
 گرو مانتی ہوں۔ میں اپنے تئیں آپ ہی کے سپرد کرتی ہوں۔ یہی عہد آپ
 سے میں نے ایک بار پہلے بھی کیا تھا۔ لیکن اپنی نادانی کے باعث خدا سے
 پورا نہ کر سکی۔ وہ عہد میرے دل سے نہ نکلا تھا۔ آج میں سچے دل سے
 یہ عہد کرتی ہوں۔"

گجاند کو اس وقت سمن کے چہرہ پر خاص باطن کی روشنی دکھائی
 دی۔ وہ بیتاب ہو گئے۔ وہ جذبات جنہیں وہ برسوں سے فنا کر رہے
 تھے۔ پیدا ہونے لگے۔ زندگی کی دلفریبوں کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے
 لگا۔ انہیں اپنی موجودہ زندگی خشک۔ بے مزہ۔ ویران معلوم ہونے لگی۔
 وہ ان ترغیبات سے کانپ اٹھے۔ انہیں خدشہ ہوا۔ کہ اگر یہ خیالات

میرے دل میں جاگزیں ہو گئے۔ تو میری برسوں کی عبادت اور عزت و
 دمزدن میں خاک میں مل جائے گی۔ وہ بول اٹھے: تمہیں معلوم ہے کہ
 یہاں ایک یتیم خانہ کھول دیا گیا ہے؟

سمن۔ ہاں اس کا چرچا سنا تھا۔

گجانبند۔ اس یتیم خانہ میں زیادہ تر وہی لڑکیاں ہیں جنہیں طوائفوں
 نے ہمارے سپرد کیا ہے۔ کوئی بچاں لڑکیاں ہونگی۔

سمن۔ یہ سب آپ ہی کے آپدیش کا نتیجہ ہے۔

گجانبند۔ نہیں۔ یہ پیٹڈ پدم سنگھ کی کارگزاری ہے۔ میں تو محض
 ان کا ادنیٰ خادم ہوں۔ اس یتیم خانہ کے لئے ہمیں ایک سچے دل کی ضرورت
 ہے۔ اور وہ تمہیں میں ہے میں نے بہت تلاش کی۔ لیکن کوئی ایسی عورت
 نہ ملی۔ جسے اس کام سے سچا عشق ہو۔ جو ماں کی طرح لڑکیوں کی پرورش
 کرے۔ جو اپنی محبت سے ان کی ماں بن جائے۔ وہ بیمار ہیں۔ تو ان کی
 ایسی اصلاح کرے۔ کہ ان کی پڑانی ناہمواریاں مٹ جائیں۔ البشور
 نے تمہیں فہم اور فراست دی ہے۔ تمہارے دل میں درد اور ایشیاء ہے۔

اور تمہیں اس فرض کا بوجھ اٹھاسکتی ہو۔ میری یہ عرض قبول کر دو گی۔

سمن کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ سوامی گجانبند میری نسبت ایسا

حسن ظن رکھتے ہیں۔ اس خیال سے اس کا دل سرشار ہو گیا۔ اُسے خواب

میں بھی اُمید نہ تھی کہ مجھ پر اتنا اعتماد کیا جائے گا۔ اور میں ایسی عظیم الشان
 خدمت بجالانے کے قابل سمجھی جاؤں گی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ پرمانہ

گجاند کی زبان سے یہ تحریک کی ہے۔ ابھی ایک لمحہ پہلے اگر وہ کسی لڑکے کو
 کیچڑ میں لپیٹا ہوا دیکھتی تو اس کے قریب نہ جاتی۔ لیکن گجاند نے اس پر
 اعتماد کر کے اس کے حس اشکراہ کو مسخر کر لیا تھا، ہم اپنے اوپر اعتماد کرنے
 والوں کو مایوس کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ اور اکثر ایسے بوجھ اٹھانے پر
 آمادہ ہو جاتے ہیں جنہیں ہم پہلے ناقابل برداشت سمجھتے تھے۔ اعتماد سے
 اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

سمن نے عاجزی سے کہا: آپ لوگ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں میری
 عین خوش نصیبی ہے میں کسی کے کچھ کام آسکوں کسی کی کچھ خدمت کر سکوں۔
 یہ میری دلی تمنا تھی۔ آپ کے معیار تک پہنچنا میرے لئے غیر ممکن ہے۔
 لیکن میں اپنے مقدور بھر آپ کے حکم کی تعمیل کروں گی۔
 یہ کہتے کہتے سمن کا سر جھک گیا۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
 اس کی زبان سے جو کچھ نہ ہو سکا۔ وہ اس کے انداز نے ظاہر کر دیا۔ گویا وہ کہہ
 رہی تھی۔ یہ آپ کی شفقت ہے۔ جو مجھ پر اتنا اعتماد رکھتے ہیں۔ کہاں مجھ
 جیسی گری ہوئی عورت اور کہاں یہ پاک خدمت پر ایشور نے چاہا تو آپ کو
 اس اعتماد کے لئے پھٹانا نہ پڑے گا۔

گجاند بولے: "مجھے تم سے ایسی ہی اُمید تھی۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ پو پھٹ رہی تھی۔ پیپے کی زبلی صدا
 کانوں میں آرہی تھی۔ انہوں نے اپنا کنڈل اٹھایا۔ اور گنگا نشان کرنے
 چلے گئے۔

سمن نے کٹی سے باہر نکل کر دیکھا۔ جیسے نیند سے جاگ کر ادھر ادھر دیکھتے ہیں۔ موسم کتنا سہانا ہے۔ کتنا پرسکون۔ کتنا فرحت بخش! کیا اس کی آئندہ زندگی میں بھی سحرِ مودار ہوگی۔ اس میں بھی کبھی صبح کی تنویر نظر آئے گی۔ کبھی آفتاب کی زریں شعاعیں چمکیں گی؟

— (۳۵) —

ایک سال گزر گیا۔ پنڈت مدن سنگھ پہلے تیرہ جاترہ پر ادھر رکھائے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ مدن کے گھر آتے ہی وہ ایک دن بھی نہ ٹھہریں گے۔ سیدھے بدری ناٹھ پہنچ کر دم لیں گے۔ پر جب سے مدن گھر آ گیا ہے۔ انہوں نے کبھی بھول کر بھی تیرہ جاترہ کا نام نہیں لیا۔ پوتے کو گود میں لئے سامیوں کا حساب کرتے ہیں۔ بھیتوں کی نگرانی کرتے جاتے ہیں۔ ہوس نے اور بھی جکڑ لیا ہے۔ ہاں گھر میں بھاما کے سر سے اب فکر کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا ہے۔ اب اُسے پڑوسنوں کے ساتھ تبادلہ خیالات کرنے کے زیادہ موقع ملتے ہیں۔ گھر کا کاروبار شانتا انجام دیتی ہے۔

پنڈت پدم سنگھ نے وکالت چھوڑ دی۔ اب وہ میونسپلٹی کے چیرمن ہیں۔ اس کام سے انہیں طبعی مناسبت ہے۔ شہر روز بروز ترقی کر رہا ہے۔ سال کے اندر ہی اندر کئی نئی سڑکیں نکل گئی ہیں۔ اور تین نئے باغ تیار ہو گئے ہیں۔ اب ان کا ارادہ ہے۔ کہ یکہ اور گاڑی والوں کے لئے شہر کے باہر ایک محلہ بنوادیں۔ شراجی کے کئی پہلے کے دوست اب ان کے

مخالف ہو گئے۔ اور کئی سابق کے مخالفین اب دوستی کا دم بھرتے ہیں۔
 مگر ہمارے بٹھل داس پر ان کی عقیدت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔
 وہ بہت چاہتے ہیں۔ کہ ہمارے جی کو میونسپلٹی میں کوئی منصب دیں۔
 پر بٹھل داس اس پر راضی نہیں ہوتے۔ وہ بے غرض خدمت کے عہد کو
 توڑنا نہیں چاہتے۔ ان کا خیال ہے۔ کہ صاحب منصب ہو کر میں شہر کی
 اتنی خدمت نہیں کر سکتا۔ جتنی الگ رہ کر۔ اُن کا بدھوا آشرم آج کل فرخ
 پر ہے۔ اور میونسپلٹی سے اُسے معقول امداد ملتی ہے۔ آج کل وہ مزارعین
 کی امداد کے لئے ایک فنڈ کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں جس سے کسانوں
 کو بیج وغیرہ کے لئے برائے نام سود پر روپیہ قرض دیا جائے۔ اس کا رخیر
 میں سدن ان کا داہنا بازو بنا ہوا ہے۔
 سدن کی طبیعت اپنے گاؤں میں نہیں لگتی۔ وہ شانتا کو مکان پر
 چھوڑ کر پھر گنگا کنارے اپنے جھونپڑے میں آ گیا ہے۔ اور اپنے کاروبار کو
 پھیلا رہا ہے۔ اس کے پاس اب پانچ کشتیاں ہیں۔ اور سیکڑوں روپیہ ہوا
 نفع ہوتا ہے۔ اب وہ ایک اسٹیمر مول لینے کا ارادہ کر رہا ہے۔
 سوامی گجاند زیادہ تر دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ انہوں نے غربا
 کی لڑکیوں کی حمایت پر اپنے تعین وقف کر دیا ہے شہر میں آتے ہیں۔ تو
 دو چار دن سے زیادہ نہیں ٹھہرتے۔

کانتک کا مہینہ تھا۔ پدم سنگھ سجدرا کو گنگا نشان کرانے لے گئے

تھے۔ لوٹتی باروہ علی پور کی طرف سے چلے آتے تھے۔ سمجھدرا گاڑی کے چھوڑ کر
سے جھانک رہی تھی۔ کہ یہاں ایسے ستائے میں کوئی کیونکر رہتا ہوگا۔ ان کا
جی کیسے لگتا ہوگا۔ دفعۃً اسے ایک عالی شان عمارت نظر آئی جس کے
دروازہ پر زلی حروف میں یہ سائن بورڈ لٹک رہا تھا۔

”سیواسدن“

سمجھدرا نے شراجی سے پوچھا: ”کیا یہی سمن بائی کا سیواسدن

ہے؟“

شراجی نے انداز فکر سے کہا: ”ہاں“ وہ پچھتا رہے تھے۔ کہ ناحق
اس راستہ سے آیا۔ سمجھدرا اب ضرور یتیم خانہ دیکھنے جائے گی۔ مجھے بھی
اس کے ساتھ جانا پڑے گا۔ بُرا پھنسا۔ شراجی نے اب تک ایک بار بھی
سیواسدن کا معائنہ نہیں کیا تھا۔ گجاند نے بارہا چاہا۔ کہ انہیں یہاں
کھینچ لائیں۔ پر وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی حیلہ کر کے ٹال دیا کرتے تھے۔ وہ
سب کچھ کر سکتے تھے۔ پر سمن سے دو بدو ہونا ان کے لئے غایت درجہ
مشکل تھا۔ انہیں سمن کی وہ باتیں کبھی نہ بھولتی تھیں۔ جو اُس نے
انہیں کنگن دیتے وقت پارک میں کہی تھیں۔ ان کے دل سے کبھی خیال
نہ دُور ہوتا تھا۔ کہ ایسی پاک باطن نیک سیرت عورت میری ہی حاکمت
کے باعث گمراہ ہوئی۔ میں نے ہی اُسے کنوئیں میں گرایا۔

سمجھدرا نے کہا: ذرا گاڑی رکواؤ۔ میں اسے دیکھوں گی۔
شراجی۔ آج بہت دیر ہو گئی۔ پھر کبھی آجانا۔

سمجھدرا۔ سال بھر سے تو آرہی ہوں۔ کچھ بھی نہ آسکی، اب دروازہ پر
 آگئی ہوں۔ تو دیکھ ہی کیوں نہ لوں؟
 پدم سنگھ۔ تم خود نہیں آئیں۔ کوئی روکتا تھا؟
 سمجھدرا۔ بھلا جب نہیں آئی، تب نہیں آئی۔ اب تو آئی ہوں۔
 اب کیوں نہیں چلتے؟
 پدم سنگھ۔ چلنے سے مجھے انکار قصور ہے ہی ہے۔ صرف دیر ہو جانے
 کا خوف ہے۔ تو بچتے ہو گئے؟
 سمجھدرا۔ یہاں کون بہت دیر لگے گی۔ دس منٹ میں تو لوٹ
 آئیں گے؟
 پدم سنگھ۔ تمہاری ضد کرنے کی بڑی عادت ہے۔ کہہ دیا۔ کہ اس
 وقت مجھے دیر نہوگی۔ لیکن مانتی نہیں ہوتی؟
 سمجھدرا۔ ذرا گھوڑا تیز کر دینا۔ کسر پوری ہو جائے گی؟
 پدم سنگھ۔ اچھا تو تم جاؤ۔ اب سے شام تک جب جی چاہے۔
 لوٹنا۔ میں چلتا ہوں۔ راستہ میں کوئی سواری کہہ کر یہ کہہ لوں گا؟
 سمجھدرا۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم یہیں بیٹھے رہو۔ میں ابھی
 چلی آتی ہوں؟
 پدم سنگھ گاڑی سے اترتے ہوئے بولے۔ ”میں چلتا ہوں۔ تمہارا
 جب جی چاہے آنا؟“
 سمجھدرا اس ٹال مٹول کا باعث سمجھ گئی۔ اُس نے ”جگت“ میں

کتنی بار سیو اسدن کی تعریف دیکھی تھی۔ پنڈت پر بھا کر راؤ کی سیو اسدن پر خاص نظر عنایت تھی۔ اس لئے سبھدرا کو اس یتیم خانہ سے ایک تعلق خاطر ہو گیا تھا۔ اور دل میں وہ سمن کا بہت احترام کرنے لگی تھی۔ وہ سمن کو اس نئی حالت میں دیکھنا چاہتی تھی۔ اُسے تعجب ہوتا تھا۔ کہ سمن اتنی نیچے گر کر کیونکر روشن دل ہو گئی۔ کہ اخباروں میں اس کی تعریفیں چھپتی ہیں۔ گاڑی سے اتر کر آشرم میں داخل ہوئی؟

وہ چوہنی برآمدہ میں پہنچی۔ کہ ایک عورت نے اندر جا کر سمن کو اُس کے آنے کی اطلاع دی۔ اور ایک لمحہ میں سبھدرا نے سمن کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اس سادہ پوش سمن کو دیکھ کر خیریت میں آ گئی۔ اس میں وہ نزاکت نہ تھی۔ نہ وہ شوخی۔ نہ وہ رعنائیاں۔ نہ وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ نہ وہ ہنستے ہوئے ہونٹ۔ ملاحیت اور شوخی کی جگہ متانت اور ثقاہت جھلک رہی تھی؟

سمن قریب آ کر سبھدرا کے پیروں پر گر پڑی۔ اور بہ چشم پر آب بولی۔ "ہو جی آج میرے دھن بھاگ ہیں۔ کہ تمہیں یہاں دیکھ رہی ہوں؟"

سبھدرا کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ اُس نے فوراً سمن کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اور رقت آمیز لہجہ میں بولی۔ "بانی جی۔ آنے کو تو بہت جی چاہتا تھا۔ لیکن فرصت ہی نہ ملتی تھی؟"

سمن۔ شرمناک بھی ہیں یا اکیلی آئی ہو؟

سبھدرا۔ ساتھ تو تھے۔ پر انہیں دیر ہو رہی تھی۔ ایک دوسری گاڑی
کرایہ کر کے چلے گئے۔

سمن بچہ اُداس ہو کر کساؤ دیر کیا ہوتی تھی۔ ان کی یہاں آنے کی طبیعت
ہی نہیں تھی۔ میری بد نصیبی۔ افسوس صرف یہی ہے۔ کہ جس یتیم خانہ کے
وہ خود بانی ہیں۔ اُس سے انہیں میرے ہی باعث نفرت ہے۔ میری دلی
تمنا تھی۔ کہ ایک بار تم اور وہ دونوں یہاں آتے۔ آدھی تو آج پوری ہو
گئی۔ دوسری آدھی نہ جانے کب پوری ہوگی۔ وہ میری زندگی کا مبارک
دن ہو گا۔

یہ کہہ کر سمن نے سبھدرا کو یتیم خانہ کی سیر کرانی شروع کی۔ عمارت
میں پانچ بڑے کمرے تھے۔ پہلے کمرے میں کوئی مچپس تیس لڑکیاں فرش
پر بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ اتالیقہ نے سبھدرا کو دیکھ کر مصافحہ کیا۔
سمن نے دونوں کا تعارف کرایا۔ سبھدرا کو یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی۔ کہ یہ
خاتون مسٹر رستم بھائی بیرسٹر کی بیوی ہیں۔ وہ روزانہ دو گھنٹے کے لئے یتیم خانہ
میں لڑکیوں کو پڑھانے آیا کرتی تھیں۔

دوسرے کمرے میں بھی اتنی ہی لڑکیاں تھیں۔ ان کی عمر آٹھ سے
بارہ سال تک تھی۔ اس میں کوئی کپڑے کاٹتی تھی۔ کوئی سیتی تھی۔ اور
کوئی اپنی قریب کی لڑکی کو چٹکیاں کاٹ رہی تھی۔ یہاں مدرسہ کے بجائے
ایک بوڑھا درزی بیٹھا ہوا تھا۔ سمن نے لڑکیوں کے بنائے ہوئے کرتے
جاکٹ وغیرہ سبھدرا کو دکھائے۔

تیسرے کمرے میں پندرہ بیس چھوٹی چھوٹی لڑکیاں تھیں۔
 پانچ سال سے زیادہ کسی کی عمر نہ تھی۔ ان میں کوئی لڑکیاں کھلتی تھی۔ کوئی
 دیوار پر لگی ہوئی تصویریں دیکھ رہی تھیں۔ سمن خود اس درجہ کی معلمہ تھی۔
 اس کے بعد سمن نے اسے باغیچہ کی سیر کرائی۔ یہاں کے گل بوٹے
 لڑکیوں ہی نے لگائے تھے۔ کئی لڑکیاں وہاں آلو گو بھی کی کیا ریوں
 میں پانی دے رہی تھیں۔ انہوں نے سجدرا کو ایک خوب صورت
 گلہ ستہ پیش کیا۔

بادرچی خانہ میں کئی لڑکیاں بیٹھی کھانا پکا رہی تھیں۔ سمن نے
 سجدرا کو ان لڑکیوں کے بنائے ہوئے اچار۔ مڑے۔ سموسے
 وغیرہ دکھائے۔

سجدرا کو یہاں کا حسن انتظام۔ ترتیب۔ اور لڑکیوں کا سلیقہ اور
 اخلاق دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ اس نے دل میں سوچا۔ سمن اتنے
 بڑے یتیم خانہ کا کیونکر انتظام کرتی ہے۔ مجھ سے تو ہرگز نہ ہو۔ کوئی لڑکی
 میلی یا غمگین نہیں نظر آتی۔

سمن بولی "میں نے یہ بوجھ اپنے سرے تو لیا۔ پر مجھ میں اس کے
 سنبھالنے کی قوت نہیں ہے۔ لوگ جو صلاح مشورے دیتے ہیں انہیں
 پر عمل کرتی ہوں۔ آپ کو بھی جو کچھ عیب یا کمی نظر آئے وہ بتا دیجئے۔ جس سے
 یتیم خانہ کی بھلائی ہوگی۔"

سجدرا نے ہنس کر کہا "بائی جی۔ مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں نے

تو جو کچھ دیکھا ہے۔ اُسی پر حیران ہوں۔ تمہیں کیا صلاح دوں گی۔
بس اتنا کہہ سکتی ہوں۔ کہ ایسا اچھا انتظام بدھوا آشرم میں بھی نہیں
ہے۔“

سمن۔ آپ تکلف کر رہی ہیں؟

سجھدرا۔ نہیں سچ کہتی ہوں۔ میں نے جیسی اس کی تعریف سُنی
تھی۔ اُس سے کہیں بڑھ کر پایا۔ ہاں یہ تو بتلاؤ۔ ان لڑکیوں کی مائیں کبھی
انہیں دیکھنے بھی آتی ہیں؟

سمن۔ آتی ہیں۔ پر میں زیادہ آمدورفت نہیں ہونے دیتی؟

سجھدرا۔ اچھا ان کی شادیاں کہاں ہوں گی؟

سمن۔ یہی تو ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہمارا فرض یہی ہے۔ کہ ان لڑکیوں
کو خانہ داری کے قابل بنادیں۔ قوم ان کی قدر کرے گی۔ یا نہیں۔ یہ
میں نہیں کہہ سکتی؟

سجھدرا۔ بیرسٹر صاحب کی بیوی کو اس کام سے بہت پریم

ہے کیا؟

سمن۔ یہ کہئے کہ وہی اس یتیم خانہ کی روح ہیں۔ میں تو صرف

ان کے حکم کی تعمیل کرتی ہوں؟

سجھدرا۔ کیا کموں۔ میں کسی قابل نہیں ورنہ میں بھی یہاں کچھ کام

کیا کرتی؟

سمن۔ آئے آئے تو آپ آج آئی ہیں۔ اس پر شرما جی کو ناراض

کر کے۔ شرما جی اب پھر آپ کو ادھر آنے ہی نہ دیں گے؟
 مسجد راہ نہیں اب کے اتوار کے دن میں انہیں ضرور لاؤں گی۔
 بس میں لڑکیوں کو پان بنانا اور کھا کر سونا سکھایا کر دوں گی؟
 سمن۔ (سنس کر) اس کام میں آپ کتنی ہی لڑکیوں کو اپنے سے
 ہوشیار پائیں گی؟
 اتنے میں دس یا رہ لڑکیاں خوشنما کیڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اور مسجد راہ کے
 سامنے کھڑی ہو کر خوش الحانی سے گانے لگیں۔
 سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
 ہم پبلین ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا
 گودی میں کھیلتی ہیں جس کی ہزاروں ندیاں
 گلشن ہے جن کے دم سے رشک جتاں ہمارا
 مسجد راہ نغمہ وطن سن کر بہت محظوظ ہوئی۔ اور پانچ روپے
 لڑکیوں کو انعام دئے؟
 جب وہ چلنے لگی۔ تو سمن نے دردناک لہجہ میں کہا میں اس اتوار
 کو آپ کی راہ دیکھوں گی؟
 مسجد راہ میں ضرور آؤں گی؟
 سمن۔ شانتا تو خیریت سے ہے؟
 مسجد راہ۔ ہاں۔ خط آیا تھا۔ وہاں سب خیریت ہے۔ سدن تو
 یہاں نہیں آئے تھے؟

سمن۔ وہ آئے تو نہیں۔ لیکن دور و پیہ ماہوار چندہ بھیج دیا کرتے ہیں۔

سجھدرا۔ اب آپ بیٹھے ہیں چلتی ہوں۔
 سمن۔ آپ نے یہاں آکر مجھ پر بڑا احسان کیا۔
 سجھدرا۔ اور میں تو آپ کے درشنوں سے تر گئی۔ آپ کی سرگرمی
 آپ کا حسن انتظام۔ آپ کی مروت اور اخلاق۔ کس کس کی تعریف کروں۔
 آپ واقعی اپنی جنس کا سنگار ہیں۔

سمن نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا۔ میں تو اپنے
 تنہیں آپ کی وہی لونڈی سمجھتی ہوں۔ میں جب تک جیوں گی۔ آپ
 لوگوں کا جس گاتی رہوں گی۔ آپ لوگوں نے میری بائہ بکڑ کر بچا نہ لیا
 ہوتا۔ تو اب تک میں کب کی ڈوب گئی ہوتی۔ پر مانتا آپ لوگوں کو سدا
 خوش و خرم رکھیں۔

تممت بالحنیر



Taj Tahir Foundation

سمن۔ وہ آئے تو نہیں۔ لیکن **عافیت** کرتے ہیں۔

سجھدرا۔ اب آپ یہ فطرت نگار منشی پریم چند صاحب

سمن۔ آپ ان منشی پریم چند صاحب کا یہی ناول ”پریم آشرم“ کے نام
سجھدرا مقبول ہوا کہ تمام پریس نے باتفاق رائے اسے طبعزادہ مندی
آپ کا حسن۔ کا اور منشی پریم چند صاحب کا بہترین ناول قرار دیا ہے۔ دارالاشاعت

پنجاب کی درخواست پر منشی پریم چند صاحب نے اس شاہکار کا خود اردو
میں ترجمہ کیا ہے۔ معاشرت کی صحیح مصوری اور کردار نگاری۔ نکتہ
رسی اور فلسفیانہ غور و خوض میں منشی صاحب کو پیدہ طوئی حاصل ہے۔
اور اس ناول میں ان کی یہ تمام خصوصیات اپنے پورے شباب پر
ہیں۔ ایک جہت ناک موثر افسانہ جو بے مثال قادر الکلامی سے پیدا

کیا گیا ہے۔ رسالہ زمانہ میں محض اتنی سی اطلاع نکل جانے پر کہ
دارالاشاعت پنجاب سے یہ ناول شائع ہونے والا ہے۔ فرمائشوں کی
بھرمار ہو گئی تھی۔ ابھی ابھی چھپ کر تیار ہوا ہے۔ مایوسی سے بچنے کے
فورا طلب کیجئے۔ قیمت حصہ اول ۴۴ قیمت حصہ دوم ۴۴

ملنے کا پتہ

دارالاشاعت پنجاب لاہور

گملانی الیکٹرک پریس لاہور میں صرف ہر ورق چھپا